

ع جدا ہو دین سیاست سے تورہ جاتی ہے چنگیزی



# اسلام اور سیاست

- مذہب اور سیاست
- شریعت و سیاست
- مرفّوجہ سیاست کے شرعی احکام
- اسلام میں جمہوریت کا تصور
- غیر اسلامی حکومت کے شرعی احکام
- اسلامی حکومت کا بنیادی اصول شوائی
- اسلامی مملکت میں حکومت الہیہ
- دودھ کی اسلامی حیثیت
- دودھ کی شرعی حیثیت
- عورت کی سربراہی

مجموعہ افادات

حکیم میت الامم مجدد ملّت

حضرت مولانا محمد شرف علی ہاشمی رضا

معہد حکیم الامم کے سیاسی انداز

لر شیخ الاسلام مفتی محمد علی عثمانی

ادارہ تالیفات اشرفیہ

پوک فوارہ نعمت ان پکٹان  
(061-4540513-4519240)

# اسلام اور سیاست

مجموعہ افادات

حکیم الامت

حضرت مولانا محمد شرف علی تھانوی نوائی نوائی  
و دیگر اکابرین

مع رسالہ

حکیم الامت کے سیاسی افکار  
لز

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی

ترتیب جدید

محمد سلطانی  
دریماہنگان اسلام مہمان

ادارۃ الیقانۃ اشرفیہ

پوک فوارہ نسٹان پاکستان فون: 4540513-4519240

# اسلام اور سیاست

تاریخ اشاعت ..... ربيع الاول ۱۴۲۷ھ

ناشر ..... ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طبع ..... سلامت اقبال پریس ملتان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

## قارئین سے گزارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔  
الحمد للہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔  
پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرمائی کر ممنون فرمائیں  
تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ ..... پوک فوارہ ..... ملتان مکتبہ رشیدیہ ..... راجہ بازار ..... داؤ پنڈی  
ادارہ اسلامیات ..... اتارکی ..... لاہور یونیورسٹی بک انجینئرنگ ..... خیبر بازار ..... پشاور  
مکتبہ سید احمد شہید ..... اردو بازار ..... لاہور ادارۃ الاتور ..... نوناؤں ..... گراچی نمبر 5  
مکتبہ رحمانی ..... اردو بازار ..... لاہور مکتبہ المنظور الاسلامیہ ..... جامعہ حسینی ..... علی پور  
مکتبہ المنظور الاسلامیہ ..... بلاک زم ..... مدینہ ناؤں ..... بکھر موز ..... فیصل آباد

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K 119-121- HALLIWELL ROAD  
(ISLAMIC BOOKS CENTER) BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

مدنی  
پست

## عرض ناشر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

غیر منقسم ہندوپاک میں انگریزی دور حکومت میں مسلمانوں پر جس طرح علمی و عملی زوال آیا وہ اپنے اندر ایک الگ کر بنا ک داستان لئے ہوئے ہے۔ اس دور میں کچھ ایسی فضاہ موارکی گئی کہ عوام الناس کا تعلق اہل عدم حضرات سے دھیرے دھیرے کثا گیا۔ اور عوام الناس کی فکری اور تعمیری ذہن پر اسلامی رنگ کے بجائے مغربی سیاہ بادل چھانے لگے۔ جس سے مسلمانوں میں ایسا زبردست فکری انحطاط آیا کہ خود مسلمانوں نے دائرہ اسلام جو کہ معہد سے لے کر لحد تک ساری زندگی پر محیط تھا سمیٹ کر صرف نماز، روزہ تک محدود کر لیا۔ اور وہ شعائر جو مسلمانوں کی دین و شخص کا نشان تھے بتدریج دھنڈ لے ہوتے چلے گئے۔ جب اس فکری انحطاط کی وجہ سے اسلام کو محدود کر دیا گیا تو حکومتی نظام ایسے لوگوں کی وراثت سمجھا جانے لگا جن کو دور دور تک اسلام کی سوچ بوجھ بھی نہ تھی۔ اور خود مسلمانوں کی اکثریت اس بارہ میں لاعلم تھی کہ اسلام نے حکومتی نظام کے لئے ہمیں کیا لائجہ عمل دیا ہے؟ اس بے فکری و لاعلمی کی بدولت مسلمانوں کی رغبت جمہوریت، سو شلزم اور کیموززم وغیرہ جیسے لادینی نظام ہائے حکومت کی طرف ہو گئی۔ بالآخر مسلمان بے دست و پا ہو کر جمہوریت کے شکنخے میں اس طرح جکڑے گئے کہ تقسیم کے بعد بھی فرنگی کا دیا ہوا نظام رانج رہا اور اب یہ اتنا رانج ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کیلئے اس کے منفی پہلوؤں کو جانتے ہوئے بھی اس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

موجودہ دور میں ایک درمند دل رکھنے والے مسلمان کو کیا کرنا چاہئے؟ اور وہ اپنی بساط کی حد تک اپنے حلقہ میں اسلام کے نفاذ کیلئے کیا عملی اقدام کر سکتا ہے؟ اور وہ افراط و تفریط سے بچتے

ہوئے اس لادینی ماحول میں نفاذ اسلام کی جدوجہد میں کس قدر حصہ ادا سکتا ہے؟ اس جیسے بے شمار سوالات جو ایک مسلمان کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یا ایک جماعت کو اپنے منشور و دستور کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کس طرح کے لائے عمل کی ضرورت ہے؟ یہ اور اس جیسے متعدد ابھرتے ہوئے سوالات کے شافی جواب کیلئے اس کتاب کا مطالعہ سرمه بصیرت کا کام دے گا۔

اللہ پاک نے حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے شریعت و تصوف کا جو عظیم المرتبت اور کثیر النفع کام لیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ چونکہ حضرت اقدس کو تفسیر قرآن اور تصوف سے خصوصی شغف تھا اس لئے سیاست و حکومتی نظام پر حضرت نے مستقل قلم نہیں اٹھایا۔ لیکن آپ کی تصانیف، جملہ موعظ، خطبات و ملفوظات میں اسلام و سیاست کے موضوع پر ایسے شفاف اصول دیکھنے میں آتے ہیں جن پر عمل کر کے مسلمان واقعی مسلمان بن سکتا ہے۔

اللہ پاک جناب مفتی محمد زید صاحب مدظلہ کو جزاۓ خیر عطا فرمائیں جنہوں نے محنت شاقہ سے حضرت کی تصانیف سے مواد اکٹھا کر کے اس موضوع پر چند کتب ترتیب دیں۔ زیرِ نظر کتاب ”اسلام اور سیاست“ میں بھی انہی منتخب و مرتب کتب سے عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق نافع مضامین کو ترتیب جدید کے ساتھ طبع کیا گیا ہے۔ اس جدید ترتیب میں جناب برادر مکرم محمد راشد صاحب نے کافی معاونت و مشاورت فرمائی جو کہ یقیناً ان کے لئے باعث ثواب اور ذخیرہ آخرت ثابت ہوگی۔

کتاب کی نافیعت و افادیت کو جاگر کرنے کے لئے ”حکیم الامت کے سیاسی افکار“ (از مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ) ووٹ کی شرعی حیثیت، غیر اسلامی حکومت کے احکام اور عورت کی سر برائی جیسے اہم علمی مضامین کو بھی مختصر مگر جامع انداز میں شامل کتاب کر لیا گیا ہے۔ تا کہ سیاست کے چیدہ چیدہ مسائل کے بارہ میں مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات کا علم ہو جائے اور اس موضوع پر تفکی نہ رہے۔

امید و اثق ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں میں صحیح اسلامی سوچ پیدا کرنے میں اکسیر کا کام کرے گی اور مسلمانوں کو ان کی راہ عمل کے تعین میں مفید ثابت ہوگی۔

اللہ پاک ہم سب کو اکابر علماء حق کے مسلک اعتدال پر ثابت قدم رکھے۔ آمین۔

## اجمالی فہرست

۱۳	حکیم الامت کے سیاسی افکار
۴۶	مروجہ سیاست کے شرعی احکام
۹۷	مذہب و سیاست
۱۵۳	شریعت و سیاست
۱۷۹	اسلام میں جمہوریت کا تصور
۱۹۳	غیر اسلامی حکومت کے شرعی احکام
۲۳۰	انتخابات میں ووٹ اور امیدوار کی شرعی حیثیت
۲۳۵	عورت کی سربراہی
۲۸۳	انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت
۲۹۳	اسلامی مملکت میں حکومت الہیہ
۲۹۸	اسلامی حکومت کا بنیادی اصول شوری

## فہرست مضمون

۵۵	حکومت کے ساتھ طرزِ عمل	۱۲	حکیم الامت کے سیاسی افکار
۵۹	حکومت کے غیر شرعی قوانین اور اقدامات کے خلاف چارہ کار	۱۵	آج کی ذہنیت
۱۱	حکومت کے خلاف خروج	۱۵	حکیم الامت کا تجدیدی کارنامہ
۲۲	مروجہ سیاست کے شرعی احکام	۱۷	اسلام میں سیاست کا مقام
۲۶	حکومت و سیاست بھی شریعت کا اہم شعبہ ہے	۱۸	بعض مفکرین کی لفڑش اور اسکے مقنی نتائج
۲۶	اسلام نے سیاست کی تعلیم دی ہے	۱۹	ایک مثال سے وضاحت
۲۶	سیاسی ترقی کے حدود اور علماء کے ترقی سے منع کرنے کی حقیقت	۱۹	زاویہ فکر کی تبدیلی
۲۸	علماء کی مخالفت کی حقیقت	۲۰	شرعی نقطہ نظر
۲۹	مفاد پرست لیڈروں کے تابع نام نہاد علماء سیاست کی قسمیں اور علماء کا منصب	۲۱	دین کا مقصد اصلی
۷۰	سیاست کے دو حصے	۲۲	(۲) اسلام کا نظام حکومت
۷۱	سیاست میں کو دن اعلاء کا منصب نہیں	۲۲	جمهوریت کی قلابازیاں
۷۱	بھی کیلئے سیاست میں حصہ لینا ضروری نہیں	۲۵	جمهوری فلسفہ پر حکیم الامت کا تبصرہ
۷۲	حضرور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں،	۲۹	شخصی حکومت
۱۱	شان نبوت، شان سلطنت	۳۷	حکمرانی ایک ذمہ داری ہے نہ کہ حق
۷۲	کام کی تقسیم اور کامیابی کا طریقہ	۳۸	حکومت کے فرائض
۷۳	لیڈروں کی ذمہ داری	۳۱	(۳) اقامت دین کیلئے سیاسی جدوجہد
۷۳	نام نہاد لیڈروں کی بدحالی	۳۳	کا شرعی مقام اور اس کی حدود
۷۵	طلبه مدارس کی سیاست میں شرکت	۳۷	سیاسی جدوجہد اور تزکیہ اخلاق
۷۵	دینی مدارس میں سیاست کی تعلیم	۵۰	سیاسی تدابیر
		۵۲	بائیکاٹ اور ہڑتاں کا شرعی حکم
		۵۳	بھوک ہڑتاں
			پلبیشی کے مر وجہ ذرائع

یا تو قیال یا پھر صبر اسکے علاوہ بھوک ہڑتاں	85	مرد جہ سیاست میں علماء کے شریک نہ ہونے کی ایک وجہ	76
جیل بھر تحریک شرعی حکم کے خلاف ہے	//	//	//
کافروں سے بایکاٹ اور ان سے قطعاً معاملات نہ کرنے کا شرعی حکم	86	علماء کو سیاست میں حصہ لینا کب ضروری ہے؟	76
ہڑتاں کرنے کا شرعی حکم	87	علماء کی سیاسی جماعت کا طریقہ کار	77
شرعی قاعدہ کا مقتضی	88	سیاست میں کفار مشرکین سے مدد لینے	77
از خود بھوکارہ کر جان دے دینے کا شرعی حکم	88	اور انکے ساتھ مل کر کام کرنیکا شرعی حکم	//
حکومت کے خلاف بایکاٹ کرنے	89	فاسقوں فاجروں اور بدعتیوں کیساتھ مل کر کام کرنیکا حکم	78
اور حکومت کی قانون ٹکنی کا حکم	//	سیاست میں کافر کی اقداء	79
خلاف قانون گولہ، بارود بیم بنانا	90	موجودہ حالات میں کس جماعت کے ساتھ مل کر کام کریں	79
کفار کی نہ ملت اور انکی برائی کرنیکا شرعی حکم	91	موجودہ پارٹیوں میں سے کسی پارٹی میں شریک ہونے کا شرعی ضابطہ	//
صلح و اتفاق کے لئے شعائر اسلام کو	91	کسی سیاسی جماعت میں شریک ہونیکے بعد	81
ترک نہیں کیا جائے گا	//	علماء و عوام کیلئے لائج عمل اور ضروری ہدایت	//
مسئلہ امامت و امارت اور اسکے شرائط	92	سیاسی اختلاف	83
امیر مقرر کرنے کے شرائط و جو布	93	سیاسی مسائل میں اختلاف کی بنیاد	83
حدیث من لم یعرف امام زمانہ کی تشریع	92	سیاسی اجتہادی مسائل میں اختلاف کا حکم	83
کس امیر و سلطان کی اتباع واجب ہے	92	سیاسی امور میں اہل حق کا مسلک	82
جس نے کسی امام سے بیعت نہیں کی	92	سیاسی مسئلہ میں شرعی حکم میں اگر علماء کا اختلاف ہو جائے	82
وہ جاہلیت کی موت مرے گا	//	سیاسی مسائل میں عوام کس کے فتوے پر عمل کریں	85
الائمه من قریش	95	سیاست کے شرعی احکام	85
شرعی حاکم نہ ہونیکی صورت میں اہل	95		
حل و عقد حاکم کے قائم مقام ہوں گے	//		
نہ ہب و سیاست	97		
کفار حکمران ہم پر کیوں مسلط کر دیے گے	97		

۱۱۲	باطنی قوت باطنی طاقت	۹۷	کیا اللہ تعالیٰ کافروں کا مددگار ہے؟
۱۱۳	خدائی فوج کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نصرت	۹۸	ایک شبہ اور اس کا جواب
۱۱۴	تقویٰ کی ضرورت	۱۰۰	قدرت نے مسلمان اور غیر مسلم کی
۱۱۵	ناقابل اذکار حقیقت	۱۰۱	ترقی کا مدار الگ الگ مقرر کیا ہے
۱۱۵	مسلمانوں کے مغلوب ہوئیکی اصل وجہ	۱۰۲	وضاحتی مثال
۱۱۶	اصول وحد و داعظم ضبط کے ساتھ	۱۰۲	غفلت کا وقت نہیں
۱۱۷	کام کریںکی ضرورت	۱۰۲	حکام کی برائی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں
۱۱۸	افنسوں کا مقام	۱۰۲	اتباع شریعت کے بغیر ہم ترقی نہیں کر سکتے
۱۱۹	ہماری انجمنوں کی ناکامی کا سبب	۱۰۳	مسلمانوں کی ترقی کی بنیاد
۱۱۹	ہماری ناکامی کے اسباب	۱۰۳	فتح و ترقی کا مدار
۱۲۰	عوام کی بدحالی	۱۰۳	مسلمانوں کی عزت کی کنجی
۱۲۰	دوسری قوموں کی ترقی اور ہماری	۱۰۳	پریشانیوں کی جڑ اور ہماری قوت کا سرچشمہ
۱۲۱	ناکامی کے اسباب	۱۰۵	سلطان صلاح الدین ایوبی کا حال
۱۲۲	آپسی اختلاف کا نقصان	۱۰۶	شور و غل ہنگامہ کی ممانعت
۱۲۲	ناجائز کام پر اتفاق نہیں	۱۰۷	جو ش خروش ہنگامے کی ممانعت
۱۲۲	اتفاق قائم کرنے کا طریقہ	۱۰۷	امن و سلامتی کی ضرورت
۱۲۳	باہمی اصلاح اور اتحاد و اتفاق	۱۰۸	امن و امان سلامتی قائم ہوئیکا طریقہ
۱۲۳	نظم و اتحاد باقی رکھنے کی اہمیت	۱۰۸	اتباع شریعت کی ضرورت
۱۲۳	اتحاد امت کے لئے مسلکی	۱۰۹	ظلم و زیادتی اور حد سے تجاوز کریںکی ممانعت
۱۲۳	اختلافات کو ختم کرنے کی ترغیب	۱۰۹	دین کی پابندی
۱۲۳	تین غلطیاں جس کی وجہ سے مسلمان	۱۰۹	ایمان و اعمال کی طاقت اللہ کا وعدہ
۱۲۳	ناکام ہیں	۱۱۰	مسلمانوں کی گوتاہی
۱۲۳	دستور العمل، نظام اعمل	۱۱۱	صحابہ کی کامیابی کا راز
۱۲۳	نظام اعمل	۱۱۱	حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سبق
		۱۱۱	آموز مکتوب گرامی

۱۳۵	جان ہماری ملک نہیں کہ جس طرح	۱۲۵	کام کرنے کا طریقہ
۱۳۵	چاہیں تصرف کریں	۱۲۵	کیے لوگوں کیسا تھل کر کام کرنا چاہئے
۱۳۵	دشمن سے مقابلہ کی تیاری کا حکم	۱۲۶	مقاصد کی تحریک کیلئے کیا کرنا چاہئے
۱۳۶	ایمان درست کرنے میں قوت کی	۱۲۶	حکام سے مقابلہ کرنا کوئی عقلمندی نہیں
۱۳۶	تیاری بھی داخل ہے	۱۲۷	اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا مومن
۱۳۷	مسلمانوں کی فلاج و کامیابی کا دستور اعمل	۱۲۷	کی شان نہیں
۱۳۹	جہاد کی ضرورت	۱۲۷	ظاہری قوت کے اعتبار سے جب ہم
۱۴۰	مکی زندگی میں جہاد کیوں نہیں فرض ہوا	۱۲۷	کچھ نہ کر سکتے ہوں
۱۴۱	جہاد کی بنیادی شرائط	۱۲۸	ہنگامی حالات میں کیا کرنا چاہئے
۱۴۲	شعار اسلام، مقامات مقدس، مساجد، مقابلہ	۱۲۸	حکومت کے ظلم کا علاج
۱۴۲	کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ضروری ہے	۱۲۹	اپنی حفاظت کا سامان اور انتظام رکھنا
۱۴۳	سرکاری عہدے اور ملازمتیں حاصل	۱۲۹	اگر ظالم قوم مسلمانوں کی جان لینے
۱۴۳	کرنے کی ضرورت	۱۲۹	اور حملہ کرنے پر آمادہ ہوں تو
۱۴۳	ناجائز ملازمتوں کے حاصل کرنے	۱۲۹	مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے
۱۴۴	کے مسئلہ میں تفصیل	۱۳۰	دفاعی مدد اپر اختیار کرنا
۱۴۴	غیر مسلموں کے حقوق اور ان کے	۱۳۰	جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت
۱۴۴	ساتھ حسن سلوک	۱۳۰	کے لئے مقابلہ کرنا
۱۴۴	کفار کیسا تھر تعلق رکھنے کی تین صورتیں	۱۳۱	اگر حکومت ظلم کرے تو تم ظالم نہ بنو
۱۵۵	کافروں کی مدد کرنے کے متفرق احکام	۱۳۱	ظالم سے بدلہ لینے کے حدود
۱۴۵	موالات اور کفار سے تعلقات رکھنے	۱۳۲	مقابلہ کے لئے قدرت کی شرط اور
۱۴۵	کے متفرق احکام	۱۳۲	شرعی قدرت کی تعریف
۱۴۶	کافروں کے ساتھ ہمدردی حسن	۱۳۳	بہادری و کھانا ہر موقع پر کمال نہیں
۱۴۶	سلوک کی ترغیب	۱۳۳	موت سے نذر ناکب قابل تعریف ہے
۱۴۷	غیر مسلموں کیسا تھر بر تاؤ کی تین صورتیں	۱۳۳	محض جان دے دینا کوئی کمال نہیں

۱۵۹	صلاح و فساد کے ذمہ دار حکماء و علماء	۱۳۸	غیر مسلموں کی ساتھ حسن سلوک و رواداری
۱۶۰	حکومت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے	۱۳۹	کافر کے ساتھ ہمدردی
۱۶۰	ہر ذمہ دار کو اپنے ماتحت لوگوں کے اعمال کی نگہداشت کرنا چاہئے	۱۳۹	سنجل کر دوستی کرو
۱۶۱	زوال سلطنت ظلم سے ہوتا ہے	۱۵۰	الکفر ملة و احدة
۱۶۱	مزاح حاکم کے وقار کے خلاف ہے	۱۵۰	کفار مشرکین کے ہدایتی تحائف خصوصاً
۱۶۱	حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کارعہ پہلے سلاطین میں بھی دین کی وقعت تھی	۱۵۱	دیوالی وغیرہ کے موقع پر لین دین کا حکم
۱۶۱	کافروں سے معاملات یعنی خرید و فروخت	۱۵۱	غیر مسلموں کی بھیجی ہوئی افطاری کا حکم
۱۶۲	خلافت قریشی کے لئے ہے	۱۵۲	کافروں سے خدمت لینے اور ان کی خدمت کرنے کا شرعی حکم
۱۶۲	حکمران نہ ڈھیلا ہو اور نہ ڈھیلا کی طرح سخت	۱۵۲	ہندوؤں کی دکان سے مٹھائی وغیرہ
۱۶۳	حکمران کا عاقل ہونا ضروری ہے	۱۵۲	سامان خریدنا
۱۶۳	جمهوری سلطنت پچوں کا کھیل ہے	۱۵۲	کافروں کے گھر کا انکے ہاتھ کا پاک ہو اکھانا
۱۶۳	قرآن میں سلطنت شخصی کا ثبوت ملتا ہے	۱۵۲	غیر مسلم کی ساتھ ایک برتن میں کھانا کھانا
۱۶۳	ایک خاص حالت میں ہر چیز کو زوال ہے	۱۵۳	مدرسہ و مسجد میں غیر مسلم کا چندہ لینا
۱۶۳	ئی قسم کی بہادری میں کیا مزہ ملک	۱۵۳	شریعت و سیاست
۱۶۳	و حکومت کا ملے گا	۱۵۳	کاملین کی سیاست میں عدد کامل ہوتا ہے
۱۶۳	مسلم اور غیر مسلم سے مشترک سلطنت	۱۵۳	اہل اللہ ظالم کیلئے کبھی عہدہ حکومت
۱۶۴	اسلامی سلطنت نہیں	۱۵۴	کی دعائیں کرتے
۱۶۴	رعایا کی مطیع بنانے کی تدبیر	۱۵۴	حکومت کا استحقاق قریش کو ہے
۱۶۴	مسلمانوں کو ترقی حق تعالیٰ شانہ کو راضی کرنے سے ہوتی ہے	۱۵۴	حاکم اور محاکوم کے حقوق
۱۶۵	شریعت پر عمل کرنے میں مسلمانوں کا وقار ہے	۱۵۵	معاملہ سیاست
۱۶۵	اتفاق و اتحاد کی بنیاد	۱۵۶	حکومت و انتظام ملکی
۱۶۶	سلطنت کی ہوں کا انجام	۱۵۸	

176	حکام وقت کو برا کہنا بے صبری کی علامت ہے	سلطنت کی قیمت
176	کامیابی کی اصل تدبیر	آنحضرت ﷺ کے خلیفوں کا رعب
177	اسلام کی قوت کا مدار شخصیتوں پر نہیں	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تواضع کا قصہ
177	سلطین اسلام کا احترام لازم ہے	فتح و نصرت کا مدار قلت و کثرت نہیں
177	قانون شریعت مصلحت عامہ کے خلاف نہیں	دولت اور سلطنت کا ایک خاصہ
177	آج کل کی سیاست میں غیر شرعی	حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایک فراست
178	اموری نشاندہی	امارت میں خاصہ ہے تبعید مسائیں کا
178	خلاف شرع امور میں حاکم اطاعت جائز نہیں	نظام صحیح فلاج دارین برائے مسلمانان
178	حاکم کو اپنی رعیت کی گیری رکھنا ضروری ہے	سلطنت کا زوال چھوٹی چھوٹی باتوں
178	اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے	کی غفلت سے ہوتا ہے
179	اسلام میں جمہوریت کا تصور	انظامی کام حکومت سرانجام دے سکتی ہے
182	کثرت رائے کلیے دلیل نہیں کہ حق	حکومت کا مقصد اقامت دین ہے
182	اسی میں ہے	بغیر نہ ہب خنی کے سلطنت نہیں چل سکتی
193	غیر اسلامی حکومت کے شرعی احکام	سلطین کا اہل اللہ سے مشورہ
193	دارالحرب دارالاسلام کی تحقیق ہندوستان	حکمران کو سادہ لباس پہنانا ہی زیب ہے
193	دارالحرب ہے یا نہیں	رعایا پر ہب جمہوری سلطنت کی نہیں ہوتی
195	ہندوستانی غیر مسلم ذمی ہیں یا حربی	جمہوریت کے کر شے
195	جان و مال کی حفاظت کرنے والی حکومت شکری	حجاج بن یوسف کی عبادت اور امید
196	مُشْتَقْ ہے اسکے خلاف شووش نہیں کرنا چاہئے	مغفرت کا حال
196	عملی معاهدہ	کافر سیاست دان کی اقتداء کی مثال
198	شرعی دلیل	خالص مذہبی سیاست
198	کافر حکومت میں رہتے ہوئے معاهدہ	سب کفار مسلمانوں کے دشمن ہیں
199	کی خلاف ورزی کرنا درست نہیں	کفار بھی مسلمانوں کو اپنا اصلی مخالف سمجھتے ہیں
199	عہدو پیان کے خلاف کوئی کام کرنا جائز نہیں	مسلمانوں کے دوست

۲۱۲	دوسرے مذہب کی رعایت میں گوشت خوری ترک کرنا شریعت کی روشنی میں	نا حق کسی غیر مسلم کو قتل کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے غیر ملکی قوموں کی مدد کرنا جائز نہیں
۲۱۳	مزید تحقیق و تفصیل	جب کہ وہ ہمارے ملک پر حملہ آور ہوں
۲۱۴	غلط فہمی کا ازالہ	غیر مسلم حکومت میں رعایا بن کر رہنے کا حکم
۲۱۵	غیر مسلموں کو قرآن مجید جلانے سے متعلق ایک استفتا اور اس کا جواب	غیر مسلم حکومت میں رہنے اور بھرت کرنے کا شرعی حکم
۲۱۶	مکتوب گرامی	کافر حکومت کی ماتحتی میں رہنے کی
۲۱۷	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی	مانع ایک استدلال اور اس کا جواب
۲۱۸	حکام کی اطاعت کا بیان	دارالکفر سے بھرت کر نیکا شرعی حکم
۲۱۸	حکام کی اطاعت کے حدود اور مسئلہ کی مختلف صورتیں	بھرت کر نیکا حکم
۲۱۹	حکام کی اطاعت اور حکومت کے قوانین کی پابندی کا شرعی ضابطہ	مشروع بھرت
۲۱۹	حاکم کے ظلم کرنے کی صورت میں شرعی حکم	مذہبی امور میں حکومت کو دل دینے کا حق نہیں
۲۲۰	حاکم اگر دینی امور میں ظلم و زیادتی کرنے لگے اس صورت کا شرعی حکم	مذہبی امور میں حکام کا جبرا دست اندازی کرنا اور حکوم مسلمانوں کا اس پر راضی ہو جانا
۲۲۰	حاکم کے ظلم کرنے کی صورت میں مظلومین کے علاوہ دوسرے لوگوں کیلئے شرعی حکم	اگر حکام کی طرف سے ناگوار بات پیش آئے یا وہ ظلم زیادتی کریں
۲۲۱	بعض حالات میں غیر اسلامی حکومتوں کی نفرت و اجنب ہے	مظالم کے وقت بھی حکومت سے مقابلہ کرنا ہمارا کام نہیں
۲۲۱	حاکم وقت کی امر مباح کا حکم دے تو وہ واجب ہوتا ہے	عزت و عصمت کی حفاظت کے لئے اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا
۲۲۱	حکومت کی چوری	قریبائی اور گوشت خوری پر پابندی اور مسلمانوں کے لئے شرعی ہدایت
۲۲۱	حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی اور چوری کرنا جائز نہیں	ہندوؤں کو خوش کرنے یا اتفاق کی وجہ سے گائے کی قربائی ترک کرنا

۲۲۰	انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت	۲۲۲	کافروں کا مال کھانا انکا حق دبانا چاہئے نہیں
۲۲۰	انتخابات میں ووٹ اور امیدوار کی شرعی حیثیت	۲۲۳	غلط فہمی کا ازالہ اور احتیاط کا مقتضی
۲۲۰	امیدواری	۲۲۳	جن ملکوں پر مہر نہ لگی ہو اس کا دوبارہ
۲۲۱	ووٹ اور ووٹر	//	استعمال کرنا درست نہیں
۲۲۵	عورت کی سربراہی	۲۲۴	بغیر نکت یا خلاف قانون سفر کرنا درست نہیں
۲۵۱	چند شبہات کا جواب	۲۲۴	حکومت کی طرف سے دی ہوئی سرکاری
۲۵۱	الرجال قوامون علی النساء پر شبہ	//	پہلی کوئی اپنے کام میں لانا چاہئے نہیں
۲۵۳	”لن یفلح قوم ولو امرهم امراة“	۲۲۵	کافر کا مال لینا، مسلمان کا مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے
//	پر شبہات کیا یہ حدیث موضوع ہے؟	//	ایک استدلال اور اس کا جواب
۲۵۸	کیا یہ حدیث عمومی حکم نہیں رکھتی؟	۲۲۵	دارالحرب اور سود
۲۵۹	کیا خبر واحد علال و حرام میں جنت نہیں؟	۲۲۶	دارالحرب میں حربیوں سے سود لینے کا مطلب
۲۶۲	ملکہ سبا کے قصہ سے استدلال	۲۲۷	مسلک کی توضیح
۲۶۳	المرأة لا تصلح تكون ملكة او اماماً	۲۲۷	قالمین جواز کی دلیل
۲۶۳	عورت ملکہ یا امام بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی	۲۲۸	جو از کے شرائط
۲۶۳	حضرۃ عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے استدلال	۲۲۸	حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی رائے
۲۷۲	رضیہ سلطانہ، چاندی بی اور بھوپال کی بیگمات	۲۲۹	حضرت تھانویؒ اور دیگر علماء کی رائے کا فرق
۲۷۳	مس فاطمہ جناح	۲۲۹	حضرت تھانویؒ کی رائے کی دلیل
۲۷۳	حضرت تھانویؒ کا فتویٰ	۲۳۰	گنجائش کی صورت اور سودی رقم کا مصرف
۲۷۸	کیا عورت قاضی بن سکتی ہے؟	۲۳۱	شرعی دلیل
۲۸۲	سانپ گزر چکا ہے لیکر پینے سے فائدہ؟	۲۳۲	حربیوں سے سود لینے کے متعلق حضرت
۲۸۲	انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت	۲۳۲	تحانویؒ کی سب سے آخری تحریر
۲۸۲	ووٹ کی اسلامی حیثیت	//	مشہور شخصیت سے مسلمان نہ کرانا چاہئے
۲۹۳	اسلامی مملکت میں حکومت الہیہ	۲۳۳	صیانتہ اسلامین
۲۹۸	اسلامی حکومت کا بنیادی اصول شوری	۲۳۳	اسلامی تنظیم چلانے کا مفید دستور اعمال

## حکیم الامت کے سیاسی افکار

از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کے ہر شعبے میں جو عظیم خدمات لیں ان کی نظریاضی کی کئی صدیوں میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ مسلمانوں کی دینی ضرورت کا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا کوئی مفصل یا مختصر کام موجود نہ ہو۔ حضرت کی تصانیف، موعظ اور ملفوظات اپنے دور کی دینی ضروریات پر مشتمل ہیں، اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں دین کی تعلیمات کو انہوں نے کسی نہ کسی شکل سے واضح کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔

اس وقت میرے پیش نظر حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے سیاسی افکار کی تشریح و توضیح ہے۔ اگرچہ حضرت کی شخصیت کسی بھی حیثیت سے کوئی سیاسی شخصیت نہیں تھی اور نہ سیاست آپ کا خصوصی موضوع تھا، لہذا آپ کی کوئی تصنیف خالصتاً سیاست کے موضوع پر موجود نہیں ہے، لیکن چونکہ اسلام کے احکام دین کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست سے بھی متعلق ہیں اس لئے اسلامی احکام کی تشریح ووضاحت کے ضمن میں حضرت نے اسلام کے سیاسی احکام پر بھی اپنی تصانیف اور موعظ و ملفوظات میں مختصر مگر جامع بحثیں فرمائی ہیں جن میں اسلامی احکام کی توضیح کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے دوسرے سیاسی نظاموں اور سیاست کے میدان میں پائی

جانے والی فکری اور عملی گمراہیوں پر بھی بھر پور تبصرے شامل ہیں۔ اس مقالے میں انہی بحثوں کا ایک ایسا مطالعہ مقصود ہے جس کے ذریعے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے بیان کے مطابق سیاست کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ایک واضح تصور ابھر کر سامنے آ سکے۔

## آج کی ذہنیت

آج کی دنیا میں جو سیاسی نظام عملًا قائم ہیں، ان کے پیش کئے ہوئے تصورات لوگوں کے دل و دماغ پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ ان کے اثرات سے اپنی سوچ کو آزاد کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ان سیاسی نظاموں نے کچھ چیزوں کو اچھا اور کچھ کو برا قرار دے کر اپنے ان نظریات کا پروپیگنڈہ اتنی شدت کے ساتھ کیا ہے کہ لوگ اس کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اول تو اس لئے کہ پروپیگنڈے کی مہیب طاقتون نے ذہن ہی ایسے بنادیئے ہیں کہ انہوں نے ان نظریات کو ایک مسلم سچائی کے طور پر قبول کر لیا ہے، اور دوسرے اس لئے کہ اگر کوئی شخص عقلی طور پر ان نظریات سے اختلاف بھی رکھتا ہو تو ان کے خلاف کچھ بولنا دنیا بھر کی ملامت اور طعن و تضع کو دعوت دینے کے مترادف ہے، لہذا وہ خاموشی ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔

اس بناء پر جب آج کی دنیا میں اسلام کی سیاسی تعلیمات کی تشرع کی جاتی ہے تو اچھے اچھے لوگ (جن میں بہت سے علماء بھی داخل ہیں) اپنے ذہن کو زمانے کے ان فیشن ایبل تصورات سے آزاد نہیں کر پاتے، اور اس کے نتیجے میں جب وہ اسلام کے مطلوب سیاسی ڈھانچے کی تفصیلات بیان کرتے ہیں تو ان تصورات کو مستعار لے کر اس ڈھانچے میں فٹ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور اس طرح اس نازک موضوع پر القابس اور خلط مبحث کی اتنی تہیں چڑھتی چلی گئی ہیں کہ حقیقت حال چھپ کر رہ گئی ہے۔

## حکیم الامت کا تجدیدی کارنامہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے اللہ تعالیٰ نے چودہویں صدی میں دین کی تجدید کا عظیم الشان کام لیا، اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جس پر قرآن و سنت اور مأخذ شریعت کا پختہ رنگ اس طرح چڑھا ہوا ہو کہ کوئی دوسرا رنگ اس پر نہ چڑھ

سکے۔ ایسا شخص زمانے کو جانتا ضرور ہے، لیکن قبول وہی کرتا ہے جو اس پختہ رنگ کے مطابق ہو۔ وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھتا ہے، لیکن گرد و پیش میں ہونے والے پروپیگنڈے کے شور و شغب سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اور اگر بالفرض ساری دنیا کسی ایک سمت میں چلی جائے تو بھی وہ اللہ تعالیٰ کو توفیق خاص سے اسی بات پر ڈنارہ تا ہے جو مأخذ شریعت کی رو سے سچی اور کھری بات ہو، اور اس کے اظہار میں کوئی مرعوبیت یا شرم یا مخلوق کا خوف اس کے آڑے نہیں آتا۔

سیاست کے معاملے میں بھی حکیم الامت قدس سرہ نے دین کی صراط مستقیم پر اسی ثابت قدیمی کا مظاہرہ فرمایا، اور اس دور میں جب بہت سے باطل نظریات کی آمیزش نے سیاست کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو دھنڈا کر دیا تھا، حضرت نے اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص سے ان تعلیمات کو اپنی صحیح شکل و صورت میں پیش کیا اور پروپیگنڈے کے کسی شور و شغب سے مرعوب نہیں ہوئے۔

چونکہ آج کل کی سیاست (جس میں وہ سیاست بھی داخل ہے جس کا مقصد اسلام کا نفاذ بتایا جاتا ہے) ایک خاص رخ پر چل رہی ہے، اور اس میں بعض باتوں کو اصول موضوعہ کے طور پر اس طرح مسلم سمجھ لیا گیا ہے کہ ان کے خلاف کا تصور ہی ذہنوں میں نہیں آتا، اس لئے حضرت کے یہ سیاسی افکار ان سیاسی ذہنوں کو یقیناً اچھے محسوس ہوں گے جو بنیادی طور پر مغربی انداز سیاست سے متاثر ہیں۔ لیکن حضرت کے یہ افکار آپ کے ذاتی افکار نہیں ہیں، بلکہ ان کی بنیاد قرآن و سنت اور خلافت راشدہ کے طرز عمل پر ہے اور ان کے چیچھے نعلیٰ اور عقلی دلائل کی مضبوط طاقت ہے، اس لئے ان کا مطالعہ اور ان پر ٹھنڈے دل اور غیر جانبدار ذہن سے غور کرنا ضروری ہے تاکہ حقیقت حال واضح ہو سکے۔

حضرت کے سیاسی افکار کو تین حصوں میں منقسم کر کے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ اسلام میں سیاست کا مقام۔

۲۔ اسلام کا نظام حکومت اور حکومت کے فرائض۔

۳۔ اسلام میں سیاسی جدوجہد کا طریق کار۔

## اسلام میں سیاست کا مقام

سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ دین میں سیاست کا مقام کیا ہے؟ اور دین میں ایک صحیح سیاسی نظام کے قیام کی اہمیت کس درجے میں ہے؟ عیسائیت کا یہ باطل نظریہ بہت مشہور ہے کہ ”قیصر کا حق قیصر کو دو“ اور کلیسا کا حق کلیسا کو، جس کا حاصل یہ ہے کہ مذہب کا سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں ہے، اور مذہب و سیاست دونوں کا دائرہ عمل مختلف ہے، دونوں کو اپنے اپنے دائرے میں ایک دوسرے کی مداخلت کے بغیر کام کرنا چاہئے، دین و سیاست کی تفریق کا یہی نظریہ عہد حاضر میں ترقی کر کے ”سیکولر ازم“ کی شکل اختیار کر گیا جو آج کے نظام ہائے سیاست میں مقبول ترین نظریہ سمجھا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلام میں اس نظریے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلام کی تعلیمات چونکہ ہر شعبہ زندگی سے متعلق ہیں جن میں سیاست بھی داخل ہے، اس لئے اسلام میں سیاست کو دین و مذہب سے بے تعلق رکھنے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔

چنانچہ عہد حاضر میں بہت سے مسلمانوں نے عیسائیت اور سیکولر ازم کے اس باطل نظریے کی پر زور تردید کی، اور یہ ثابت کیا کہ سیاست کو دین سے الگ نہیں کیا جاسکتا، بقول اقبال مرحوم۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لیکن سیکولر ازم اور دین و سیاست کی تفریق کے اس نظریے کی پر زور تردید کرتے ہوئے بہت سے مسلمان مفکرین اور اہل قلم سے ایک نہایت باریک غلطی واقع ہو گئی جو دیکھنے میں بڑی باریک اور معمولی تھی، لیکن اس کے اثرات بہت دور رہ تھے۔ اس باریک غلطی کو ہم مختصر لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو اسے اس طرح تعبیر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے ”سیکولر ازم“ کی تردید کے جوش میں سیاست کو اسلامی بنانے کے بجائے اسلام کو سیاسی بنادیا، کہنا یوں تھا کہ ”سیاست“ کو دین سے الگ نہ ہونا چاہئے لیکن کہا یوں کہ دین کو سیاست سے الگ نہیں ہونا چاہئے۔

اس اجمالی کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام کے بہت سے احکام سیاست و حکومت سے متعلق ضرور ہیں اور ایمان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ہر مسلمان اسلام کے دوسرے احکام کی طرح ان احکام پر بھی بقدر استطاعت عمل کرنے اور کرانے کی کوشش کرے، حاکم کا فرض ہے کہ وہ اسلامی احکام کو

نافذ کرے، اور انہی احکام کے مطابق حکومت کرے، اور عوام کا فرض ہے کہ وہ شرعی احکام کے مطابق ایسی حکومت کے قیام کی کوشش اور اگر وہ قائم ہو جائے تو اس کی اطاعت کریں۔

## بعض مفکرین کی لغزش اور اسکے منفی نتائج

لیکن عہد حاضر کے بعض مفکرین اور مصنفین جنہوں نے یکور ازام کی تردید میں کام کیا، تردید کے جوش میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے سیاست اور حکومت کو اسلام کا مقصود اصلی، اس کا حقیقی نصب العین اور بعثت انبیاء کا مطیع نظر بلکہ انسان کی تخلیق کا اصل ہدف قرار دے دیا، اور اسلام کے دوسرے احکام مثلاً عبادات وغیرہ کو نہ صرف ثانوی حیثیت دے دی، بلکہ انہیں اسی مقصود اصلی، یعنی سیاست کے حصول کا ایک ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک طریقہ قرار دیا۔

اس انتہا پسندی کا پہلا زبردست نقصان تو یہ ہوا کہ اس کے نتیجے میں دین کی مجموعی تصور اور اس کی ترجیحات کی ترتیب (Order of Priority) الٹ کر رہ گئی، جو چیز وسیلہ تھی وہ مقصد بن کر ہمہ وقت دل و دماغ پر چھا گئی، اور جو مقصد تھا وہ ایک غیر اہم وسیلہ بن کر پس منظر میں چلا گیا، چنانچہ اس طرز فکر کے تحت ذہن کچھ اس طرح کا بن گیا کہ ایک مسلمان کا اصل مقصد زندگی سیاست اور حکومت کی اصلاح ہونا چاہئے کام وہی کام ہے جو اس راستے میں انجام دیا جائے، قربانی وہی قربانی ہے جو اس راہ میں پیش کی جائے، اور مثالی انسان وہی ہے جس نے اس کام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر دن رات اس کے لئے وقف کر رکھے ہوں۔ اور دین کے دوسرے شعبوں مثلاً طاعات و عبادات، زہد و تقوی، تزکیہ نفس اور خشیت و انبات وغیرہ کی نہ صرف یہ کہ کوئی خاص اہمیت باقی نہ رہی، بلکہ جو شخص ان کاموں میں مشغول ہو اس کے بارے میں یہ تصور قائم کر دیا گیا کہ گویا وہ مبادی میں الجھا ہوا ہے اور دین کے بنیادی مقاصد سے دور ہے۔

دوسرा نقصان یہ ہوا کہ جب اسلام کا مقصد اصلی سیاست و حکومت قرار پایا، اور عبادات وغیرہ کے احکام کی حیثیت مخفی وسیلے کی ہو گئی، تو یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کبھی کبھی وسائل کو مقصد پر قربان بھی کرنا پڑتا ہے، اور مقصد کے حصول کے لئے اگر کبھی کسی وسیلے میں

کچھ اونچ نجیا کی بیشی بھی ہو جائے تو وہ گوارا کر لی جاتی ہے۔ لہذا مذکورہ انتہا پسندی کے نتیجے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بات کی بڑی گنجائش پیدا ہو گئی کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے عبادات وغیرہ کے احکام میں کوئی کمی کوتا ہی بھی ہو جائے تو وہ قابل ملامت نہیں، کیونکہ وہ ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہوئی ہے۔

### ایک مثال سے وضاحت

سیاست کوئی دین کا ایک شعبہ نہیں، بلکہ دین کا مقصود اصلی قرار دینے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے تجارت و معیشت بھی دین کا ایک شعبہ ہے، اس حیثیت سے دین کے بہت سے احکام تجارت و معیشت سے بھی متعلق ہیں بلکہ کب حلال کے بہت سے فضائل بھی احادیث میں وارد ہوئے ہیں، اب اگر ان فضائل کے پیش نظر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ دین کا اصل مقصد ہی تجارت و معیشت اور کب حلال ہے تو یہ بات اتنی غلط ہو گی کہ اس پر دلائل قائم کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ بعینہ اسی طرح سیاست اس معنی میں دین کا ایک شعبہ ضرور ہے کہ دین کے بہت سے احکام اس سے متعلق ہیں، اور اس کے بہت سے فضائل بھی قرآن و حدیث میں وارد ہوئے ہیں لیکن ان فضائل کی بنیاد پر اس کو دین کا مقصود اصلی قرار دینا ایسی ہی غلطی ہے جیسے تجارت و معیشت کو دین کا اصل نصب العین قرار دینا۔

### زاویہ فکر کی تبدیلی

لیکن چودہویں صدی ہجری کے آغاز میں جب سے مسلمانوں میں مغربی استعمار سے آزاد ہونے کی تحریکات شروع ہوئیں، اس وقت سے وہ انتہا پسندانہ طرز فلکر عام ہوتا گیا جس میں سیاست کو ”خلافت فی الارض“ اور ”حکومت الہیہ“ وغیرہ کے عنوانات سے دین کا بنیادی مقصد قرار دے دیا گیا۔ طرز فلکر کی اس غلطی نے مسلمانوں میں اتنی آہنگی سے اپنی جگہ بنائی کہ اچھے لوگوں کو یہ احساس نہ ہو سکا کہ ان کے فکر و عمل کا کانٹا تبدیل ہو گیا ہے۔ ”سیاسی استقلال“ کی ضرورت و اہمیت اس درجہ ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی کہ اس باریک مگر دور رس غلطی پر غور کر کے ”دین میں سیاست“ کا صحیح مقام متعین کرنے کی فرصت

ہی نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تصور بعض حضرات نے شعوری طور پر اختیار کیا اور بعض نے غیر شعوری طور پر اور تحریکات کے اجتماعی عمل نے اس پر ایسی مہربنت کر دی کہ اچھے اچھے اہل علم کو بھی کانٹے کی اس تبدیلی کا احساس نہ ہو سکا۔

### شرعی نقطہ نظر

اس ماحول میں احقر کے علم کے مطابق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس باریک غلطی کو دوڑوک لفظوں میں واضح فرمایا اور قرآن و سنت کے دلائل سے ثابت کیا کہ دین میں سیاست کا صحیح مقام کیا ہے؟ حضرت فرماتے ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

الَّذِينَ إِنْ تَكْتُبُهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْوَلُ الزَّكُوَةَ وَأَمْرُوا  
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَنُوَعَّاقِبَةُ الْأُمُورِ

ترجمہ:- ”وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین کی حکومت عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور امر بالمعروف اور نبی عن المنکر کا فرض انجام دیں، اور سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔“

اس سے واضح ہے دیانت مقصود بالذات ہیں، اور سیاست و جہاد مقصود اصلی نہیں، بلکہ اقامت دیانت کا وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکام دیانت تو ان بیانات علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیئے گئے اور سیاست و جہاد سب کو نہیں دیا گیا، بلکہ جہاں ضرورت و مصلحت سمجھی گئی، دی گئی ورنہ نہیں۔ وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ ضرورت ہی کے لئے دیئے جاتے ہیں۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری آیات میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے۔ جس سے دیانت کا وسیلہ ہونا اور حکمکین فی الارض اور سیاست کا مقصود ہونا سمجھی میں آرہا ہے اور وہ یہ ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ أَمْنُوا مِنْ كُفَّارٍ وَعَمِلُوا الصَّلِيلَتِ لِيُسْتَخْلَفُنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا  
اُسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَدِّنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ

ترجمہ:- ”تم میں جو لوگ ایمان لا دیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا۔“

یہاں ایمان عمل صالح کو شرط قرار دیا جا رہا ہے تمکین فی الارض کی، جس سے تمکین و سیاست کا مقصود اصلی ہونا لازم آتا ہے۔ سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عمل صالح پر تمکین و شوکت کا وعدہ کیا گیا ہے اور بطور خاصیت کے شوکت کا دین پر مرتب ہونا ذکر فرمایا گیا ہے، پس دین پر سیاست و قوت موعود ہوئی لیکن مقصود کا مقصود ہونا ضروری نہیں، ورنہ آیت کریمہ۔

**وَلَوْاَنَهُمْ رَأَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ فِيْنَ رَبِّيْنَ**

**لَا كَلُوْا مِنْ فَوْقِهِنْ وَمِنْ تَحْتِهِنْ أَرْجُلَهُمْ**

ترجمہ:- ”اور اگر یہ لوگ تورات کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اور پر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے۔“

جس میں اقامست تورات و انجیل و قرآن، یعنی عمل بالقرآن پر وسعت رزق کا وعدہ کیا گیا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دین سے یہ مقصود ہے؟ بلکہ دین پر موعود ہے کہ دیندار بھوکا نہ کا نہیں رہ سکتا، پس موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں۔ یہاں بھی ایمان اور عمل صالح پر شوکت و قوت اور سیاست وغیرہ موعود ہیں جو بطور خاصیت اس پر مرتب ہوں گی نہ کہ مقصود جو اس کی غایت کھلائے۔

بہر حال! واضح ہوا کہ سیاست و دیانت میں سیاست و سیلہ ہے اور دیانت مقصود اصلی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں، بلکہ اس کا درجہ بتانا مقصود ہے کہ وہ خود مقصود اصلی نہیں اور دیانت خود مقصود اصلی ہے۔

(اشرف السوانح جلد ۲) (خاتمة السوانح) (مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

## دین کا مقصد اصلی

حقیقت یہ ہے کہ حضرت حکیم الامت نے ایک صفحے کی اس مختصر مگر انتہائی پرمغزا اور

جامع تقریر میں اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص سے موضوع کو اس قدر واضح فرمادیا ہے کہ اس میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ وہ یکوں نظریہ درست ہے کہ سیاست و حکومت میں دین کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہئے، اور نہ یہ خیال صحیح ہے کہ دین کا اصل مقصد سیاست و حکومت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین کا اصل مقصد بندے کا اپنے اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے جس کا مظاہرہ عبادات و طاعات کے ذریعے ہوتا ہے۔ سیاست و حکومت بھی اسی مقصد کی تحریک کا ایک ذریعہ ہے جو نہ بجائے خود مقصد ہے اور نہ اقامت دین کا مقصد اس پر موقوف ہے، بلکہ وہ حصول مقاصد کے وسائل میں سے ایک وسیلہ ہے۔ لہذا اسلام میں وہی سیاست و حکومت مطلوب ہے جو اس مقصد میں مدد و معان ہو، اس کے بر عکس جو سیاست اس مقصد کو پورا کرنے کے بجائے دین کے اصل مقاصد میں کتر بیونت کر کے انہیں مجرور کرے، وہ اسلامی سیاست نہیں ہے، خواہ اس کا نام ”اسلامی“، رکھ دیا گیا ہے۔

## (۲) اسلام کا نظام حکومت

### جمهوریت کی قلابازیاں

قرون وسطیٰ میں یورپ کے اندر جو شخصی حکومتیں عام طور سے رانج رہی ہیں وہ مطلق العنان بادشاہیں تھیں، جن میں بادشاہ کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھی اور اس پر کوئی قانون قدغن عائد نہیں ہوتی تھی، اس مطلق العنان حکمرانی کے نتیجے میں ظلم و ستم اور نا انصافیوں کا بازار گرم رہا، اس لئے اس کے خلاف یورپ میں شدید ر عمل ہوا۔ ”شخصی حکومت“، کو بذات خود نہایت معیوب سمجھا جانے لگا اور اس کی جگہ ”جمهوریت“ کو ایک مثالی طرز حکومت کے طور پر پیش کیا گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شخصی حکومتیں ختم ہو گئیں، اور ان کی جگہ جمهوری نظام حکومت وجود میں آیا، بیشتر ملکوں میں جمهوریت قائم کی گئی، یہاں تک کہ جمهوریت کو ایک ایسا فیشن اسیل نظام حکومت سمجھا جانے لگا جو سیاست میں عدل و انصاف اور حق و صداقت کا ضامن ہے۔ چنانچہ گذشتہ (ہجری) صدی سے لے کر اب تک جتنی سیاسی تحریکیں اٹھی ہیں، ان کے ذہن میں ”جمهوریت“ کی حیثیت معاذ اللہ ایک ایسے ”کلمہ“

طیبہ" کی ہو گئی ہے جس کے بغیر آج کے دور میں سیاست کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا بھر پر چھائے ہوئے اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہد حاضر میں جو سیاسی جماعتیں اسلام کا نام لے کر اٹھی ہیں، ان کی اکثریت بھی نہ صرف یہ کہ جمہوریت کو ایک مسلم اصول قرار دے کر آگے بڑھی ہے، بلکہ انہوں نے بھی اپنے مقاصد میں جمہوریت کے قیام کو سرفہرست رکھا ہے اور خود اپنی جماعت کو بھی جمہوری ڈھانچے پر تعمیر کیا ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں یہ دعوے بھی بکثرت کئے گئے ہیں کہ جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے بلکہ اسلام نے جمہوریت ہی کی تعلیم دی ہے، کسی نے بہت احتیاط کی تو یہ کہہ دیا کہ جمہوریت کے جواز اسلام کے خلاف ہیں، ہم ان کے قائل نہیں ہیں، لہذا ہماری جمہوریت "اسلامی جمہوریت" ہے۔

یہ تصورات ہمارے دور میں اس قد ر مشہور ہو گئے ہیں کہ ان کے خلاف کچھ سوچنا کہنا دنیا بھر کی لعنت و ملامت کو اپنے سر لینے کے مترادف ہے اور اگر ایسے ماحول میں کوئی شخص جمہوری حکومت کے بجائے شخصی حکومت کی حمایت کرے تو ایسا شخص تو آج کی سیاسی فضا میں تقریباً کلہ کفر کہنے کا مرٹکب سمجھا جانے لگا ہے۔

لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور خالص دین کی دعوت و تجدید کے لئے منتخب فرمایا ہو، وہ زمانے پر چھائے ہوئے تصورات اور خوشنام انعروں سے مرعوب و متأثر نہیں ہوتا، بلکہ ہر حال میں حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی یہ تسلیم نہیں فرمایا کہ اسلام نے جمہوریت کی تعلیم دی ہے یا جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے اپنے متعدد مواقع و مفہومات اور تصانیف میں جمہوریت پر نہایت جاندار تقدیمیں کی ہیں، اور اپنے دینی نقطہ نظر سے اس کی خرایوں کو واضح فرمایا ہے۔

عام طور سے جمہوریت کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں صرف اتنا خیال رہا کہ مطلق العنان بادشاہت کے مقابلے میں یہ نظام عوام کو آزادی اظہار رائے عطا کرتا ہے اور حکمرانوں پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جن کے ذریعے وہ بے مہار نہ ہو سکیں۔ اور چونکہ اسلام نے "مشاورات" کا حکم دیا ہے، اس لئے "جمہوریت" کو "مشاورت" کے ہم معنی سمجھ کر لوگوں

نے یہ کہنا شروع کر دیا جمہوریت میں اسلام ہے۔ حالانکہ بات اتنی سادہ نہیں ہے، درحقیقت ”جمہوری نظام حکومت“ کے پیچھے ایک مستقبل فلسفہ ہے جو دین کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، اور جس کے لئے یہ سکول ازام پر ایمان لانا تقریباً لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

جمہوریت کے حقیقت واضح کرنے کے لئے یہ جملہ مشہور ہے کہ:

It is the government of the people  
by the people for the people.

جمہوریت عوام کی حکومت کا نام ہے جو عوام کے ذریعے اور عوام کے فائدے کے لئے قائم ہوتی ہے۔

لہذا ”جمہوریت“ کا سب سے پہلا رکن اعظم یہ ہے کہ اس میں عوام کو حاکم اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے، اور عوام کا ہر فیصلہ جو کثرت رائے کی بنیاد پر ہوا ہو وہ واجب التعییل اور ناقابلٰ تنفس سمجھا جاتا ہے۔ کثرت رائے کے اس فیصلہ پر کوئی قدغن اور کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ اگر دستور حکومت عوامی نمائندوں کے اختیار قانون سازی پر کوئی پابندی بھی عائد کر دے۔ (مثلاً یہ کہ وہ کوئی قانون قرآن و سنت کے یا بنیادی حقوق کے خلاف نہیں بنائے گی) تو یہ پابندی اس لئے واجب التعییل نہیں ہوتی کہ یہ عوام سے بالاتر کسی احتارثی نے عائد کی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جسے ہر حال میں مانا ضروری ہے، بلکہ صرف اس لئے واجب التعییل سمجھی جاتی ہے کہ یہ پابندی خود کثرت رائے نے عائد کی ہے۔ لہذا اگر کثرت رائے کسی وقت چاہے تو اسے منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمہوریت نے کثرت رائے کو (معاذ اللہ) خدائی کا مقام دیا ہوا ہے کہ اس کا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر مغربی ممالک میں بد سے بدر تقوائیں کثرت رائے کے زور پر مسلسل نافذ کئے جاتے رہے ہیں، اور آج تک نافذ کئے جا رہے ہیں، زنا جیسی بد کاری سے لے کر ہم جسی جیسے گھناؤ نے عمل تک کو اسی بنیاد پر سند جواز عطا کی گئی ہے، اور اس طرز فکر نے دنیا کو اخلاقی تباہی کے آخری سرے تک پہنچا دیا ہے۔

## جمهوری فلسفہ پر حکیم الامت کا تبصرہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے کثرت رائے کے اس جمہوری فلسفے پر جا بجا تبصرے فرمایا کہ اس کی کمزوری کو واضح کیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَإِنْ تُطِعُ الْكُثُرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضْلُلُكُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ

ترجمہ:- اور اگر آپ زمین والوں کی اکثریت کی اطاعت کریں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے گراہ کر دیں گے۔“

کثرت رائے کو معيار حق قرار دینے کے خلاف اس سے زیادہ واشگاف اعلان اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن زمانے پر چھائے ہوئے نظریات سے مرعوب ہو کر مسلمانوں میں بھی یہ خیال تقویت پا گیا کہ جس طرف کثرت رائے ہوگی، وہ بات ضرور حق ہوگی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے اپنی تالیفات اور موعظ و ملفوظات میں بہت سے مقامات پر اس پھیلی ہوئی غلطی کی تردید فرمائی ہے، ایک وعظ میں فرماتے ہیں۔

”آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوئی ہے، صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے؟ کیا ان عوام کا لانعام کی؟ اگر انہیں کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا، ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر کیوں انہوں نے توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی؟ کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا؟ اسی لئے کہ وہ قوم بہت جاہل تھی اس کی رائے جاہل انہوں نے تھی۔ (فصل الحکم والخشیۃ ۲۰ و معارف حکیم الامت ۲۷)

مطلوب یہ ہے کہ عوام کی کثرت رائے کبھی معيار حق نہیں ہو سکتی کیونکہ عوام میں اکثریت عموماً بے علم یا کم علم لوگوں کی ہوتی ہے۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

”مولانا محمد حسین اللہ آبادی نے سید احمد خان سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو کیونکہ قانون

فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بے وقوف زیادہ، تو اس قاعدے کی بنا پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کافی صد ہو گا۔ (تقلیل الاخلاط میں الاتام دعویٰ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ۶۲۶)

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

(غزوہ احمد) میں ان پچاس آدمیوں میں جو پہاڑ کی گھائی پر متعین تھے، اختلاف ہوا بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہو گئی ہے اب ہم کو گھائی پر رہنے کی ضرورت نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی ہے اس لئے حکم قرار بھی ختم ہو گیا اب یہاں سے ہٹنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد کی مخالفت نہ ہو گی اور ہم نے اب تک جنگ میں حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہئے ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں، ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہئے، بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمادیا تھا کہ بدؤں میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا اس لئے ہم کو بدؤن آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہئے۔ مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھائی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی، اور گھائی پر صرف دس آدمی اور ایک افران کے رہ گئے (اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلت رائے صواب پر تھی جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔) (ذم الانسان ص ۱۲، دعویٰ حکیم الامت ص ۶۱۸)

اسی وعظ میں آگے چل کر حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے کثرت رائے کی لازمی حقانیت کے خلاف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل کی مثال بھی دی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو آپ نے ان کے خلاف جہاد کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت بیشتر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رائے یہ تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ جہاد نہ کیا جائے لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی رائے پر قائم رہے اور اسی کے مطابق فیصلہ بھی ہوا اور بعد میں سب لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ صائب رائے یہی تھی۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے کثرت رائے کو معيار حق قرار دینے کے نظریے

پر شرعی اور عقلی دونوں قسم کے دلائل سے تنقید فرمائی ہے، اور سادہ سادہ لفظوں میں ایسے حقائق بیان فرمادیئے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص خندے دل سے غور کرے گا اسی نتیجے تک پہنچے گا چنانچہ جدید علم سیاست کے بعض حقیقت پسند ماہرین نے بھی ”جمهوریت“ کے ان نقائص کو تسلیم کیا ہے۔ ایک مشہور ماہر سیاست ایڈمنڈ بورک (Burke) لکھتا ہے۔

”اکثریت کے فیصلہ کو تسلیم کرنا کوئی فطرت کا قانون نہیں ہے، کم تعداد بعض اوقات زیادہ مضبوط طاقت بھی ہو سکتی ہے اور اکثریت کی حرص وہوں کے مقابلے میں اس کے اندر زیادہ معقولیت بھی ہو سکتی ہے لہذا یہ مقولہ کہ ”اکثریت کے فیصلہ کو قانون بننا چاہئے“، اس میں افادیت اور پالیسی کی بھی اتنی ہی کمی ہے، جتنی حقانیت کی۔“

حکیم الامت قدس سرہ ایک اور وعظ میں فرماتے ہیں۔

”اول تو کثرت رائے میں احقوں کو جمع کیا جاتا ہے ان کی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہو گی، پھر ان سے بھی پہلے اپنی رائے منواںی جاتی ہے اس سبق کی طرح پڑھادیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے، تم یوں کہہ دینا، جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں اب ہو کثرت کیا خاک ہو گی۔ بعض جمہوریت پرست لوگوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اس تبصرے کو ایک سطحی تبصرہ قرار دینے کی کوشش کی ہے، اور بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک ایسے بزرگ کا تبصرہ ہے جن کا میدان علم سیاست نہیں تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی نگاہ اپنی گوشہ نشینی کے باوجود زمانے کی دھمکی ہوئی رگوں پر ہوتی تھی۔ ان کا اصل مأخذ قرآن و سنت تھے اور وہی کی اسی روشنی نے انہیں وہ نور فرست عطا فرمادیا تھا، جس کے ذریعے وہ ان مسائل کو انتہائی سادگی سے بیان فرمائے ہیں، جن کو لوگوں نے ایک مستقل فلسفہ بنارکھا ہے چنانچہ یہ تبصرہ بھی اسی فرست ایمانی کا نتیجہ تھا۔ علم سیاست بے شک آپ کا اصل میدان نہیں تھا، لیکن جو سچائی و حی کے نور سے معلوم ہوئی ہو، اسے رسمی علوم کی حاجت نہیں ہوتی۔ لیکن اس علمی سیاست کے وہ ماہرین بھی جنہوں نے پروپیگنڈے سے ذرا آزاد ہو کر سوچنے کی کوشش کی ہے وہ بھی بالآخر اسی نتیجے تک پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر اے۔ اپا دورائے بر صغیر میں اپنی سیاسی تصنیف کی وجہ سے خاصے مشہور ہیں۔ وہ ”جمهوریت“ کے تعارف اور اس کی کامیاب کی شرائط پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ۔

”جمهوریت کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ شرائط (جن کے وجود پر جمہوریت کی کامیابی موقوف ہے) شاذ و نادر ہی پوری ہوئی ہیں۔ عملی اعتبار سے جمہوریت دراصل جہالت کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس کی ساری توجہ کیست اور تعداد (Quantity) پر ہتی ہے۔ کیفیت (Quality) پر نہیں۔

اس میں ووٹ گئے جاتے ہیں، انہیں توانی میں جاتا۔ شہریوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی حکومت کو اپنے بنیادی و ظائف زندگی میں سے نہیں سمجھتی، چنانچہ اس کو حکومت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی، وہ کام کرتی اور کھلائی رہتی ہے، اپنے پیشہ وارانہ اور فنی کاموں کو انجام دیتی رہتی ہے ہل چلاتی، نجبوتی، فصلیں کامی اور انہیں پیچتی رہتی ہے، اور یہ بھول جاتی ہے کہ وہ دراصل ملک کی حاکم ہے۔ جمہوریت میں یہ حقیقی خطرہ موجود ہے کہ شہریوں کی ایسی ذہنی تربیت نہیں ہو پاتی، جس کے ذریعہ وہ ان مسائل کے حقیقی مفہوم کا ادراک کر سکیں جو انتخابات کے موقع پر ان کے سامنے فیصلے کے لئے آتے ہیں، لہذا وہ طبقاتی جذبات اور نعروں سے گمراہ ہو سکتے ہیں، سرہنری میں تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جمہوریت کبھی بھی اکثریت کی حکمرانی کی نمائندگی نہیں کر سکتی کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ عوام تو محض اپنے لیڈروں کی آراء کو تسلیم کرتے ہیں۔

مغرب کے مشہور مورخ اور فلسفی کارل ای اقتباس علم سیاست میں کافی شہرت پا گیا ہے کہ

*Surely of all "rights of man"*

this right of the ignorant man to be guided by the wiser to be gently or forcibly held in the true vourse by him is the indisputable. Nature hereself ordains it from the first society struggles towards perfection by enforcing and accmoplishing it more and more.... in Rome and Attens as elsewhere if you look practical we shall find that it was not by loud voting and debating of many but by wise inright and ordering of a few that the word war done. So is it ever so will it ever be".

”انسانی حقوق“ میں یقینی طور پر جاہل افراد کا یہ حق سب سے زیادہ غیر متنازع ہے کہ عقلمند افراد کی رہنمائی کریں، اور انہیں نرمی سے یا طاقت کے ذریعہ سیدھے راستے پر رکھیں۔ فطرت کا شروع سے یہی حکم ہے، اسی حکم کو نافذ کر کے اور اس کی زیادہ سے زیادہ سمجھیل کر کے ہی سوسائٹی کمال تک پہنچنے کی جدوجہد کرتی ہے..... اگر ہم عملی نقطہ نظر سے

دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ روم اور ایجنٹز میں دوسرے مقامات کی طرح بلند آواز سے رائے شماری کرنے اور بہت سے لوگوں کے بحث مباحثے کے ذریعے نہیں بلکہ گنے پھنے افراد سے کام چلتا تھا۔ یہ بات ہمیشہ سے بحث رہی ہے۔ لہذا آئندہ بھی یہی بات بحث رہے گی۔“

## شخصی حکومت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے جمہوریت پر تنقید فرماتے ہوئے کئی مقامات پر اس کے مقابلے میں ”شخصی حکومت“ کی حمایت کا کلمہ کفر کی طرح نشانہ ملامت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بنیادی سبب دو ہیں۔ ایک یہ کہ جمہوریت کی حمایت میں پروپیگنڈا اس قدر زور شور کے ساتھ کیا گیا کہ کسی مخالف نظام حکومت پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر ہی ذہن آمادہ نہیں ہوتے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ”شخصی حکومت“ کا نام آتے ہی ذہن ان مطلق العنان بادشاہوں کی طرف چلا جاتا ہے جن کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھی اور ان پر کوئی بالاتر پابندی عائد نہ تھی، یا پھر اس نام سے ان فاشی حکمرانوں کا تصور آ جاتا ہے جن کے نزدیک حکومت کی بنیاد پھر زور زبردستی پر تھی۔ حالانکہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ ”شخصی حکومت“ سے وہ ”مثالی اسلامی حکمران“ مراد لیتے ہیں جسے امیر المؤمنین یا خلیفہ وقت کہا جاتا ہے۔

اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں جو غیر اسلامی شخصی حکومتیں رانج رہی ہیں۔ ان کی خرابیوں اور مفاسد کے اساب مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱)..... ان ”شخصی حکومتوں“ کی بنیاد بادشاہتوں میں عموماً خاندانی وراثت پر تھی اور فاشزم کے فلسفے میں صرف ”قوت“ پر جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو قومی ہو، وہ کمزور پر حکومت کا حق لے کر آیا ہے۔ لہذا ان شخصی حکومتوں کے قیام میں سنجیدہ غور و فکر اور مناسب انتخاب کا کوئی قابل ذکر کردار نہیں تھا۔

(۲)..... ان شخصی حکمرانوں کے لئے کوئی ایسی لازمی صفات الہیت نہیں تھیں جن کے بغیر وہ حکمرانی کے منصب تک نہ پہنچ سکتے ہوں۔

(۳)..... یہ شخصی حکومتیں عموماً ایسا آسمانی قوانین کی پابند نہیں تھیں جو ان کے فیصلوں کو

لگی بندھی حدود میں محدود رکھ سکیں۔ لہذا قانون ساز وہ خود تھے اور مطلق العنان ہونے کی بنا پر ان کی زبان قانون بن گئی تھی۔

(۲)..... ان حکومتوں میں کوئی ایسا لازمی ادارہ موجود نہیں تھا جو ان کے اقدامات، ان کے صادر کئے ہوئے احکام، اور ان کے بنائے ہوئے قوانین کو کسی لگے بندھے معیار پر پرکھ سکتا اور ان کی طرف سے آسمانی قانون کے خلاف ورزی، اپنی حدود اختیار سے تجاوز، یا کسی ظلم و ستم کی صورت میں ان کے اقدامات کی تلافی کر سکتا۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر شخصی حکومتوں میں لوگوں کے حقوق پامال ہوئے اور انسان انسان کا غلام بن گیا۔ ورنہ اگر یہ خرابیاں موجود نہ ہوں تو بیشتر ماهرین سیاست اس بات پر متفق ہیں کہ شخصی حکومت میں بذات خود کوئی خرابی نہیں۔ وہ جمہوریت کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب اور عوام کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ رو سونے بھی یہ اعتراف کیا کہ: ”حکومت کا بہترین اور سب سے فطری انتظام یہ ہے کہ عقل مند ترین انسان کو کثرت پر حکومت کرنی چاہئے بشرط یہ کہ اس بات کی ضمانت مل جائے کہ وہ اس کثرت کے مفاد کے لئے حکومت کریں گے، نہ کہ اپنے مفاد کے لئے“، کارل انل لکھتا ہے کہ۔

”کسی بھی ملک میں وہاں کے قابل ترین آدمی کو دریافت کرلو، پھر اسے اٹھا کر اطاعت کے اعلیٰ ترین مقام پر رکھ دو، اور اس کی عزت کرو، اس طرح تم اس ملک کے لئے ایک مکمل حکومت دریافت کرلو گے، پھر بیلٹ بکس ہے، یا پارلیمنٹ میں ہونے والی فصاحت و بلاغت یا رائے شماری یا دستور سازی یا کسی بھی قسم کی کوئی اور مشینی اس حکومت میں کوئی بہتر اضافہ نہیں کر سکے گی۔ یہ ایک مکمل ریاست ہو گی اور وہ ملک ایک مثالی ملک ہو گا۔“

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ جس ”شخصی حکومت“ کو اسلام کا تقاضا قرار دے رہے ہیں۔ وہ شخصی حکومت کی مذکورہ بالآخرایوں سے خالی ہے۔ وہ اس معنی میں ہے کہ ”شخصی حکومت“ ہے کہ اس میں جمہوری انداز کی پارلیمنٹ مختار کل نہیں ہے، اور اختیارات حکومت بڑی حد تک ”خلیفہ“ یا ”امیر المؤمنین“ کی ذات میں مرکوز ہیں، لیکن سب

سے پہلی بات یہ ہے کہ اس ”خلیفہ“ یا ”امیر المؤمنین“ کا تعین و راثت یا قوت کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اہل حل و عقد کے انتخاب کے ذریعے ہوتا ہے اور اس انتخاب کے لئے ”خلیفہ“ میں کچھ معیاری اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔ جن کے بغیر اہل حل و عقد کے لئے کسی شخص کا انتخاب جائز نہیں۔ ان اوصاف میں علمی قابلیت کے علاوہ کردار کی اعلیٰ ترین پختگی اور رائے کی اصابت بھی داخل ہے۔ آج کل کی جمہوریتوں میں سربراہ کے انتخاب کے لئے عموماً نہ کوئی قابلیت شرط ہوتی ہے، نہ کردار و عمل کی کوئی خوبی۔ لیکن ”خلیفہ“ کے لئے اسلام میں نہایت کڑی شرائط تجویز فرمائی گئی ہیں اور اہل حل و عقد کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان شرائط کا مکمل اطمینان حاصل کرنے کے بعد خلیفہ کا انتخاب کریں۔

پھر یہ خلیفہ بھی، جو اعلیٰ ترین علمی اور عملی اوصاف کا حامل ہے، مطلق العنان قانون ساز نہیں ہوتا، بلکہ قرآن و سنت اور اجماع امت کا پابند ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قانون وضع نہیں کرتی، بلکہ ایک ایسے آسمانی قانون کی بنیاد پر وجود میں آتی اور اسی کو نافذ کرتی ہے جو کائنات کی اعلیٰ ترین اتحارثی کا بنایا ہوا ہے، اور قرآن و سنت کی صورت میں محفوظ ہے۔ ہاں قرآن و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے انتظامی قوانین اور احکام جاری کرنا حکومت کے اختیار میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی اس پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اس قسم کے اقدامات کے لئے اہل شوری سے مشورہ لے، اس مشورے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ لازمی طور پر کثرت رائے کی پابندی کرے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسئلے کے تمام پہلو سامنے آ جائیں اور ان کو مدنظر رکھنے کے بعد وہ اپنی بہترین قابلیت اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر خود فیصلہ کرے۔

اس کے علاوہ سربراہ حکومت کا ہر اقدام، اس کا ہر حکم اور اس کا ہر نامہ ہر قانون چونکہ قرآن و سنت کے تابع ہوتا ہے۔ لہذا اگر کسی وقت یہ سربراہ قرآن و سنت کے احکام سے تجاوز کرے یا عدل و انصاف کے خلاف کوئی کام کرے تو قاضی کی عدالت سے اس کے خلاف چارہ کا راحصل کرنا ہر ادنیٰ شہری کا ناقابل تفسخ حق ہوتا ہے۔

اس نظام حکومت کی تمام تفصیلات کو بیان کرنا اس مقالے کی حدود سے باہر ہے، لیکن

یہاں بتانا صرف یہ تھا کہ حکیم الامت قدس سرہ نے اسلام میں جس "شخصی حکومت" کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس میں قدیم بادشاہتوں اور جدید فاشی حکمرانوں اور ڈکٹیشوروں کی خرابی کے بنیادی اسباب موجود ہیں ہیں۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے جمہوریت اور شخصی حکومت پر اپنے متعدد مواعظ اور مفہومات میں تبصرہ فرمایا ہے۔ جن میں سے غالباً سب سے جامع اور مفصل بحث اس وعظ میں فرمائی ہے جو "تقلیل الاختلاط مع الانام" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے چند مختصر اقتباسات ذیل میں پیش خدمت ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں، وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں، مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے کبھی حکمی، فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے۔ مگر وہ واحد حکمی ہے، حقیقی نہیں، تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں۔ اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں، مگر مجموعہ مل کر پھر شخص واحد ہے، کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے، وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد ہیں کہ جو رائے دے دے وہی پاس ہو جایا کرے، اگر ایسا بھی ہوتا، جب بھی کسی قدر آدمی کا دعویٰ صحیح ہوتا۔ مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں۔ بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں، اور تم شخص واحد حکمی کے حامی ہو۔ جمہوریت کے حامی تو تم بھی نہ رہے، جمہوریت اور آزادی کا مل توجہ ہوتی ہے جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا، کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا، نہ ایک بادشاہ کا، نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنادیا، ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے، تم نے دس کا غلام بنادیا۔ تمہیں فیصلہ کرلو کہ ایک کا غلام ہونا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا؟ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو، وہ اس سے بہتر ہے جس پر دس بیس کی حکومت ہو، یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اسے بھی انکار نہیں، مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔"

آگے ارشاد فرماتے ہیں۔

”نظام عالم بدوں اس کے قائم نہیں ہو سکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں، بعض متبوع ہوں۔ آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں آ کر ان کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹانا پڑتا ہے اور شریعت کو بھی اپنے دعویٰ سے ہٹانا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے۔ وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں، اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا۔ بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانے میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے۔ دوسرے متبوع تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ایک زمانے میں دو نبی تھے۔ جو نبی اسرائیل اور قوم قبط کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے۔ حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے، مگر دونوں برابر درجہ میں نہ تھے، اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔“

مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں، اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوریت میں متفقین ہیں، شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں بیان کی جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو، اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہئے، بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے، کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے، بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا، ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، کیونکہ

جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں، کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا ایک نے تاریخی کو ایجاد کیا، ایک نے ریل کا ایجاد کیا، تو موجود اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صد ہزار ہائیلود کا ذہن نہیں پہنچتا۔ علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شرح و تکشیں کی تقریبیں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے اب بتلائیے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا؟ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا ہے بادشاہ اپنی رائے سے فیصلہ نہیں کر سکتا، بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے اور جمہوریت میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں، سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر، اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے، اس لئے یہ قاعدہ کلی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جائے خواہ وہ ایک شخص ہی کی رائے ہو۔

مزید آگے ارشاد فرماتے ہیں:

”دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں، وہ بادشاہ کو تہاں فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے، وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تہاڑا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے، تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں، ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے ان کو جمہوریت مبارک ہو، ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنادیا جائے۔ اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل و عقد! اے جماعت عقلاء! بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر بھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو، اور جس کی رائے میں اتنی درایت نہ ہو، اس کو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ۔ اب بتلاؤ کہ جس کی رائے اتنی زریں ہو کہ سارے عالم کے مقابلے میں بھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو وہ حکومت شخصی کے قابل ہے یا نہیں؟ یقیناً قابل

ہے بشرط یہ کہ اہل حل و عقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔“

بس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زریں العقل، صاحب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کر تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نا اہل سمجھتے ہو، تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جس کے لئے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو، بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو، مستقبل الرائے ہو اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے، صاحب العقل، زریں سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا، اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوچی کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھوٹنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ ”وَشَاءُرُهُمْ فِي الْأَمْرِ“ مگر یہ بالکل غلط ہے ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا، اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریہ تم اپنے شوہر سے رجوع کرلو۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت بریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص جن کا نام مغیث تھا، ان کے آقانے کر دیا تھا جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دے دیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا۔ اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں، اگر چاہیں فتح کر دیں، اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار حق کہتے ہیں اس اختیار کی بناء پر حضرت بریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نکاح سابق کو فتح کر دیا۔ لیکن ان کے شوہر کو ان سے بہت محبت تھی، وہ صدمہ فراق میں مدینہ کے گلی کو چوں میں روتے پھرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر رحم آیا اور حضرت بریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے بریہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا اچھا ہو کہ اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو تو وہ دریافت فرماتی ہیں۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ کا حکم ہے؟ یا مشورہ کی ایک فرد ہے؟ اگر حکم ہے تو برسو چشم منظور ہے۔ گو مجھ کو تکلیف ہی

ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صاف عرض کر دیا اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی۔ لیجئے! اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے پر عمل نہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ذرا بھی ناراض نہ ہوئے اور نہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کچھ گناہ ہوانہ ان پر کچھ عتاب ہوا۔ سو جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیوں کر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دیں اسی کے موافق عمل کرے اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔

پس ”وَشَاؤْهُمْ فِي الْأَمْرِ“ سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور جب تک ثابت نہ ہواں وقت تک ”وَشَاؤْهُمْ فِي الْأَمْرِ“ سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو؟ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے، یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ہمارے پاس حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورے پر عمل کرنا ضروری نہیں، خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے ہرگز مجبور نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف کیوں نہ ہو چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے: **فَإِذَا عَزَّمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ** کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں، یہاں ”إِذَا عَزَّمْتَ“ صیغہ واحد ہے معلوم ہوا کہ عزم میں حضور مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو اذاعزمت نہ فرماتے بلکہ اس

کے بجائے اذا عزم اکثر کم فتوکلوا علی اللہ فرماتے، پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں، اس کا اخیر جزو خود ان کے دعویٰ کی تردید کر رہا ہے۔ مگر ان کی حالت یہ ہے کہ ”حفظت شيئاً و غابت عنك اشياء“، کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو۔ چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں، اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں۔ چنانچہ شریعت میں ”اشرير والحكام وهو حفظكم عليهم“ کہیں نہیں کہا گیا جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لزوم نہیں اور پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے۔ (تقلیل الاختلاط مع الانام ص ۲۸ و اشرف الجواب ص ۳۰ تا ۳۱ مطبوعہ ملتان و معارف حکیم الامت ص ۶۰ تا ۶۲)

## حکمرانی ایک ذمہ داری ہے نہ کہ حق

پھر غیر اسلامی شخصی حکومتوں میں اور اسلام کی شخصی حکومت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ غیر اسلامی معاشروں میں ”شخصی حکومت“ ایک ”حق“ (Prinilege) یا ایک فائدہ (Advantage) سمجھ لیا گیا ہے اسی لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حق کس کو ملے؟ اور کس کو نہ ملے؟ اور اسی لئے لوگ از خود اس کے حصول کے لئے دوڑھوپ کرتے ہیں اس کے برعکس اسلام میں یہ ایک ”امانت“ یا ایک ”ذمہ داری“ ہے جو حکمران کے لئے اساب عیش فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ کندھے پر دنیا و آخرت کا ایک زبردست بوجھ سوار کرنے کے متراوف ہے لہذا یہ از خود کو شش کر کے حاصل کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایسی چیز ہے جس سے انسان اپنی استطاعت کی حد تک جتنا بھاگ سکے اتنا ہی بہتر ہے۔ اسلام میں اس شخص کو ”حکومت“ کے لئے نااہل قرار دیا گیا ہے جو خود اس کا طلب گار ہو چنانچہ اسلامی سیاست میں ”امیدواری“ (Candidature) کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

## حکومت کے فرائض

لہذا جس شخص کو بھی یہ ذمہ داری سونپی جائے اسے اس نقطہ نظر کے ساتھ اسے سنجانا ہے کہ "حکومت" بذات خود مقصود نہیں جس سے ہر حال میں چھٹے رہنا ضروری ہو، بلکہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، لہذا اگر کبھی حکومت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں تعارض ہو گا تو وہ بلا تامل اپنی حکومت کو اللہ کی خوشنودی پر قربان کروں گا، اس سلسلے میں حکیم الامت ایک وعظ میں فرماتے ہیں۔

"یاد رکھو! سلطنت مقصود بالذات نہیں، بلکہ اصل مقصود رضاۓ حق ہے اگر ہم سے خدا راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں، اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں۔ اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو فرعون، ہامان، نمرود و شداد بڑے مقرب ہونے چاہیں، حالانکہ وہ مردود ہیں۔ معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضاۓ حق بھی ساتھ ساتھ ہو اور جس سلطنت میں رضاۓ حق نہ ہو، وہ وہاں جان ہے اگر ہم سے خدا راضی ہو تو ہم پا خانہ اٹھانے پر راضی ہیں، اور اسی حالت میں ہم بادشاہ ہیں آخ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے؟ ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی پھر کیوں چھوڑی؟ حضرت اس لئے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا؟ معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود دوسری چیز ہے کہ اگر اس میں خلل واقع ہونے لگے تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے، حضرت ابراہیم بن ادھم ہرن کے امام ہیں، حدیث میں ثقہ اور محدث ہیں، اور فقہاء میں فقیہ اور صوفیاء میں تو امام ہیں، ان کو کوئی پاگل نہیں کہہ سکتا، جوان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے پھر دیکھو تو انہوں نے کیا کیا؟ جب رضاۓ حق میں سلطنت کو مزاحم دیکھا تو بادشاہت پر لات مار کر الگ ہو گئے۔ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سلطنت مصروف نہ تھی، تو ان کو اجازت دی گئی کہ منصب خلافت کو قبول کریں اور حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے مصروف نہ تھی تو ان کے لئے حکم ہے لا تلین مال یتیم ولا تقضین بین اثنین۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود رضاۓ حق ہے اگر

سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہو تو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا۔“

(تقلیل الاتخالات مع الانام ص ۲۰۲۰، ۲۲، اشرف الجواب ص ۳۵۶۳۵۵)

لہذا اسلامی حکمران کا فریضہ ہے کہ وہ حکومت کو رضاۓ الہی کا وسیلہ بنانے کے لئے اسلامی احکام پر عمل اور ان کے نفاذ کے لئے اپنی جان توڑ کوش صرف کرے، ورنہ اس کی حکومت بیکار محض اور اس کا حکومت سے چمٹا رہنا ناجائز و حرام ہے لہذا اس کا یہ فرض ہے کہ انہٹائی جزرسی کے ساتھ اپنے اقدامات کا جائزہ لیتا رہے اور شریعت کے معاملے میں ادنیٰ غفلت کو گوارانہ کرے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

”سلطنتیں جو گئی ہیں، میرے نزدیک چھوٹی چیزوں کے اہتمام کی غفلت ہی سے گئی ہیں کیونکہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کی طرف سے جو غفلتیں ہوتی رہتی ہیں وہ سب مل کر ایک بہت بڑا مجموعہ غفلتوں کا ہو جاتا ہے جو آخر میں رنگ لاتا ہے اور اثر زوال کا موجب ہوتا ہے نیز جب چھوٹی چھوٹی باتوں کا اہتمام نہیں ہوتا تو غفلت کی عادت پڑ جاتی ہے، پھر بڑے بڑے امور میں بھی غفلت ہونے لگتی ہے اور وہ براہ راست مخل ہیں سلطنت کی۔“ (اصلاح اسلامین ص ۵۲۷، بحوالہ اتفاقات ص ۷ ملفوظ ۲۵۹)

مسلمان حاکم کا فرض جس طرح یہ ہے کہ وہ خود انصاف کے خلاف کوئی کام نہ کرے اسی طرح اس کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کو بھی ظلم نہ کرنے دے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

”حاکم تنہ اپنی احتیاط سے نجات نہیں پا سکتا بلکہ اس کا انتظام بھی اس کے ذمے ہے کہ متعلقین بھی ظلم نہ کرنے پائیں جس کی صورت یہ ہے کہ عام طور سے اشتہار دے دے کر میرے یہاں رشوت کا بالکل کام نہیں اس لئے اگر میرے عملے میں بھی کوئی شخص کسی سے رشوت مانگے تو ہرگز نہ دے، بلکہ ہم سے اس کی اطلاع کرے، پھر اطلاع کے بعد جس نے ایسی حرکت کی ہو، اس سے رقم واپس کرائے اور کافی سزادے..... نیز حاکم کو یہ بھی چاہئے کہ لوگوں کے تعلقات براہ راست اپنے سے رکھیں، کسی شخص کو دو اسٹن نہ بنائیں، کیونکہ یہ واسطے بہت ستم ڈھاتے ہیں۔ اگر کہو کہ صاحب یہ تو بڑا مشکل ہے، تو حضرت! حکومت کرنا آسان نہیں، یہ منہ کا نوالہ نہیں ہر وقت جہنم کے کنارے پر ہے۔“ (انفاس عیسیٰ ص ۲۲۵، ۲۲۳ جلد اباب ۳)

اسلامی حکومت میں حکمران اور علماء کے درمیان تقسیم کا رکیا ہونے چاہئے؟ اس کے بارے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

”حضرور صلی اللہ علیہ وسلم میں دو شانیں تھیں، شان نبوت اور شان سلطنت، اس کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی دونوں کے جامع تھے، مگر اب یہ دونوں شانیں دو گروہوں پر تقسیم ہو گئیں، شان نبوت کے مظہر علماء ہیں اور شان سلطنت کے مظہر سلاطین اسلام، اب اگر یہ سلاطین علماء سے استغنا کرتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے، اور اگر علماء سلاطین کی مخالفت کرتے ہیں تو اس سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے، اب صورت دونوں کے جمع کرنے کی یہ ہے کہ سلاطین سے تو میں یہ کہتا ہوں کہ وہ اپنی حدود میں کوئی حکم اس وقت تک نافذ نہ کریں جب تک علماء حق سے استغنا نہ کر لیں، اور علماء سے یہ کہتا ہوں کہ وہ نفاذ کے بعد اس پر کاربند ہوں، اگر یہ دونوں شانیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہیں اس طرح جمع ہو جائیں تو مسلمانوں کی بہبود اور فلاح کی صورت نکل آئے، اور ان کی ڈوہتی ہوئی کشتی ساحل پر جا لگے، ورنہ اللہ ہی حافظ ہے۔“ (اصلاح المسلمين، ص ۵۲۶)

مباحثات کے دائرے میں رہتے ہوئے حکمران کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ عقائد اور تجربہ کار لوگوں سے مشورہ لیتا رہے، لیکن مشورے کے بعد جب کسی جانب ر. ج. حان ہو جائے اور اللہ کے بھروسے پر اس کے مطابق فیصلہ کر دے تو تمام لوگوں پر اس کی اطاعت واجب ہے، خواہ ان کی رائے کے خلاف ہو۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

”سلطان کو چاہئے کہ ہمیشہ عقلااء سے رائے لیتا رہے، بدلوں رائے لئے بہت سی باتیں نظر سے غائب رہتی ہیں، اور یہ مشورہ اور رائے تو مطلوب ہے، مگر یہ مختصر متعارفہ جمہوریت مخفی گھڑا ہوا ڈھکو سلہ ہے، بالخصوص ایسی جمہوری سلطنت جو مسلم اور کافر ارکان سے مرکب ہو وہ تو غیر مسلم ہی سلطنت ہو گی، ایسی سلطنت اسلامی نہ کھلائے گی۔“

اس پر ایک صاحب نے عرض کیا کہ اگر سلطان کے مشورہ لینے کے وقت اہل شوری میں اختلاف رائے ہو جائے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ سلطان کی رائے سے اختلاف کرنا

ذموم تو نہیں، اس پر فرمایا کہ:

”جو اختلاف حکمت اور مصلحت اور تدین و خیرخواہی پر منی ہو وہ ذموم نہیں، مگر اس کی بھی ایک حد ہے، یعنی یہ اختلاف اسی وقت تک جائز ہے جب تک مشورہ کا درجہ رہے، مگر بعد نفاذ اختلاف کرنا یا خلاف کرنا ذموم ہے، نفاذ کے بعد تو اطاعت ہی واجب ہے۔“

(الافتاءات الیومیہ ص ۱۱۲، جلد ۳ ملفوظ ۲۵۲)

یہ درحقیقت اس آیت قرآنی کی توضیح ہے جس میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ۔

وَشَاءُرُهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ

ترجمہ:- ”اور ان سے معاطلے میں مشورہ کرو، اور جب کوئی عزم کرو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔“

### (۳) اقامت دین کے لئے

سیاسی جدوجہد کا شرعی مقام اور اس کی حدود

تیرا موضوع جس پر اس مقالے میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے ارشادات پیش کرنے مقصود ہیں، یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ایک صحیح اسلامی حکومت کے قیام اور غیر اسلامی طاقتلوں کے شر سے دفاع کے لئے جدوجہد کریں؟ اگر ضروری ہے تو اس جدوجہد کی حدود کیا ہوئی چاہئے؟ اس موضوع پر حضرت قدس سرہ نے ایک مستقل رسالہ ”الروضہ الناصرۃ فی المسائل العاشرۃ“ کے نام سے تحریر فرمایا ہے جس میں اصولی طور پر سیاسی جدوجہد کی شرعی حیثیت کو بھی واضح فرمایا ہے، اور اپنے زمانے کے سیاسی حالات کے بارے میں اپنی رائے بھی ظاہر فرمائی ہے۔ یہ رسالہ مختصر مگر بہت پرمغزا و رجامع ہے۔ لیکن چونکہ اہل علم کے لئے لکھا گیا ہے، اس لئے اس میں علمی اور اصطلاحی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

”مَدَافِعَتْ كَفَارَ كِي مطلقاً اہل اسلام سے، اور خصوص سلطنت اسلامیہ سے جس میں خلافت وغیر خلافت، اور جس میں سلطنت اسلامیہ واقعیہ و سلطنت اسلامیہ مزعومہ کفار سب

داخل ہیں، پھر خصوص شعائر اسلام سے جن میں مقامات مقدسہ، بالخصوص حریمین شریفین بھی داخل ہیں، سب مسلمانوں پر فرض ہے، کبھی علی الاعین، کبھی علی الکفایہ علی اختلاف الاحوال، مگر اس کی فرضیت کے کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں، مجملہ ان کے ایک شرط استطاعت بھی ہے، اور استطاعت سے مراد استطاعت لغوی نہیں، استطاعت شرعیہ ہے جس کو اس حدیث نے صاف کر دیا ہے۔

”عن ابی سعید الخدری عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال  
من رای منکم منکرو افليغیرہ بیده فان لم یستطع فبلسانه “  
(الحدیث رواہ مسلم، مشکوہ باب الامر بالمعروف)

ظاہر ہے کہ استطاعت بالسان ہر وقت حاصل ہے، پھر اس کے انتقاء کی تقدیر کب متحقق ہوگی؟ اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اس میں ایسا خطرہ نہ ہو جس کی مقاومت بظن غالب عادتنا ممکن ہو۔ اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں بیتلانہ ہو جائیں، مثلاً کفار کی جگہ کفار ہی مسلط ہوں یا مرکب کافر مسلم سے کہ مجموعہ تابع اخس کے ہوتا ہے، کیونکہ اس صورت میں غایت ہی مفقود ہے، اور وہ اخلاق اے الارض من الفساد ہے، اور قاعدہ ہے ..... الشی اذا اخلا عن الغایہ انتفی۔

اور اگر ایسا خطرہ ہو تو پھر و جوب تو ساقط ہو جائے گا، باقی جواز، اس میں تفصیل ہے، بعض صورتوں میں جواز بھی نہیں، بعض میں جواز بلکہ استحباب بھی ہے۔ اور مدار بناء جواز و عدم جواز یا استحباب کا اجتہاد اور رائے پر ہے۔ پس اس میں دو اختلاف کی گنجائش ہے۔ ایک علمی کہ واقعات سے ایک شخص کے نزدیک عدم جواز کی بناء متحقق ہے اور دوسرے کے نزدیک جواز یا استحباب کی، دوسرًا عملی کہ باوجود بناء جواز یا استحباب پر متفق ہونے کے ایک نے بناء پر عدم و جوب رخصت پر عمل کیا، دوسرے نے بناء پر استحباب عزیمت پر عمل کیا۔ ایک کو دوسرے پر ملامت کرنے کا حق نہیں۔ اور اگر کسی مقام پر تسلط مسلمان ہی کا ہو، مگر وہ مسلمان کافر سے مسلم رکھتا ہو تو اس کو تسلط کافر کہنا محل تامل ہے۔“ (آفادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۱۰)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر استطاعت ہو اور کسی بڑے مفسدے کا اندیشہ نہ ہو تو یہ جدوجہد

واجب ہے، کبھی علی لعین اور کبھی علی الکفایہ، لیکن اگر کسی بڑے مفسدے کا اندیشہ ہو یا استطاعت نہ ہو تو واجب نہیں، لیکن مختلف حالات میں جائز یا مستحب ہو سکتی ہے، اور اس کے تعین میں اہل علم کی آراء بھی مختلف ہو سکتی ہے، اور یہ اختلاف آراء اگر اخلاص کے ساتھ ہوتا نہ مموم ہے نہ اس میں کسی کو دوسرا پر ملامت کرنے کا حق ہے۔

لیکن چونکہ دین کا مقصود اصلی سیاست نہیں، بلکہ دیانت اور ان کے ذریعے رضائے حق کا حصول ہے جیسا کہ مقالے کے آغاز میں حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ہی کے الفاظ میں اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔ اس لئے ہر قسم کی سیاسی جدوجہد شرعی احکام کے دائرے میں رہ کر ہونی چاہئے۔ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے دین کے کسی معمولی سے معمولی حکم یا تقاضے کو بھی قربان کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب جدوجہد کرنے والا پورے اخلاص اور للہیت کے ساتھ صرف دین حق کی سر بلندی اور باری تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی نیت سے جدوجہد کر رہا ہو اور محض جاہ و جلال کا حصول اس کا مطیع نظر نہ ہو، اور وہ شدید نفسانی تقاضوں کے باوجود اپنے آپ کو شریعت کے تابع رکھنے پر قادر ہو، ورنہ سیاست ایسا خارزار ہے جس میں قدم قدم پر نام و نمود اور جاہ و جلال کے فتنے پیدا ہوتے ہیں، نفس و شیطان کی تاویلات انسان پر یلغار کرتی ہیں، اور بسا اوقات وہ ان تمام حرکات سے مغلوب ہو کر اسی راستے پر چل پڑتا ہے جس پر دنیا جاری ہے، اور رفتہ رفتہ اس کی سیاست اسلامی سیاست کے بجائے لا دینی سیاست ہو کر رہ جاتی ہے۔

### سیاسی جدوجہد اور تزکیہ اخلاق

لہذا اس جدوجہد کی شرط اول یہ ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق کا تزکیہ ہو چکا ہو۔ وراس کے جذبات و خیالات اعتدال کے ساتھ میں ڈھل چکے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تھیس سالہ عہد نبوت میں ابتدائی تیرہ سال اس طرح گزرے ہیں کہ نہ ان میں کوئی جہاد ہے نہ حکومت و ریاست ہے، نہ کسی قسم کی سیاسی جدوجہد ہے کوئی اگر مارتا اور اذیتیں دیتا ہے تو اس کے جواب میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں

اور اس کے بجائے مسلسل صبر کی تعلیم و تلقین کی جا رہی ہے۔ یہ تیرہ سال تعلیم و تربیت اور ترقی کیہ اخلاق کے سال ہیں، مجاہدات نفس کی اسی بھٹی سے گزرنے کے بعد جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق و اعمال صیقل ہو چکے تو اس کے بعد مدنی زندگی میں حکومت و سیاست اور جہاد و قتال کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”دیکھئے اس کی تائید میں ایک بار نکتہ بتلاتا ہوں وہ یہ کہ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے قتال کی اجازت نہیں ہوئی، مدینہ میں پہنچ کر اجازت ہوئی اس کی کیا وجہ ہے، ظاہر میں یہ سمجھتے ہیں کہ قلت جماعت و قلت اسباب اس کا سبب تھا، یہ خلاف تحقیق ہے، کیونکہ مدینہ ہی میں پہنچ کر کیا جماعت بڑھ گئی تھی؟ کفار کا پھر بھی غلبہ تھا۔ مدینہ کی تمام جماعت تمام عرب کے مقابلے میں کیا چیز تھی؟ بلکہ اگر یہ دیکھا جائے کہ تمام کفار عالم کے مقابلے میں یہ اجازت ہوئی تھی، تب تو مدینہ کیا سارا عرب بھی قلیل تھا اسی طرح مدینہ پہنچ کر سامان میں کیا زیادتی ہو گئی تھی؟..... نصوص سے خود معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کفار کے مقابلے میں اکثر مواقع میں اس قدر کم ہوتی تھی کہ ملائکہ کا جوڑ لگایا جاتا تھا..... اور یہ صورت ملائکہ کی مکہ میں رہتے ہوئے بھی ممکن تھی مگر پھر بھی اس صورت کو اختیار کر کے وہاں اجازت نہ دی گئی تو اس کی کوئی اور وجہ بتانی چاہئے۔ اہل ظاہر اس کی شافی وجہ نہیں بتا سکتے۔ محققین نے فرمایا ہے کہ اصل بات یہ تھی کہ مکہ میں عام مسلمانوں کے اندر اخلاق حمیدہ، اخلاص و صبر و تقویٰ کا مل طور پر راجح نہ ہوئے تھے اس وقت اگر اجازت قتال کی ہو جاتی تو سارا مقابلہ جوش و غضب اور انتقالِ نفس کے لئے ہوتا، محض اخلاق اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے نہ ہوتا، اور اس حالت میں وہ اس قابل نہ ہوتے کہ ملائکہ کی جماعت سے ان کی امداد کی جاوے۔ اور حمایت الہی ان کے شامل حال ہو۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں (بَلَى إِن تَصْبِرُوْفَا وَتَتَّقُوْا) کی شرط بتلا رہی ہے کہ حمایت الہی اسی وقت متوجہ ہوتی ہے جب کہ مسلمان صبر و تقویٰ میں راجح ہوں۔ اور تقویٰ کے معنی ہیں: احتراز عما نہی اللہ عنہ، امتحان ما امر به جس میں اخلاص اور احتراز عن الریاء و عن شایبۃ النفس بھی داخل ہے) اور مدینہ میں پہنچ کر یہ

اخلاق راخ ہو گئے تھے۔ مہاجرین کو مکہ میں رہنے کی حالت میں کفار کی ایذا پر صبر کرنے سے نفس کی مقاومت ہل ہو گئی نیز قوت غصب نفسی ضعیف بلکہ زائل ہو گئی تھی۔

پھر بھرت کے وقت جب انہوں نے اپنے وطن، اہل دعیا اور مال دو دوست سب پر خال ڈال دی تو ان کی محبت الہی کامل ہو گئی، اور محبت دنیا ان کے قلب سے نکل گئی۔ انصار مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے ان کے قلوب بھی محبت الہی سے لبریزا اور محبت دنیا سے پاک ہو گئے تھے چنانچہ انصار نے خوش خوش ان حضرات کو اپنے مکانات و اموال میں شریک کرنا چاہا۔

غرض واقعہ بھرت سے مہاجرین و انصار دونوں کا امتحان ہو گیا جس میں وہ کامل اترے۔ اس کے بعد ان کو اجازت قیال دی گئی کہ اب جو کچھ کریں گے محض خدا کے لئے کریں گے۔ جوش غصب اور خواہش انتقام اور شفاء غیظ نفس کے لئے کچھ نہ کریں گے اس وقت یہ اس قابل ہوں گے کہ جمایت الہی ان کا ساتھ دے اور ملائکہ رحمت ان کی مدد کریں۔ چنانچہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے تھے خدا کے لئے کرتے تھے، حتیٰ کہ مثنوی میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک یہودی کو معرکہ قیال میں پچھاڑا اور ذبح کا ارادہ کیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس کم بخت نے آپ کے چہرہ مبارک پر تھوکا۔ اب چاہئے تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو فوراً ہی ذبح کر دلتے مگر تھوکنے کے بعد فوراً اس کے سینے پر سے کھڑے ہو گئے۔ اور فوراً اسے چھوڑ دیا۔ وہ یہودی بڑا متعجب ہوا..... اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی وجہ پوچھی کہ اگر آپ نے مجھ کو کافر سمجھ کر قتل کرنا چاہا تو تھوکنے پر کیوں رہا کر دیا؟..... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ..... بات یہ ہے کہ اول جب میں نے تجھ پر حملہ کیا تو اس وقت بجز رضائے حق کے مجھے کچھ مطلوب نہ تھا۔ اور جب تو نے مجھ پر تھوکا تو مجھے غصہ اور جوش انتقام پیدا ہوا میں نے دیکھا کہ اب میرا تجھے قتل کرنا محض خدا کے لئے نہ ہو گا بلکہ اس میں نفس کی بھی آمیزش ہو گی۔ اور میں نے چاہا کہ نفس کے لئے کام کر کے اپنے عمل کو ضائع کروں، اس لئے تجھے رہا کر دیا۔ وہ یہودی فوراً مسلمان ہو گیا اور سمجھ گیا کہ واقعی یہی مذہب

حق ہے جس میں شرک سے اس درجہ نفرت دلائی گئی ہے کہ کوئی کام نفس کے لئے نہ کرو بلکہ محض خدا کے لئے ہر کام کرو۔ دوستی اور دشمنی میں بھی نفس کی آمیزش سے روکا گیا ہے۔

اب ہماری یہ حالت ہے کہ جو لوگ خدمت اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو نفس کے واسطے کام کرتے۔ اپنے ذرا ذرا سے کارناموں کو اچھاتے اور اخباروں میں شائع کرتے ہیں۔ احکام الہی کی پرواہ نہیں کرتے، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ کام ہونا چاہئے خواہ شریعت کے موافق ہو یا مخالف، چندہ میں جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں، صرف میں حلال و حرام کا خیال نہیں، پھر حمایت الہی ان کے ساتھ کیوں کر ہو؟ بلکہ اب تو یہ کہا جاتا ہے کہ میاں مسئلے مسائل کو ابھی رہنے دو اس وقت تو کام کرنا چاہئے۔ بعد کو مسئلے مسائل دیکھے جائیں گے۔ (إِنَّا لِلّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَجُعُونَ) ان صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ مسئلے مسائل کے بغیر تو مسلمان کونہ دنیوی فلاح ہو سکتی ہے، نہ اخروی، اور سب سے زیادہ اخلاص نیت کی ضرورت ہے، جس کا یہاں صفر ہے۔ (دعا محسن اسلام در جمود "محسن اسلام" ص ۲۸۰ مطبوعہ ممتاز)

یہ بات مشہور ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ ہندوستان کی سیاسی تحریکات سے الگ رہے، اس دوران ایک صاحب نے یہ پیش کش کی کہ ہم آپ کو امیر المؤمنین بناتے ہیں۔ آپ ہماری قیادت فرمائیے حضرت نے اس پیشکش کا مناسب جواب دینے کے بعد فرمایا۔

”سب سے پہلے جو امیر المؤمنین ہو کر حکم دوں گا وہ یہ ہو گا کہ دس برس تک سب تحریک اور شور و گل بند۔ ان دس سالوں میں مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔ جب یہ قابلِ اطمینان ہو جائیں گے تو مناسب حکم دوں گا۔“ (الافتراضات الیومیہ ص ۶۷۷ ج ۲ مخطوطات ۸۹ لقب بدیر الفلاح)

اگر ہم حقیقت پسندی سے اپنے حالات کا جائزہ لیں تو محسوس ہو گا کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس اقتباس میں ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے، اگر آج ہماری سیاست کی بیل منڈھنے نہیں چڑھتی تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم کی زندگی کے تیرہ سال کی چھلانگ لگا کر پہلے ہی دن سے مدنی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اخلاقی اور روحانی اعتبار سے تیار کئے بغیر اصلاح قوم کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ جھنڈا اس طرح پکڑا جاتا ہے؟ نہ ہمیں یہ پتہ ہے کہ اسے سر بلند

رکھنے کا طریقہ کیا ہے؟ نہ ہم نے اس کام کی کوئی تربیت حاصل کی ہے، بس ہم نے کچھ دوسری قوموں کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے جھنڈا اٹھائے دیکھا تو انہی کی نقلی ہم نے بھی شروع کر دی نتیجہ یہ ہے کہ ہماری سیاسی جدوجہد کا طرز و انداز، ہماری کوششوں کا طریقہ کار، ہماری اختیار کی ہوئی تدبیریں، تقریباً سب کی سب وہ ہیں جو ہم نے دوسری قوموں سے مستعار لی ہیں، اور ان کو شریعت کی کوئی پر صحیح طریقے سے پر کھے بغیر اس غلط فہمی میں بتلا ہیں کہ جب ان طریقوں سے لادینی سیاست کا میاپ ہو سکتی ہے تو اسلامی سیاست بھی کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔ حالانکہ اسلامی سیاست کو لادینی سیاست پر قیاس کرنا بھجور کے درخت کو کنویں پر قیاس کرنے کے متادف ہے۔

## سیاسی تدبیر

حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اپنی تصانیف اور مowaظ و مفروظات میں جا بجا اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلامی سیاست میں صرف مقصد کا نیک اور شریعت کے موافق ہونا کافی نہیں، بلکہ اس کے طریقہ کار اور اس کی تدبیروں کا بھی شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے، اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ شریعت کے احکام پس پشت ڈال کر اور ان کی خلاف ورزی کر کے اسلامی حکومت قائم کرے گا تو وہ ایسی خام خیالی میں بتلا ہے جس کا نتیجہ محرومی کے ہوا کچھ نہیں۔ اگر اس طرح کوئی حکومت اس نے قائم کر بھی لی تو وہ اسلامی حکومت نہیں، بلکہ اسلامی حکومت کا دھوکہ ہو گا۔

جیسا کہ مقالے کے آغاز میں حضرت حکیم الامت کا ارشاد ناقابل انکار دلائل کے ساتھ گزر چکا ہے۔ اسلام میں سیاست و حکومت بذات خود مقصود نہیں، بلکہ اصل شریعت کا اتباع اور اس کے نتیجے میں رضائے حق کا حصول ہے، اس لئے یہ طرز فکر اسلام کے دائرے میں نہیں کھپ سکتا کہ اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد میں اسلام کے بعض احکام کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے جزوی شرعی احکام کی قربانی دی جاسکتی ہے۔ اس کے بجائے مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ شرعی احکام کے دائرے میں رہ کر جدوجہد کرے، اور ہر اس طریقے سے اپنا دامن بچائے جس سے کسی شرعی حکم کی خلاف

ورزی ہوتی ہو۔ مسلمان کی کامیابی کا راز اتباع شریعت میں ہے اسی پر نصرت الہی کا وعدہ ہے لہذا کامیابی انشاء اللہ اسی طریقے سے ہوگی۔ اور اگر بالفرض کسی شرعی حکم کی پابندی کی وجہ سے ظاہراً کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکے تو بھی مسلمان اس سے زیادہ کامکلف نہیں اس ناکامی کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اور نہ اس سے آخرت میں اس ناکامی پر باز پرس ہوگی۔ اگر وہ شریعت کے فرمان پر چل رہا ہے تو وہ پوری طرح کامیاب اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر کا مستحق ہے اور اس کی زندگی کا اصل مقصد پوری طرح حاصل ہے۔ لہذا سیاسی جدوجہد کے دوران ہر تدبیر اور ہر اقدام کے بارے میں یہ اطمینان کر لینا ضروری ہے کہ وہ شرعی نقطہ نظر سے جائز ہے یا ناجائز ہے؟ کسی تدبیر کو اختیار کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ اس تدبیر کا موجودہ سیاست کی دنیا میں رواج عام ہے یا وہ سیاسی تحریکوں میں بہت موثر ثابت ہوئی ہے، اور اسے آج کی سیاست میں ناگزیر سمجھا جاتا ہے اگر وہ اصول شرعیہ کے اعتبار سے جائز نہ ہو، یا شرعی مفاسد پر مشتمل ہو تو خواہ موجودہ سیاست کے علمبردار اسے کتنا ضروری کیوں نہ سمجھتے ہوں، اسے ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ سیاست مقصود نہیں، شریعت کی اطاعت مقصود ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حالات میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک باز صحابہ نے موثر تدبیریں صرف اس لئے چھوڑ دیں کہ وہ شریعت کے خلاف تھیں۔

غزوہ بدر کے موقع پر جب حق و باطل کا پہلا فیصلہ کن معرکہ درپیش تھا۔ اور تین سو تیرہ بے سرو سامان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اتنی بڑی طاقت سے مگر لینے جا رہے تھے تو ایک ایک شخص کی بڑی قدر و قیمت تھی، اور قدرتی طور پر نفری میں تھوڑا سا بھی اضافہ کامیابی میں موثر ہو سکتا تھا، اس موقع پر حضرت حذیفہ ابن یمیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جاں نثار صحابی اور ان کے والد نے لشکر میں شامل ہونا چاہا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس بناء پر جہاد میں شامل ہونے سے روک دیا کہ آتے وقت انہیں کفار نے گرفتار کر لیا تھا اور اس وعدے پر چھوڑا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہیں کریں گے۔ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے انہیں جہاد کی شرکت سے روکتے ہوئے فرمایا۔

نفی بعهد و نستعین اللہ تعالیٰ علیہم

ترجمہ:- ”ہم ان سے کے ہوئے وعدے کو پورا کریں گے اور ان کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد ناگزیں گے۔“ (صحیح مسلم و بخاری ص ۱۰۲، ج ۲، سیر اعلام المجلات ص ۳۶۳ و ۳۶۲، ج ۲، والا صاپ ص ۲۲۳، ج ۲)

اسی غزوہ میں ایک نہایت تجربہ کار مشرک شخص نے جو اپنی بہادری اور جنگجوی میں مشہور تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لڑائی میں شامل ہونا چاہا لیکن یہ حق و باطل کا پہلا معرکہ تھا اور اس پہلے معرکے میں کسی کافر کی مدد لینا اسلام کو گوارانہ تھا۔ چنانچہ اس وقت حکم یہی تھا کہ کافروں سے مدد نہ لی جائے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی لڑائی میں شامل کرنے سے انکار فرمادیا اور ارشاد فرمایا۔

ارجع ، فلن استعین بمشرک

ترجمہ:- ”میں کسی مشرک سے ہرگز مدد نہ لوں گا۔“ (جامع ترمذی، کتاب اسری باب فی الی اللہ عزیز مدد نہ لے ایں راشدین رضی اللہ عنہم کا مقام تو بہت بلند ہے۔ بعد کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اسی اصول پر ہمیشہ کار بند رہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رومیوں سے جنگ بندی کا معاہدہ تھا اس کی مدت ختم ہونے سے پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں اور مدت کے ختم ہوتے ہی حملہ کر دیا، رومی لوگ بے خبری میں تھے اس لئے پسپا ہونے شروع ہو گئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فاتحانہ آگے بڑھتے رہے اتنے میں حضرت عمر بن عبّہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیچھے سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے آئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روک کر انہیں ایک حدیث سنائی جس کی رو سے یہ حملہ شرعاً ناجائز تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ حملہ چونکہ جنگ بندی ختم ہونے کے بعد ہوا ہے اس لئے یہ عہد شکنی میں داخل نہیں ہے۔ لیکن حدیث سننے ہی کوئی تاویل کرنے کے بجائے اپنے پورے لشکر کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔ (جامع ترمذی، ابواب اسری باب ماجاء فی الغدر)

جو سالا را لشکر اپنی کامیاب تدبیر کے بعد فتح کے نشے میں آگے بڑھ رہا ہو، اس کے لئے اپنی یلغار روکنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ مفتوحہ علاقہ بھی واپس کر دے۔ لیکن مقصد

چونکہ سیاست و حکومت نہیں، اطاعت شریعت تھا۔ اس لئے تدبیر کے ناجائز ہونے کا علم ہوتے ہی اس ساری تدبیر سے مستبردار ہو گئے۔

غرض ہماری تاریخ ایسی درخشاں مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں مسلمانوں نے موثر تدبیر کے لئے بھی شریعت کی ادنیٰ خلاف ورزی گوارانہیں کی بلکہ اسے ترک کر دیا۔ لہذا اسلامی سیاست میں جدوجہد کی تدبیروں کو شرعاً جائز ہونا ضروری ہے لیکن آج کل عموماً سیاسی جدوجہد کے دوران یہ پہلو نظروں سے بالکل اجھل ہو جاتا ہے، جو تدبیریں لادینی سیاست کے علمبردار اختیار کئے ہوئے ہیں اور جن کا رواج عام ہو چکا ہے انہیں یہ دیکھے بغیر اختیار کر لیا جاتا ہے کہ تدبیریں اپنے لوازم کے ساتھ جائز بھی ہیں یا نہیں؟ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے سیاسی جدوجہد کے کئی مر وجہ طریقوں پر شرعی نقطہ نظر سے بحث فرمائی ہے اور ان کے شرعی حکم کو واضح فرمایا ہے۔

### بائیکاٹ اور ہڑتاں کا شرعی حکم

مثلاً حکومت سے مطالبات منوانے کے لئے آج کل ہڑتاں کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اگر بات صرف اس حد تک ہوتی کہ لوگ اپنی خوشی سے احتجاج کاروبار بند کر دیں تو دوسرے مفاسد کی عدم موجودگی میں اسے ایک مباح تدبیر کہا جا سکتا تھا، چنانچہ حضرت فرماتے ہیں۔

”بائیکاٹ یا نان کو آپریشن یہ شرعاً افراد جہاد میں سے نہیں، دلائل میں ملاحظہ کی جائے، بلکہ مستقل تدبیر مقاومت کی ہیں جو فی نفس مباح ہیں۔“

(الرودۃۃ، الناصرۃ، افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۱۰)

لیکن ایسی ہڑتاں جو لوگوں نے کیتیا اپنی خوشی سے کی ہو آج عملہ دنیا میں اس کا وجود نہیں ہے، اکثر و بیشتر تو لوگوں کو ان کی خواہش اور رائے کے برخلاف ہڑتاں میں حصہ لینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی حصہ نہ لے تو اس کو جسمانی اور مالی اذیتیں دی جاتی ہیں، سنگ باری اور آتشزدگی تو ہڑتاں کا ایک لازمی حصہ بن گئے ہیں، سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر کے لوگوں کے لئے اپنی ضرورت سے چلنا پھرنا مسدود کر دیا جاتا ہے، چلتی ہوئی گاڑیوں پر پھراو ہوتا ہے، بہت سے لوگ اسی قسم کی ایذاء رسائیوں کے خوف سے اپنا کاروبار بند رکھتے ہیں اور جو

ضرورت مند شخص باہر نکلنے پر کسی وجہ سے مجبور ہو دہ ہر وقت جانی و مالی نقصان کے خطرے میں رہتا ہے اور بسا اوقات کوئی نہ کوئی بے گناہ مارا جاتا ہے، بعض مرتبہ ملیٹ علاج کو ترس ترس کر رخصت ہو جاتے ہیں اور بہت سے غریب لوگ فاقہ کشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام باتیں ہر تال کا ایسا لازمی حصہ بن کر رہ گئی ہیں کہ ان کے بغیر کسی "کامیاب ہر تال" کا تصور نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں شرعاً حرام و ناجائز ہیں اور جو چیز ان حرام و ناجائز باتوں کا لازمی سبب بنے وہ کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

لہذا حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے ہر تال کے مروجہ طریقوں کو شرعاً ناجائز ہیں قرار دیا ہے، تحریکات خلافت کے زمانے میں "ترک موالات" کے جو طریقے اختیار کے گئے تھے ان میں ہر تال بھی داخل تھی، ترک موالات کے تحت یہ تحریک چالائی گئی تھی کہ برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جائے، چنانچہ اہل تحریک نے ایسی دکانوں پر جو برطانوی مصنوعات فروخت کرتی تھیں رضا کار مقرر کر دیئے تھے، جو لوگوں کو جس طرح ممکن ہو وہاں سے خریداری کرنے سے روکتے تھے، اگر خرید پچے ہوں تو ان کو واپسی پر مجبور کرتے تھے، نیز دکانداروں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ ایسی اشیاء اپنی دکانوں میں نہ رکھیں، اگر وہ نہ مانیں تو ان کو نقصان پہنچاتے تھے خواہ اس دکاندار کے پاس کوئی اور ذریعہ معاش نہ ہو، اور اس تجارت کو بند کرنے سے اس کے اہل و عیال پر فاقوں کی نوبت آ جائے حضرت ان طریقوں کا شرعی حکم بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ واقعہ بھی متعدد گناہوں پر مشتمل ہے، ایک مباح فعل کے ترک پر مجبور کرنا بجز بعض خاص تجارتوں کے سبب اشیاء کی خرید و فروخت کا معاملہ اہل حرب تک کے ساتھ بھی جائز ہے چہ جائیکہ معاهدین کے ساتھ..... دوسرے بعد اتمام بیع کے واپسی پر مجبور کرنا اور زیادہ گناہ ہے کیونکہ بدول قانون خیار کے یہ واپسی بھی شرعاً مثال بیع کے ہے جس میں تراضی متعاقدین شرط ہے، تیرے نہ ماننے والوں کو ایذا دینا جو ظلم ہے، چوتھے اہل و عیال کو تکلیف پہنچانا کہ یہ بھی ظلم ہے، پانچویں اگر اس کو واجب شرعی بتایا جاوے تو شریعت کی تغیر و تحریف ہونا....."

اس کے بعد حضرت ہر تال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”اس میں بھی وہی خرابیاں ہیں جو نمبر ۳ میں مذکور ہوئیں اور اگر ان احتجاجات مذکور میں شرکت نہ کرنے پر ایذا جسمانی کی بھی نوبت آ جاوے تو یہ گناہ ہونے میں اضرار مالی سے بھی اشد اور منافی اقتضاۓ اسلام ہے..... پھر ان مقاطعات پر مجبور کرنے میں یہ جا برین خودا پنے تسلیم کردہ قانون حریت کے بھی خلاف کر رہے ہیں ورنہ کیا وجہ کہ اپنی آزادی کی تو کوشش کریں اور دوسروں کی آزادی کو سلب کریں۔“ (معاملہ مسلمین، افادات اشریف ص ۲۷، ۲۸)

اس کے علاوہ حضرت نے ہر تالہ کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ "تلپین العرائک" کے نام سے لکھا ہے جس کا اصل موضوع تو تعلیمی اداروں میں طلبہ کی ہر تالہ ہے لیکن اس میں مطلق ہر تال کے بارے میں بھی اصولی بحثیں آگئی ہیں، اس رسالے کا حاصل بھی یہی ہے کہ ہر تال کا مردجہ طریق کا رشیریت کے خلاف اور ناجائز ہے۔ (ملاحظہ: واحد الفتاویٰ ص ۲۰ ج ۲)

## بھوک ہڑتاں

اسی طرح مطالبات منوانے کے لئے ایک طریقہ بھوک ہڑتاں کا بھی اختیار کیا جاتا ہے اس کے بارے میں حضرت سے سوال کیا گیا تھا کہ ”اگر کوئی گرفتار ہو جائے ان میں سے بعضے لوگ جیل جانے میں مقاطعہ جوئی کرتے ہیں یہاں تک کہ مر جاتے ہیں اور قوم میں ان کی مدح کی جاتی ہے۔“ حضرت نے اس کا شرعی حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

”اس کا خودکشی اور حرام ہونا ظاہر ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ وَفِي  
الهدایہ کتاب الا کراہ فیا تم کما فی حالہ المخصصہ و فی العناية فامتناعه عن التاول  
کا متناعہ من تناول الطعام الحلال حتی تلفت نفسه او عضوہ فگان آئما اخ-

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جان بچانا اس درجہ فرض ہے کہ اگر حالت اضطرار میں اندیشہ مرجانے کا ہو، اور مردار کھانے سے جان بچ سکتی ہو کہ اس کا نہ کھانا اور جان دے دینا معصیت ہے، چہ جائیکہ طعام حلال کا ترک اور اس فعل کی مدح کرنے میں تو اندیشہ کفر ہے۔ کہ صریح تکذیب ہے شریعت کی کہ شریعت جس فعل کو نہ موم کہتی ہو، یہ اس کو ممود کہتا ہے۔“ (افادات اشرفی در مسائل سیارہ ص ۲۸، ۲۹، نمبر ۲)

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

”یہ (بھوک ہر تال) خود کشی کے مترادف ہے اگر موت واقع ہو جائے گی تو وہ موت حرام ہو گی۔“ (الافتراضات الیومیہ ۳۰ ج ۳ ملفوظ نمبر ۱۲)

## پبلیٹی کے مروجہ ذرائع

آج کی سیاست میں پبلیٹی اور پروپیگنڈہ کو بھی نہایت اہم مقام حاصل ہے، اور اس سلسلے میں عموماً مغربی سیاست کے ایک مشہور نمائندے گوبنڈز کے اس مقولے پر عمل کیا جاتا ہے کہ ”جھوٹ اتنی شدت سے بولو کہ دنیا اسے بچ جان لے۔“

آج کل کی حکومتیں ہوں، یا لادینی سیاسی جماعتیں وہ تو اس اصول پر عمل کرتی ہیں، لیکن بسا اوقات اسلام کے لئے سیاسی جدوجہد کرنے والے حضرات بھی اس چھائے ہوئے ماحول سے متاثر ہو کر پبلیٹی اور پروپیگنڈے کے مروجہ ذرائع استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور ان کے جائز و ناجائز ہونے کی طرف یا تو دھیان نہیں جاتا یا پھر وہی نظریہ کا فرمایا ہوتا ہے کہ سیاست کی اصلاح ایک بلند مقصد ہے، اور اس کے حصول کے لئے چھوٹے چھوٹے امور کی قربانی دی جاسکتی ہے۔ غلط بیانی تو حرام ہے، ہی لیکن سیاسی مخالفین کی بلا وجہ غیبت، ان کے خلاف ناجائز بدگوئی، ان پر بہتان و افتراء اور تحقیق کے بغیر انواعیں پھیلانا، یا ان پر تحقیق کے بغیر یقین کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو ہماری سیاسی تحریکات میں شعوری یا غیر شعوری طور پر داخل ہو گئی ہیں، اور ان کی وجہ سے افتراق و انتشار، پارٹی بندیوں اور فتنہ و فساد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اپنی تصانیف اور موعظ و ملفوظات میں اس طریق کار پر بھی تنقید فرمائی ہے، اور ایسی سیاسی مددیروں کو ناجائز اور واجب الترک قرار دیا ہے جو ان مفاسد پر مشتمل ہوں۔

اسی طرح جلسے جلوس بھی پبلیٹی اور اپنے نقطہ نظر کو عوام تک پہنچانے کا اہم ذریعہ سمجھے جاتے ہیں لیکن ان میں بھی بعض اوقات احکام شرعیہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس کے بارے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

”جب کوئی تدبیر تدبیر منصوصہ کے خلاف اختیار کی جاوے گی اس کو تو منوع ہی کہا جاوے گا۔ خصوص جبکہ وہ فعل عبث یا مضر بھی ہو تو اس کی حرمت میں پھر کیا شہہ ہو سکتا ہے؟ وہاں تو الضرورات تبیح المحظورات کا شہہ بھی نہیں ہو سکتا مثلاً ہڑتال میں جلوس ہیں ان میں وقت کا ضائع ہونا، روپیہ کا صرف ہونا، حاجت مندوں کو تکلیف ہونا، نمازوں کا ضائع ہونا کھلے مفاسد ہیں تو یہ افعال کیسے جائز ہو سکتے ہیں؟ (ایک صاحب نے عرض کیا کہ اگر نیت امداد حق کی ہو؟ تو فرمایا کہ) ان باتوں سے حق کو کوئی امداد نہیں پہنچتی، دوسرے نامشروع فعل نیت سے شروع نہیں ہو جاتا۔“ (الافتراضات الیومیہ ص ۱۳۲ ج ۵ ملفوظ نمبر ۱۵۲)

مردجہ سیاسی تدبیر کے بارے میں ایک اور موقع پر آپ نے اپنا نقطہ نظر واضح فرمایا ہے، آپ سے پوچھا گیا تھا کہ ”جتنے (حکومت کے) مقابلے کے لئے جاتے ہیں اور گرفتار ہوتے ہیں، خاموش مقابلہ کرتے ہیں، اگر حکومت کی طرف سے تشدد بھی ہوتا بھی جواب نہیں دیا جاتا۔ ان صورتوں کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔“ عقلی دوہی احتمال ہیں، یا تو مقابلے کی قوت ہے یا قوت نہیں، اگر قوت ہے تو گرفتار ہونے کے کیا معنی؟ مقابلہ کرنا چاہئے، اور جب مقابلہ نہیں کر سکتے تو یہ صورت عدم قوت کی ہے جیسا کہ ظاہر ہے تو عدم قوت کی حالت میں قصد ایسی صورت اختیار کرنے کی خود ضرب و جس میں بتلا ہو شریعت اجازت نہیں دیتی بلکہ ایسے مخترع مقابلے کے مکارہ (نا گوار امور) پر صبر پر سے کام لینا چاہئے۔ خلاصہ یہ کہ اگر قوت ہے مقابلہ کرو، اگر قوت نہیں صبر کو ان دو صورتوں کے علاوہ تیسرا صورت منقول نہیں۔“ آگے ارشاد فرماتے ہیں۔

”اس وقت سب سے بڑی وجہ ناکامی کی یہی ہوئی کہ مسلمانوں کے سر پر کوئی بڑا نہیں، نہ مسلمانوں کی قوت کسی مرکز پر جمع ہے اور نہ ہو سکتی ہے جب تک کہ بالاتفاق ایک کو بڑا نہ بنالیں۔ اگر امام ہو تو سب کام ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ اس کے حکم سے میدان میں جاویں، اگر جان بھی جاتی رہے تو کوئی حرج نہیں، اور یہ کیا کہ بیٹھے بیٹھے جا کر قتل ہو جاویں، یہ کوئی انسانیت ہے؟ اصل بات وہی ہے جو اور پر مذکور ہوئی کہ خیر القریون میں دوہی صورتیں تھیں کہ قوت کے

وقت مقابلہ، اور عدم قوت کے وقت صبر، اس کے سواب میں گھر تدا بیر ہیں۔ اس لئے ان میں خیر و برکت نہیں ہو سکتی، اور جب خیر و برکت نہ ہو اور مسلمان ظاہراً کامیاب بھی ہو جائیں تو اس کا میابی پر کیا خوشی جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف تدا بیر اختیار کر کے کامیابی حاصل کی جاوے اور ایسی کامیابی کا ہو جانا تو کوئی کمال کی بات نہیں، اس لئے کہ ایسی کامیابی کافروں کو بھی ہو جاتی ہے۔ اور مسلمانوں کی اصل کامیابی تودہ ہے کہ چاہے غالی ہو، مگر خدا راضی ہو، اور اگر حکومت ہوئی اور ان کی مرضی کے خلاف ہوئی، وہ راضی نہ ہوئے تو فرعون کی حکومت اور تمہاری حکومت میں کیا فرق ہوا؟ بس ان کے راضی کرنے کی فکر کرو، ان سے صحیح معنوں میں تعلق کو جوڑو، اسلام اور احکام اسلام کی پابندی کرو، ان بتوں کا اتباع تو بہت دن کر کے دیکھ لیا۔ اب خدا کے سامنے سر رکھ کر اور اس سے اپنی حاجت اور ضروریات کو مانگ کر بھی دیکھ لو کہ کیا ہوتا ہے؟“ (الافتضات الیومیہ میں ۱۹۸ ج ۵ محفوظ نمبر ۱۹۰)

## حکومت کے ساتھ طرز عمل

اسلام نے اپنے احکام میں اصل زور اس بات پر دیا ہے کہ ہر حالت میں احکام شریعت کی اتباع کی جائے، اگر حاکم وقت کی طرف سے خلاف شرع امور کا حکم دیا جائے تو اس کی اطاعت واجب نہیں۔ بلکہ جب تک اکراه کی شرعی حالت متحقق نہ ہو، شریعت کے احکام پر عمل ضروری ہے، اس راستے میں جتنی تکلیفیں پیش آ جائیں ان پر صبر کرنا چاہئے کہ وہ موجب اجر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی حاکم شریعت کے خلاف کام کر رہا ہے تو اسے راہ راست پر لانے کے لئے امر بالمعروف اور نبی عن الممنکر اس کی شرائط کے ساتھ انجام دینا بھی ضروری ہے اور ضرورت کے وقت اس کے سامنے اظہار حق بھی، جسے حدیث میں ”أفضل الجہاد“، قرار دیا گیا ہے۔ یہ تمام کام شریعت کے عین مطابق ہیں بشرط یہ کہ شرعی حدود میں ہوں اور پیش نظر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور دین حق کی تبلیغ و نصرت ہو، محض اپنی بہادری جتنا، لوگوں سے داد حاصل کرنا، یا خود طلب اقتدار پیش نظر نہ ہو۔

لیکن آج کی سیاسی فضائیں یہ معاملہ بھی شدید افراط و تفریط کا شکار ہے جو لوگ حزب اقتدار سے وابستہ یا حکومت کے طرف دار ہوتے ہیں، وہ ہر حال میں حکومت کی تعریفوں

کے پل باندھے رکھتے ہیں اور اس کے ہر جائز و ناجائز فعل کی تائید و حمایت کرتے ہیں۔ حکومت کے ناجائز یا ظالمانہ اقدامات کو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں پھر بھی خاموش رہتے ہیں اور ان کی تاویلات تلاش کرتے رہتے ہیں۔ جو صریح مذاہنت ہے اور بعض لوگ تو ان ناجائز اقدامات کی حمایت کے لئے تحریف دین تک سے دریغ نہیں کرتے اور دوسری طرف جو لوگ ”حزب اختلاف“ سے وابستہ یا حکومت کے مخالف ہیں وہ ”حکومت کی مخالفت“ کو بذات خود ایک مقصد بنالیتے ہیں اور اسے سیاسی فیشن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر حزب اختلاف یہ بات اپنے فرائض منصبی میں سے سمجھتی ہے کہ وہ حکومت کی ہر بات میں کیڑے نکالے اور اس کی کسی اچھائی کا اعتراف نہ کرے۔ اس طرز عمل کا مقصد بسا اوقات حق کی نصرت کے بجائے حکومت کو بدنام کر کے اپنے اقتدار کا راستہ ہموار کرنا اور عوام سے بہادری کی داد حاصل کرنا ہوتا ہے۔

عوام میں بھی حکام کو وقت بے وقت برا بھلا کہنے اور انہیں گالیاں تک دینے کا رواج عام ہو چکا ہے۔ جلوسوں میں سربراہان حکومت کو ”ستا“ اور ”سور“ تک بنا کر ان کے خلاف ہائے ہائے کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ مجلسوں میں ایک مشغله کے طور پر حکام کا ذکر کر کے ان کی برا ایساں کی جاتی ہیں۔ جو کسی معقول وجہ کے بغیر ہونے کی وجہ سے غیبت میں تو داخل ہیں ہی، بعض اوقات افتراء اور بہتان کی حدود میں بھی داخل ہو جاتی ہیں، اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ فاسق و فاجر حکمرانوں کو برا کہنا غیبت میں داخل نہیں۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس طرز عمل پر بھی تقدیم فرمائی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

”حجاج بن یوسف اس امت کا سب سے بڑا ظالم مشہور ہے مگر کسی بزرگ کی مجلس میں ایک شخص نے اس پر کوئی الزام لگایا اور غیبت کی تو انہوں نے فرمایا کہ وہ اگر چہ ظالم و فاسق ہے مگر حق تعالیٰ کو اس سے کوئی دشمنی نہیں وہ جس طرح دوسرے مظلوموں کا انتقام حجاج سے لے گا، اسی طرح اگر کوئی حجاج پر ظلم کرے گا تو اس سے بھی انتقام لیا جائے گا۔“

( مجلس حکیم الامت ص ۹۲، ملفوظات رمضان ۱۳۸۸ھ)

اس کے علاوہ حضرت نے کئی مقامات پر یہ بات واضح فرمائی ہے کہ کسی ضرورت کے

بغیر حکام کی علی الاعلان اہانت شرعاً پسندیدہ بھی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

”سلطین اسلام کی علی الاعلان اہانت میں ضرر ہے جمہوریت کا ہبہ نکلنے سے فتن پھیلتے ہیں، اس لئے سلطین اسلام کا احترام کرنا چاہئے۔“ (انفاس عیسیٰ ص ۳۶۹ ج ۱۹ باب ۲)

حضرت حکیم الامت کی یہ بات درحقیقت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی شرح ہے جو حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے۔

”من اراد ان ینصح لذی سلطان با مر فلا یبدلہ علانیہ فلکن لیا خذ بیدہ فیخلوبہ فان قبل منه فذاک، والا کان قدادی الذی علیه“

جو شخص کسی صاحب اقتدار کو کسی بات کی نصیحت کرنا چاہے تو اس نصیحت کو علانیہ ظاہر نہ کرے، بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر خلوت میں لے جائے اگر وہ اس کی بات قبول کر لے تو بہتر ورنہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ (مجموع الزوائد ص ۵۲۹ ج ۵ جو والہ مند احمد و رجال ثقات)

ایک اور وعظ میں حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں۔

”بعض لوگ بعض مصائب سے تنگ ہو کر حکام وقت کو برا بھلا کہتے ہیں، یہ بھی علامت ہے بے صبری کی، اور پسندیدہ تدبیر نہیں، اور حدیث شریف میں اس کی ممانعت بھی آئی ہے فرماتے ہیں۔“ لاتسبوا الملوک ”یعنی بادشاہوں کو برامت کہو، ان کے قلوب میرے قبضے میں ہیں میری اطاعت کرو، میں ان کے دلوں کو تم پر زرم کر دوں گا۔“

(وعظ الصبر ص ۳۶، ماذواز اصلاح اسلامین ص ۵۲۲)

جس حدیث کی طرف حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے وہ مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف الفاظ میں مروی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس کے یہ الفاظ مروی ہیں۔

”لَا تَشْغُلُوا قُلُوبَكُمْ لِسَبِ الْمُلُوكَ، وَلَكُنْ تَقْرِبُوا إِلَى اللَّهِ تَعَالَى بِالدُّعَاءِ لَهُمْ يَعْطُفُ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ عَلَيْكُمْ.“

ترجمہ:- ”اپنے دل بادشاہوں کو برا بھلا کہنے میں مشغول نہ کرو۔ بلکہ ان کے حق میں دعا کر کے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرو، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو تمہاری طرف متوجہ فرمادیں گے۔“ (کنز العمال ص ۲ ج ۹، حدیث ۹، جو والہ ابن الجمار)

اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ الفاظ منقول ہیں۔

”ان الله يقول انا الله لا الله الا انا مالک الملک وملک الملوك،  
قلوب الملوك بيدي، وان العباد اذا اطاعولی حولت قلوب  
ملوکهم عليهم بالرافق والرحمة، وان العباد اذا عصونی حولت  
قلوبهم عليهم بالسخط والنفحة، فساموهم سوء العذاب، فلا  
تشغلوا انفسهم بالدعاء على الملوك ، ولكن اشغلوا انفسکم  
بالذكر والتضرع اکفکم ملوککم“

ترجمہ:- ”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں  
مالک الملک ہوں، اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں، بادشاہوں کے قلوب میرے ہاتھ میں  
ہیں، اور بندے جب میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے دلوں کو ان کی  
طرف رحمت و رافت سے متوجہ کر دیتا ہوں، اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو  
میں ان کے دلوں کو ان کے خلاف ناراضی اور عذاب کے ساتھ متوجہ کر دیتا ہوں، چنانچہ وہ  
انہیں بدرتین اذیتیں پہنچاتے ہیں، لہذا تم بادشاہوں کو بددعا میں دینے میں مشغول نہ ہو،  
 بلکہ اپنے آپ کو ذکر اور دعا و تضرع میں مشغول رکھو، میں تمہارے بادشاہوں کے معاملے  
میں تمہاری مدد کروں گا۔“ (مجمع الزوائد ص ۲۳۹، ج ۵، بحوالہ طبرانی، وفی ابراہیم بن راشد، وہ مترجم)

اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں۔

”لاتسبوا لانمہ وادعوا الله لهم بالصلاح فان صلاحهم لكم صلاح.“

ترجمہ:- ”انمہ (سر بر اہان حکومت) کو برا بھلانہ کہو، بلکہ ان کے حق میں نیکی کی دعا  
کرو۔ کیونکہ ان کی نیکی تمہاری بھلانی ہے۔“ (السرانج المیر للعزیزی ص ۳۱۱، ج ۳، و قال: اسنادہ حسن)  
بہر صورت! حکام کو بلا ضرورت برا کہنے کو مشغله بنالینا شرعاً پسندیدہ نہیں ہے، اگر وہ اتنے  
برے ہوں کہ ان کے خلاف خروج (بغاویت) جائز ہو تو پھر شرعی احکام کے مطابق خروج کیا  
جائے، (جس کی کچھ تفصیل انشاء اللہ آگے آرہی ہے) لیکن بد گوئی کو شیوه بنانے سے منع کیا گیا

ہے۔ غیبت کے نقصان کے علاوہ حضرت حکیم الامت نے اس بدگوئی کے ایک اور نقصان کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے، اور وہ یہ کہ حکومت کی فی الجملہ بیہت امن و امان کے قیام کے لئے ضروری ہے اور جب یہ بیہت دلوں سے اٹھ جائے تو اس کا لازمی نتیجہ مجرموں کی بے باکی کی صورت میں نکلتا ہے ملک میں بدامنی پھیلتی ہے، اور اس کا نقصان پوری قوم کو بھلتنا پڑتا ہے۔

حکومت کے غیر شرعی قوانین اور اقدامات کے خلاف چارہ کار یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہڑتاں، بھوک ہڑتاں اور احتجاج کی مروجہ پیشہ صورتوں کو درمیان سے نکال دیا جائے تو موجودہ حکومتوں کے غیر شرعی قوانین اور اقدامات کے خلاف امت کے پاس چارہ کار کیا رہ جاتا ہے؟ کیا موجودہ حکومتوں کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ اسلامی احکام کو پامال کرتی رہیں؟ لوگوں کو اسلام اور اسلامی تعلیمات سے بر گشته کرنے کے لئے حکومت کی پوری مشینری کو استعمال کرتی رہیں؟ تعلیم گاہوں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے غیر اسلامی نظریات کی ترویج جاری رہے؟ اور جو مسلمان دین پر عمل کرنا چاہتے ہیں وہ زبانی و ععظ و نصیحت کے سوا کچھ نہ کریں؟ جبکہ آج کل کی حکومتوں کا تجربہ ہے کہ وہ زبانی و ععظ و نصیحت کو درخور اعتمان نہیں سمجھتیں اور جب تک ان پر احتجاج کا دباؤ نہ ڈالا جائے اس وقت تک وہ کسی مطالبے کو عموماً تسلیم نہیں کریں۔

اس سوال کا جواب حضرت حکیم الامت کے ارشادات کی روشنی میں یہ ہے کہ مغربی سیاست کے روایج عام کے سبب ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ احتجاج کا طریقہ ہڑتاں، جلوسوں اور مظاہروں ہی میں مختصر ہے حالانکہ ایک مسلمان کو احتجاج کا طریقہ بھی خود اپنے دین کے احکام ہی سے لینا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ اگر حکومت کے غیر اسلامی اقدامات اس حد تک پہنچ جاتے ہیں جہاں حکومت کے خلاف خروج (مسکن بغاؤت) جائز ہو جائے تو وہاں خروج کے احکام جاری ہوں گے (جن کی کچھ تفصیل آگے آرہی ہے) لیکن جہاں خروج جائز نہ ہو، وہاں وعظ و نصیحت کے علاوہ مسلمانوں کے پاس احتجاج کا ایک طریقہ ایسا ہے جو بڑی بڑی حکومتوں کو گھٹنے لیکنے پر مجبور کر سکتا ہے اور وہ طریقہ ہے۔

”لَا طَاعَةُ الْمُخْلُوقِ فِي مُعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔“

یعنی! ”خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔“

اور یہ طریقہ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے ثابت ہوتا ہے، حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

خذو الْعَطَاءَ مَادِمَ عَطَاءُ، فَإِذَا صَارَ رِشْوَةً عَلَى الَّذِينَ فَلَا تَخْذُنُوهُ وَلِسْتُمْ

بِتَارِكِيهِ يَمْنَعُكُمُ الْفَقْرُ وَالْحَاجَهُ، لَا إِنْ رَحِيَ الْإِسْلَامُ دَائِرَةً قَدْرَوْاعِمِ

الْكِتَابِ حِيثُ دَارَ، إِلَّا إِنَّ الْكِتَابَ وَالسُّلْطَانَ سَيْفَتَرَ قَانَ، فَلَا تَفَارَقُوا

الْكِتَابَ إِلَّا أَنْهُ سَيْكُونَ عَلَيْكُمْ أَمْرَاءُ لِقَضَوْنَ لَأَنفُسِهِمْ مَالًا لِيَقْضُونَ لَكُمْ

فَإِنْ عَصَيْتُمُوهُمْ قَتَلُوكُمْ، وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ أَضْلُوكُمْ، قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ

كَيْفَ نَصْنَعُ؟ قَالَ كَمَا صَنَعَ اصْحَابُ عِيسَىٰ بْنُ مَرْيَمٍ نَشَرُوا بِالْمَنَاسِيرِ،

وَحَمَلُوا عَلَى الْخَشْبِ، مَوْتٌ فِي طَاعَةِ اللَّهِ خَيْرٌ مِنْ حَيَاةٍ فِي مُعْصِيَةِ اللَّهِ.

تَخْواهِ اس وقت تک اوجب تک و تَخْواهِ رہے، لیکن اگر وہ دین (فروشی) کے اوپر رشوت بن جائے تو نہ لواور تم فقر اور حاجت کے خوف سے اسے چھوڑو گے نہیں، خوب سن لو کہ اسلام کی چکی چل چکی ہے لہذا قرآن جہاں بھی جائے تم اس کے ساتھ جاؤ۔ خبردار قرآن اور اقتدار دونوں الگ الگ ہو جائیں گے ایسے میں تم قرآن کا ساتھ نہ چھوڑنا، یاد رکھو کہ تم پر کچھ ایسے امراء آئیں گے جو اپنے حق میں وہ فیصلے کریں گے جو تمہارے حق میں نہیں کریں گے۔ اگر تم نے ان کی خلاف ورزی کی تو وہ تمہیں قتل کر دیں گے اور اگر تم نے ان کے اطاعت کی تو وہ تمہیں گراہ کر دیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم ایسے میں کیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہی کرو جو عیسیٰ بن مريم علیہ السلام کے ساتھیوں نے کیا، ان کو آروں سے چیر دیا گیا اور لکڑیوں پر اٹھایا گیا۔ اللہ کی اطاعت میں موت آجائے تو وہ اللہ کی نافرمانی میں زندگی گزارنے سے بہتر ہے۔ (مجموع الزوائد ص ۲۲۸ جلد ۵، بحوالہ طبرانی، و قال <sup>لہیشی</sup> یزید مرند لم یسمع من معاذ والوضئن بن عطاء و لقابن حبان وغيره و ضعفه جماعة، و قیة رجال ثقات)

اس حدیث نے واضح فرمادیا کہ اگر کبھی حکومت وقت کی طرف سے اپنے احکام جاری کئے جائیں جو اللہ کی کتاب کے صراحتاً خلاف ہوں (جن میں اسلام کے تمام قطعی اور منصوص احکام داخل ہیں) تو ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ ان احکام کے بجائے اللہ کے حکم کی پابندی کرے، یہ طریق کا رجہاں انفرادی طور پر اور اخروی نجات کا راستہ ہے، وہاں اس میں اجتماعی اصلاح کی بھی زبردست صلاحیت ہے کیونکہ اب اگر عوام میں یہ عام دینی شعور پیدا کر دیا جائے کہ وہ خالص اپنے دینی جذبے سے حکومت کے غیر اسلامی احکام کی تنقید میں حصہ دار بننے سے ہاتھ روک لیں تو ایک حکومت پر اس سے بڑے کسی دباؤ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ تصور فرمائیے کہ اگر مسلمان اپنے دینی شعور کے تحت یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ بینکوں کے سودی کھاتوں میں رقمیں نہیں رکھوائیں گے۔ ملاز میں یہ طے کر لیں کہ وہ سودی بینکوں کی ملازمت چھوڑ دیں گے، اور تجارتی طے کر لیں کہ وہ کسی بینک سے سود پر قرض نہیں لیں گے، تو کیا یہ سودی نظام ایک دن باقی رہ سکتا ہے؟ اگر مسلمان نج یہ طے کر لیں کہ کسی غیر اسلامی قانون کے تحت فیصلہ نہیں کریں گے۔ اور اس کے لئے ملازمت چھوٹی پڑے تو چھوڑ دیں گے۔ دکاء یہ طے کر لیں کہ وہ کسی غیر اسلامی قانون کے تحت کسی مقدمے کی پیرودی نہیں کریں گے خواہ انہیں کتنے مالی فوائد سے ہاتھ دھونے پڑیں تو کیا یہ غیر اسلامی قوانین عوام کے سروں پر مسلط رہ سکتے ہیں؟ اگر مسلمان سرکاری ملاز میں یہ عزم کر لیں کہ وہ حکومت کے کسی غیر اسلامی اقدام کی تنقید میں حصہ دار بنتا گوارہ نہیں کریں گے اور اگر انہیں ایسا کرنا پڑا تو وہ ملازمت سے مستغفی ہو جائیں گے تو کیا یہ غیر اسلامی اقدامات باقی رہ سکتے ہیں؟

احتیاج کے مردجہ طریقوں کے مقابلے میں اس تجویز میں صرف یہ خرابی ہے کہ یہ مژبی سیاست کے نکسال سے ڈھل کر نہیں نکلی اس لئے ذہنوں کے لئے اچھی اور نامانوس ہے لیکن اگر اس تجویز پر تھیک تھیک عمل کر لیا جائے تو اس میں ملک کا نظام بدلنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، اور یہ مردجہ مذاہیر کے مفاسد سے بھی خالی ہے۔ ہاں اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والوں کے دل میں خدا کا خوف، آخرت کا فکر، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس، اور اتباع شریعت کی لگن موجود ہو۔ اور وہ پہلے

اپنے ذات پر اسلامی احکام کے نفاذ کے لئے تیار ہوں۔

اس کے بعد کس مردجہ طریق کارلوگوں کو اس لئے آسان معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اپنی ذات پر اسلام کی کوئی پابندی عائد کرنے کی کوئی شرط نہیں ہے، جس شخص کی ذاتی زندگی اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے خالی ہو، وہ بھی نفاذ اسلام کا جھنڈا بلند کر کے سڑکوں پر نعرے لگا سکتا ہے، اس طریق کا ریں ”اسلامی جذبے“ کے اظہار کے لئے ایک دن ہر ہتال میں حصہ لے لینا کافی ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد دو کانوں اور دفتروں میں بیٹھ کر خالص غیر اسلامی معاملات اپنے ہاتھوں سے طے کئے جا رہے ہیں تو اس سے اس جدوجہد پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ خود اپنی ذاتی زندگی پر اسلامی احکام نافذ نہ کر سکتے ہوں وہ کیسے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ نفاذ اسلام کے لئے ان کی جدوجہد اور ان کے مطالبات پورے ہو جائیں گے؟ اس عظیم کام کے لئے اتنی شرط تو ہونی چاہئے کہ جو لوگ اس جدوجہد کا بیڑا اٹھائیں، کم از کم وہ تو اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہوں اور اس راہ میں جان و مال اور جذبات و مفادات کی قربانی پیش کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔ اگر یہ بنیادی شرط ہی مفقود ہے تو نفاذ اسلام کی جدوجہد کی حیثیت و اہمیت ایک بے جان اور سطحی شورش سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

## حکومت کے خلاف خروج

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کو شدید جرم قرار دیا ہے اور باغی کی سزا موت قرار دی ہے۔ چنانچہ اس بات پر فقهاء کرام کا اجماع ہے کہ حکومت عاولہ کے خلاف بغاوت حرام ہے۔ البتہ ایک ظالم یا غیر اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کس وقت ہوتی ہے؟ اس مسئلے میں فقهاء امت نے کافی مفصل بحثیں کی ہیں یہ بات تو احادیث سے واضح ہے کہ اگر حکمران سے کفر بواح ( واضح کفر) کا صدور ہو جائے تو اس کے خلاف بغاوت بالکل بحق ہے لیکن اگر اس سے فتن و فجور سرزد ہو تو اس صورت میں عموماً فقهاء بغاوت کو جائز نہیں کہتے کیونکہ حدیث میں صرف کفر بواح کی صورت میں بغاوت کی

اجازت دی گئی ہے، لیکن دوسری طرف بعض احادیث کے کچھ الفاظ اس کے خلاف بھی نظر آتے ہیں۔ جن سے حکمران کے فتن کی صورت میں خروج کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اسی بناء پر بعض فقہاء کی عبارتیں متفاہی نظر آتی ہیں۔ خود راقم الحروف کو اس مسئلے میں ایک مدت تک بہت اشکال رہا، اور کوئی منقح بات سامنے نہیں آئی۔

لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے اس موضوع پر ایک نہایت جامع مفصل اور مدلل رسالہ تحریر فرمایا ہے جو امداد الفتاویٰ کی پانچویں جلد میں ”جزل الکلام عزل الامام“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں حضرت نے اس موضوع کی تمام احادیث اور فقہاء کرام کے اقوال کو بیکجا جمع کر کے اس مسئلے کو اتنا منقح فرمادیا ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر بحث احقر کی نظر سے نہیں گزری۔ حضرت نے مسئلے کی تمام صورتوں کا تجزیہ فرمایا کہ ہر صورت کا حکم احادیث اور فقہی حوالوں کے ذریعے واضح فرمایا ہے۔ حضرت کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حکمران کے غیر اسلامی اقدامات کی چند صورتیں ہیں اور ہر صورت کا حکم جدا ہے۔

۱۔ حکمران کا فتن اس کی ذات کی حد تک محدود ہو، مثلاً شراب نوشی وغیرہ، اس کا حکم یہ ہے کہ۔ ”اگر بدؤں کسی فتنے کے آسانی سے جدا کر دینا ممکن ہو، جدا کر دیا جائے، اگر فتنے کا اندیشه ہو صبر کیا جائے..... اور اگر نبی عن العزل کی صورت میں اس پر کوئی خروج کرے تو عامہ مسلمین پر اس کی نصرت واجب ہے خاص کر جب امام بھی حکم کرے۔ لقولہ فی العبارۃ السادستہ فاذا خرج جماعة مسلمون..... اخ.....“

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا فتن دوسروں تک متعدد ہو۔ یعنی لوگوں کا مال ناقص طریقے سے لینے لگے، لیکن اس میں اشتباه جواز کا بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے مصالح سلطنت کے نام سے ٹیکس وغیرہ وصول کرنے لگے۔ اس صورت کا حکم یہ ہے کہ اس میں اس کی اطاعت ہی واجب ہے خروج جائز نہیں۔

۳۔ ایسا مالی ظلم کر کے جس میں جواز کا شہر بھی نہ ہو۔ بلکہ صریح ظلم ہو۔ اس کا حکم یہ کہ ”اپنے اوپر سے ظلم کا دفع کرنا، اگر چہ قابل کی نوبت آ جائے..... اور صبر بھی جائز

ہے۔ بلکہ غالباً اولیٰ ہے۔۔۔۔۔

۳۔۔۔۔۔ لوگوں کو معصیتوں پر مجبور کرے، مگر اس کا نشانہ دین کا استخفاف یا کفر و معصیت کی پسندیدگی نہ ہو، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس پر اکراہ کے وہ احکام جاری ہوں گے جو فقہ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ لیکن خروج چائز نہ ہو گا۔

۴۔۔۔۔۔ لوگوں کو معصیت پر مجبور کرے۔ اور اس کا نشانہ یا کفر و معصیت کی پسندیدگی ہو تو یہ کفر ہے، یا اگرچہ فی الحال تو اکراہ کا نشانہ استخفاف وغیرہ نہ ہو، لیکن اکراہ عام بُشکل قانون ایسے طور پر ہو کہ ایک مدت تک اس پر عام عمل ہونے سے فی المال ظن غالب ہو کہ طبائع میں استخفاف پیدا ہو جائے گا تو ایسا اکراہ بھی بحکم کفر ہے، اور ان تمام صورتوں میں وہی حکم ہو گا جو کفر بواسح کا ہے اور جو چھٹی صورت میں آ رہا ہے۔

۵۔۔۔۔۔ نعوذ باللہ کافر ہو جائے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ۔

”معزول ہو جائے گا اور اگر جدا نہ ہو، بشرط قدرت جدا کر دینا علی الا طلاق واجب ہے مگر اس میں شرط یہ ہے کہ وہ کفر متفق علیہ ہو۔ اور جس طرح اس کا کفر ہونا قطعی ہو۔ اسی طرح اس کا صدور بھی یقینی ہو۔ مثل رویت عین کے، نہ کہ محض روایات ظفیہ کے درجے میں، کمادل علیہ قوله علیہ السلام: الا ان تروا المراد به رویته العین بدلیل تعدیته الی مفعول واحد۔

کسی امر موجب کفر کی دلالت علی الکفر یا اس امر موجب کفر کا ثبوت قرائی مقامیہ یا مقایلہ کے اختلاف سے مختلف فیہ ہو سکتا ہے، اور خود قطعیت بھی مختلف فیہ ہو سکتی ہے اسی طرح کبھی اجماع مختلف فیہ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ اس صورت میں ہر عامل اپنے عمل میں معذور ہو گا۔ اسی طرح ایک صورت میں بھی رائے کے اختلاف میں مساغ ہے، وہ یہ کہ عبارت خامہ میں تعارض مصالح کے وقت اخف المضر تین کے تحمل کا حکم کیا گیا ہے، تو ممکن ہے کہ وہ شخصوں کا اجتہاد مضرات مختلفہ کے اخف و اشد ہونے میں مختلف ہو۔ و بهین محل کثیر من الا شکالات من الا خلاف جماعات الثقات فی مثل هذا المقامات۔ (امداد الفتاویٰ ص ۱۲۰ ج ۵)

پھر جن صورتوں میں خروج کی اجازت یا وجوب بیان کیا گیا ہے ان میں شرط یہ ہے کہ خروج کے لئے مناسب قوت موجود ہو۔ اور اس کے نتیجے میں کسی اور بدتر حکمران کے مسلط ہو جانے یا کسی غیر مسلم طاقت کے قبضہ جماليے کا اندیشہ نہ ہو۔

یہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کا نہایت اجمالی خلاصہ پیش کیا گیا ہے، ورنہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہر صورت کے حکم کو حدیث اور فقہ کے دلائل سے مبرہن فرمایا ہے، اور تمام ممکنہ شبہات کا ازالہ بھی فرمایا ہے۔ اہل علم کے لئے یہ رسالہ نہایت مفید اور اطمینان بخش ہے۔

فهذا آخر ما ارادنا ایراده في هذه  
العجالۃ وآخر دعوانا ان الحمد لله  
رب العالمین والصلوۃ والسلام على  
سیدنا و مولانا محمد النبی الامین  
وعلى آلہ واصحابہ اجمعین.

## مر وجہ سیاست کے شرعی احکام

از افادات: حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

### حکومت و سیاست بھی شریعت کا اہم شعبہ ہے

اس کے متعلق ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ سیاست کو دین و شریعت کا جزء نہیں سمجھتے  
محض تمدنی امور سمجھ کر اس کا مدار رائے اور زمانہ کی مصلحت پر سمجھا جاتا ہے اور اس میں اپنے کو  
تصرف کرنے کا اختار سمجھا جاتا ہے۔ (الانتباہات المفیدہ ص ۷، انتباہ ص ۱۲)

یہ کیسی سخت غلطی اور کتنی بڑی جہالت ہے کہ سیاست کو لوگ دین نہیں سمجھتے۔ سیاست  
بھی تو دین ہے (ورنہ) اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسلام نے سیاست کی تعلیم نہیں دی سو یہ کتنی  
بڑی تحریف ہے۔ (الافتضات الیومیہ ص ۱۵۲)

مذہب اسلام میں جو ایک حصہ سیاست ہے وہ مدون (مرتب) ہے وہی بہت کافی  
اور خالص مذہبی سیاست ہے۔ اس کو اختیار کرو۔ (ملفوظات ص ۹۵)

### اسلام نے سیاست کی تعلیم دی ہے

لوگ سمجھتے ہیں کہ شریعت کی تعلیم کامل نہیں، تمام حالات کے متعلق اس میں احکام  
نہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ شریعت نے صرف عبادات اور معاملات ہی کے احکام بیان کئے  
ہیں۔ سیاست کے متعلق شریعت میں تعلیم نہیں ہے۔

اس فاسد خیال سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ لوگ حد شرعی سے آگے بڑھنے لگے، اور جو کچھ  
بھی میں آیا کرنے لگے۔ کیونکہ ان کے خیال میں تو شریعت نے ان امور کی بابت گفتگو کی، ہی نہیں  
(سیاست کے) احکام بیان ہی نہیں کئے۔ پھر دوسری قومیں بھی ان لوگوں کے طرز عمل کو دیکھ کر  
یوں سمجھتے ہیں کہ دین اسلام کی تعلیم ناقص ہے جس نے ایسے وقت کے لئے کوئی قانون مقرر نہیں  
کیا۔ بلکہ بعض لوگ تو مسلمانوں کے طرز عمل کو دیکھ کر دین اسلام کو وحشت اور عدم تہذیب کی

طرف منسوب کرتے ہیں اور بے خبری کی وجہ سے کسی قدر اس نسبت کی وجہ صحیح بھی ہے۔ کیونکہ دوسری قویں ہمارے مذہب کو کہاں معلوم کرتی پھر تی ہیں۔ ان کے نزدیک تو ہمارے اعمال ہی مذہب کا آئینہ ہیں۔ جیسے ہمارے افعال ہوں گے اسی پر مذہب کو محول کریں گے۔

الغرض شریعت مقدسہ نے سیاست کے متعلق بھی کافی قانون مقرر کیا ہے..... شریعت نے ہر حالت کے متعلق ضروری قواعد بتائے ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ شریعت کامل ہے..... اور کسی قانون کا مکمل ہونا یہ ہے کہ اس کے تمام حالات کے متعلق قواعد ہوں..... شریعت کا کمال یہی ہے کہ اس میں تمام انسانی حالات کے متعلق مفصل مفصل قواعد موجود ہیں کوئی جزوی ایسی نکلنی ممکن نہیں جس میں شریعت کا کوئی حکم نہ ہو۔

اگر کوئی یوں کہے کہ گورنمنٹ کا قانون مکمل ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ہر عقلمند یہی کہے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری سلطنتوں کے مقابلہ میں اس میں ہر ہر محکمہ کے لئے کافی قانون موجود ہے اور پھر ہر محکمہ کی جزئیات پر پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

توجب ایک سلطنت کے قانون کا مکمل ہونا اس کا عمدہ وصف ہے تو خدا کے قانون کے لئے نقصان کیوں تجویز کیا جاتا ہے۔ اور اگر خدا کے قانون کے لئے مکمل ہونا ضروری ہے تو پھر اس کے بغیر تمام حالات کے متعلق مفصل احکام بیان کئے جائیں قانون کی تکمیل کیوں کرہو سکتی ہے۔

الغرض شریعت مقدسہ نے سیاست کے متعلق بھی کافی قانون مقرر کیا ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام کی تعلیم..... ناکافی ہے۔

واللہ شریعت ہی کے پابند ہو کر ہم سب کچھ ہو سکتے ہیں۔ (البلبغ ص ۱۸۰، ۱۸۳، ۱۹۵)

## سیاسی ترقی کے حد و دار علماء کے ترقی سے منع کرنے کی حقیقت

خوب سمجھ لیجئے ترقی کے دو درجے ہیں ایک وہ جس میں دین کا ضرر (نقصان) نہ ہو۔ اور دوسرے وہ جس میں دین کا ضرر ہو۔ علماء پہلی ترقی کے حاصل ہیں اور دوسری ترقی (جس کا نقصان ہواں) کے ماحی (یعنی خلاف) ہیں۔

جیسے گورنمنٹ کو باوجود یہ کہ دنیاوی ترقی کا حامی کہا جاتا ہے۔ اور وہ اس کی حمایت کرتی

ہے کہ رعایا ترقی کرے۔ مگر ترقی کی حمایت کے باوجود یہ کہ گورنمنٹ ہی کا قانون ہے کہ ڈکیتی بڑا جرم ہے۔ حالانکہ وہ بھی ترقی ہے اور ترقی بھی کیسی کہ ایک رات میں آدمی مالا مال ہو جائے مگر گورنمنٹ اس ترقی کی حامی نہیں بلکہ محی (یعنی) اس کو ختم کرنے والی ہے۔

صاحب! یہی قاعدہ تو علماء نے اختیار کیا ہے بعض قسم کی ترقی کے حامی ہیں اور بعض ترقی کے ماجی (خلاف) ہیں۔ یعنی جو ترقی دین کے لئے مضر نہ ہو، اس کے حامی ہیں اور جو مضر ہو اس کے ماجی ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی بات اگر علماء کریں تو وہ مردود ہو اور وہی بات گورنمنٹ کرے تو مقبول ہو، بات تو دونوں جگہ ایک ہی ہے مگر حیرت ہے کہ ایک جگہ مقبول ہو، اور دوسری جگہ مردود ہو۔ (شب قدر، تبلیغ ص ۸۲/۸)

## علماء کی مخالفت کی حقیقت

ہماری مخالفت ایسی ہے جیسے باپ کو بچہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ کہ جب بچہ غلط طریقہ اختیار کرتا ہے تو باپ اس کا مخالف ہوتا ہے۔ اور اس کو مارتا بھی ہے۔

یا جیسے ماں اپنے بیمار بچہ کی مخالفت کرتی ہے کہ بچہ اپنی طبیعت کے موافق غذا میں مانگتا ہے مگر..... ماں اس کو نہیں دیتی، بلکہ بسا اوقات ضد کرنے پر اس کو مارتی بھی ہے۔ اور وہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ ان دونوں مثالوں میں دو قسم کے نقصان ہیں، ایک اہون (کم درجہ) کا اور ایک اشد (یعنی سخت) ماں باپ اشد الضرر (یعنی بڑے نقصان) سے بچانے کے لئے اہون (یعنی کم درجہ کا نقصان) کو اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ عقلی قاعدہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے نقصان جمع ہوں، ایک سخت، دوسرا ہمکا تو ہمکے کو اختیار کر لینا چاہئے۔ مثلاً باپ نے بچہ کو غلطی کرنے پر جو مارتا تو یہ بھی بچہ کے حق میں ایک درجہ کا نقصان ہے۔ اور دوسرا نقصان یعنی غلط طریقہ پر رہنا یہ زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ اگر بچہ غلط طریقہ پر قائم رہا تو اس کا انجام بہت ہی برا ہوگا۔ مثلاً وہ پڑھتا نہیں یا بڑی صحبت میں بیٹھتا ہے تو اس سے آئندہ اس کو بہت نقصان ہوگا۔ اور یہ نقصان پہلے نقصان سے بڑھ کر ہے۔ اسی لئے باپ نے کم درجہ کے نقصان کو اختیار کیا تاکہ بڑے نقصان سے محفوظ رہے۔

ای طرح ہم مانتے ہیں کہ ہمارے بعض مشورے ایسے ہیں کہ ان سے دنیا کا ایک درجہ کا نقصان ہے مگر چونکہ وہ نقصان کم درجہ کا ہے جو آزاد چھوڑ دینے سے (اس سے بڑھ کر) پیش آنے والا ہے۔ اس لئے بڑے نقصان سے بچانے کے لئے کم درجہ کا نقصان اختیار کیا گیا ہے۔ اور وہ بڑا نقصان کیا ہے؟ وہ دین کی خرابی (اور شریعت کے خلاف ہونا) ہے۔ اس سے زیادہ بڑا کوئی نقصان نہیں۔ اگر اس کا نام مخالفت ہے تو ماباپ اور استاذ سب مخالف ہیں۔

اور حقیقت میں کم درجہ کے نقصان کو اختیار کرنا تو اصلاح ہے۔ ترقی والوں نے خواخواہ ہم کو اپنا مخالف سمجھ لیا ہے، ہم تو ایسی ترقی کے حامی ہیں کہ سات پشت تک اس کی برکت چلی جائے۔ اور ان کے پاس اپنے دعوے پر کہ ان کی ترقی حقیقی ترقی ہے (اس پر) کوئی دلیل نہیں اور ہمارے پاس قرآن و حدیث سے دلیل موجود ہے۔ (التبیغ ص ۲۲/۸)

### مفاد پرست لیڈروں کے تابع نام نہاد علماء

علماء حقیقت میں صرف وہ ہیں جو لیڈروں کے تابع نہ ہوں بلکہ شرعی حکم کے تابع ہوں۔ اور جو علماء لیڈروں کے تابع ہیں ان کی تو حالت یہ ہے کہ بخدا اگر لیڈر آج اپنی رائے کو بدل دیں تو یہ علماء بھی ادھر ہی ہو جائیں مگر ہیں عقائد کے فوراً اپنے فتوے کو نہ بد لیں گے کیونکہ اس سے عوام کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان کے فتوے لیڈروں کی رائے کے تابع ہیں، بلکہ آہستہ آہستہ اپنی رائے کو بدل کر لیڈروں کے راستہ پر آ جائیں گے۔

آج کل علماء لیڈروں کے ساتھ دو وجہ سے ہیں۔ یا تو اس لئے کہ ان سے علیحدگی میں جاہ (عزت) کے چلے جانے کا اندیشہ ہے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو علماء ان کے ساتھ نہیں ہیں ان کو عوام نے کیا بدنام کیا اور کتنا برا بھلا کھا۔

یار و پیاری کی لائج کی وجہ سے ان کے ساتھ ہیں۔ کہ اگر ہم نے ان تحریکات میں شرکت نہ کی تو مدرسہ کا چندہ بند ہو جائے گا۔ کوئی مدرسہ کی اعانت نہ کرے گا۔

ایک عالم نے مجھے لکھا تھا کہ ان تحریکات سے علیحدگی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم اسکیلے رہ جاؤ گے کوئی تمہارے ساتھ نہ ہو گا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے خدا کا ساتھ ہونا کافی ہے۔ اور کسی کے ساتھ ہونے کی ضرورت نہیں۔

لغت ہے ایسے مال و جاہ پر جس سے مخلوق کی رضا مقصود ہو مسلمانوں کی شان تو یہ ہونا چاہئے کہ خدا کی رضا کے سامنے اس کو کسی کی پرواہ نہ ہو اگرچہ مخلوق اس کو پاگل کہے مگر خدا راضی ہو تو وہی اس کے لئے سلطنت ہے اگر وہ پاگل بھی ہے تو کس کا پاگل ہے۔ (تقلیل الاختلاط، برکات رمضان ص ۲۲۷)

## سیاست کی قسمیں اور علماء کا منصب

### سیاست کے دو حصے

سیاست کے دو حصے ہیں ایک سیاست کے شرعی احکام یہ بے شک شریعت کا جز ہے اور کوئی عالم اس سے ناواقف نہیں۔ چنانچہ ابواب فقیہہ میں کتاب السیر کا ایک مستقل جز ہے۔ جس کی درس مدرس کا پابندی سے اہتمام ہے۔

دوسرا حصہ سیاست کا تجرباتی تدبیریں ہیں جو ہر زمانہ میں حالات و واقعات اور آلات وغیرہ کی تبدیلی سے بدلتی رہتی ہیں اور یہ حصہ شریعت کا جز نہیں۔ اور علماء کا اس میں ماحر ہونا ضروری نہیں۔ اس کی مہارت کے دوسرے ذرائع ہیں جن کا حاصل تجربہ اور خاص مناسبت (کا ہونا) ہے۔

لیکن اپر جو عرض کیا گیا کہ سیاست کا یہ حصہ یعنی تجرباتی تدبیریں شریعت کا جز نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حصہ شریعت سے مستغنى (بے نیاز) ہے اور اس کے استعمال کرنے والوں کو شریعت کے علماء کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں..... کیونکہ کوئی واقعہ اور کوئی عمل اور کوئی تجویز و رائے دنیا میں ایسی نہیں جس کے جواز میں شریعت سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ گو وہ شریعت کا جز نہ ہو (لیکن) جز نہ ہونے سے تابع نہ ہونا لازم نہیں آتا۔ (البدائع ص ۲۲۷)

### سیاست میں کو دن اعلاء کا منصب نہیں

اگر تم یہ چاہو کہ (علماء) اس سے آگے بڑھ کر سیاست میں عملی طور پر بھی حصہ لیں، اور تمہارے سیاسی جلسوں اور مظاہروں میں شریک ہوا کریں تو یہ کام ان کا نہیں، اور نہ تم کو انہیں مجبور کرنے کا حق ہے۔ تم نے علماء کو سمجھا کیا ہے۔ علماء جس کام کو کر رہے ہیں وہ اس قدر اہم و ضروری ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جس بستی میں ایک ہی عالم ہوا اور جہاد شروع ہو جائے تو اس عالم کو میدان جہاد میں جانا جائز نہیں۔ کیونکہ علماء اگر مرجا میں گئے تو علم دین کو کون سنبھالے

گا۔ اسی لئے ہمارے حاجی صاحب علماء کو ہجرت کرنے سے منع کرتے تھے کہ اگر تم ہندوستان کو چھوڑ دو گے تو ہندوستان میں دین کا کیا حال ہو گا اب لوگ اس کو تو دیکھتے نہیں کہ علماء کو سیاست میں پڑنے سے خود فقہاء اسلام نے منع کیا ہے۔ لیکن ان کو تو ازالہ دینے سے کام ہے مسلمانوں پر جو بھی مصیبت آئے اس کا ازالہ سب سے پہلے علماء پر ہے۔  
جو کام علماء کا ہے وہ کریں..... علماء سے مسائل پوچھو۔ دنیا کے حاصل ہونے کی (اور سیاسی) تدبیریں انہیں کیا معلوم۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے علوم اولیئن و آخریں کے جاننے والے کے لئے فن باغبانی کے مسئلہ تابیر..... سے واقف ہونا لازم نہیں تو معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی نقش نہیں۔ پھر غصب ہے کہ نبی کا فنون سے واقف نہ ہونا کوئی نقش نہ ہو اور ایک مولوی یہ چارہ اگر فن سیاست نہ جانتا ہو تو اس کا یہ نقش (عیب) سمجھا جائے۔ اور اس کو ملامت کا نشانہ بنایا جائے۔ (الافتضات الیومیہ ص ۲۷ ج ۱۰)

## نبی کے لئے سیاست میں حصہ لینا ضروری نہیں

اَلْمُتَّرَ إِلَى الْمُلَّا مِنْ بَنِي اَسْرَارِ نَيْلٍ مِنْ بَعْدِ مُؤْسَى لِذَقَ الْنَّبَيِّ لَهُمْ  
اَبْعَثْتَنَا مَلِكًا فَقَاتَلَنْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

ترجمہ۔ کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تحقیق نہیں ہوا۔ جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔ (بیان القرآن)

ان آئیوں سے اثبات مدعی (دعویٰ کے ثابت کرنے) کی تقریر یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے باوجود ان میں ایک نبی کے موجود ہونے کے ان نبی سے یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے (سیاسی) قائد بنئے بلکہ اس مقصد کے لئے بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی۔ سو اگر نبی کافی سمجھے جاتے اور نبی کا سیاسی قائد ہونا ضروری ہوتا تو ایسی درخواست کیوں کی جاتی۔ اور اگر یہ شبہ ہو کہ یہ بنی اسرائیل کی غلطی تھی کہ اس غلطی پر ان کے نبی نے تنبیہ کیوں نہیں فرمائی کہ میں کافی ہوں، بلکہ بادشاہ مقرر کرنے کا انتظام شروع فرمادیا۔ اور اگر کوئی جسارت کر کے یہ کہنے لگے کہ ان نبی سے بھی لغزش

ہو گئی تو پھر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کیوں نہیں فرمائی۔ بلکہ اس درخواست کو بلا کنکر قبول فرمایا۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ہر نبی کے لئے بھی سیاست میں تجربہ و مناسبت لوازم میں سے نہیں۔ چہ جائے کہ علماء و مشائخ کے لئے لازم ہو بلکہ مفسرین کی نقل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے ان کی سنت یہی رہی کہ وہاں کے سیاسی معاملات بادشاہوں سے متعلق ہوتے تھے۔ اور بادشاہ انبیاء کے حکم اور مشورہ کے مطابق چلتے تھے۔ چنانچہ تفسیر مظہری نے بھی ابْعَثْ لَنَّا مِلِّيْگَا کے تحت یہی لکھا ہے۔ (البدائع ص ۲۵)

**حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں، شان نبوت، شان سلطنت**

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں تھیں۔ شان نبوت اور شان سلطنت اس کے بعد خلفاء راشدین بھی دونوں کے جامع تھے، مگر اب یہ دونوں شانیں دو گروہ پر تقسیم ہو گئیں۔ شان نبوت کے مظہر علماء ہیں۔ اور شان سلطنت کے مظہر سلاطین اسلام۔ اب اگر یہ سلاطین (بادشاہ) علماء سے استغناہ (بے پرواہی) کرتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے۔ اور اگر علماء سلاطین کی مخالفت کرتے ہیں، تو اس سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے۔

اب دونوں کے جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ سلاطین (بادشاہوں) سے تو میں کہتا ہوں کہ وہ اپنے حدود (قوانين) میں کوئی حکم اس وقت تک نافذ نہ کریں جب تک اہل حق علماء سے استغناہ نہ کر لیں۔ اور علماء سے یہ کہتا ہوں کہ وہ نفاذ کے بعد اس پر کار بند ہوں (یعنی عمل کریں اور تائید کریں)۔

اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دو شانیں اس طرح جمع ہو جائیں تو مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کی صورت نکل آئے۔ اور ان کی ڈوبتی ہوئی کشی ساحل پر آگئے درنہ اللہ ہی حافظ ہے۔ (ملفوظات ص ۲۲۱/۳، اصلاح اسلامیین ص ۵۱۶)

### کام کی تقسیم اور کامیابی کا طریقہ

سب کوہ کام کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ..... تجربہ کا کام تو لیڈر کریں کہ وہ کسی کام کے کرنے سے پہلے علماء سے جائز ناجائز معلوم کر لیں۔ اور احکام بتلانے کا کام علماء

کریں۔ اس طرح ہر شخص اپنے فرض منصبی کو انجام دے۔ اس صورت میں کامیابی کی امید نکل سکتی ہے کہ ہم اپنا کام کریں وہ اپنا کام کریں۔

سب کے مل کر کام کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ سب ایک کام میں لگ جائیں یا ایک کا کام دوسرا کرنے لگے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مکان تیار کیا جا رہا ہے اس کی تیاری کے لئے معمار (کارگیر) کی بھی ضرورت ہے۔ بڑھی کی بھی ضرورت ہے، مزدور کی بھی ضرورت ہے۔ اب یہ بتلاؤ کہ سب مل کر جو تعمیر کا کام کر رہے ہیں۔ اس کا کیا طریقہ ہے۔ یہی کہو گے کہ کارگیر اینٹ لگائے۔ مزدور گارا پہنچائے، اینٹ پہنچائے، بڑھی آرا چلائے جب یہ سمجھ میں آگیا۔ اب میں پوچھتا ہوں اگر یہ سب مل کر اینٹ ہی لگانے لگیں یا سب کے سب آرا ہی چلانے لگیں، یا سب کے سب گارا ہی پکڑانے لگیں تو کیا مکان تیار ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اسی طرح یہاں خیال کرو کہ سب کو مل کر کام کرنے کے یہ معنی ہیں، کہ تجربہ کا کام تولید کریں۔ اور احکام بتلانے کا کام علماء کریں۔ ہر قوم کے لئے تقسیم خدمات ضروری ہے اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

تمام اہل تمدن اس کی ضرورت پر متفق ہیں۔ چنانچہ جنگ میں فوج جاتی ہے۔ فوجی افراد جاتے ہیں۔ فتنی، محرر، کلکشہ اور حج وغیرہ نہیں جاتے پھر نہ معلوم مولویوں کے ذمہ سارا کام کیوں رکھا جاتا ہے کہ وہ تفسیر و حدیث و فقہ کا علم بھی حاصل کریں، فتویٰ بھی دیں، وعظ بھی کہیں، درس و تدریس بھی کریں، مدرسے بھی قائم کریں، اور لیڈروں کے ساتھ جھنڈا لے کر سیاست میں بھی شریک ہوں۔ (الافتراضات الیومیہ ص ۱۳ اج ۱) (لتبلغ ص ۱۵ الحدود و القیود)

## لیڈروں کی ذمہ داری

لیڈروں۔ (اور مسلم نیتاوں) پر لازم ہے کہ جو کچھ قومی ترقی کے طریقے سوچیں ان کو پہلے علماء کے سامنے پیش کر کے شرعی فتویٰ حاصل کر لیا کریں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز۔ (یہ مناسب ہے یا نہیں) جب علماء فتویٰ دے دیں اس کے بعد ان سیاسی تدبیروں پر عمل کیا جائے۔

تقسیم خدمات بہت ضروری ہے، قومی ترقی کے اسباب اور ذرائع تولیدروں کو سوچنا

چاہئے اور ہر تدبیر کے جواز و عدم جواز کو اپنی رائے سے طے نہ کریں بلکہ علماء سے استفتاء کر لیا کریں، ورنہ مخفی ترجمہ پڑھنے سے قرآن (حدیث) حل نہیں ہو سکتا۔

(خلاصہ یہ کہ) لیڈر علماء سے پوچھ کر کام کریں (یعنی) تجربہ کا کام لیڈر کریں اور کام کرنے سے قبل علماء سے جائز و ناجائز معلوم کر لیا کریں۔ (التبیغ الحدود والقویود الافتراضات ص ۱۲۳)

## نام نہاد لیڈروں کی بدحالی

آج کل کے لیڈر اکثر عقل سے کوئے ہیں۔ جب عقل صحیح نہیں پھر ایسی عقل میں اسلامی احکام کیسے آئیں..... پھر نماز نہیں، روزہ نہیں، زہد نہیں، تقویٰ نہیں، ان اعمال سے بھی عقل میں نور پیدا ہوتا ہے..... پھر دعویٰ بھی ہے کہ ہم قوم کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ ایسے (لیڈروں) کی بدولت مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے ہر روز ایک نیا لباس بدل کر پلیٹ فارموں پر آکھڑے ہوئے ہیں۔ (ملحوظات ص ۵/۸۲، ۵/۸۲) اصلاح اسلامیں ص ۵۲

اگر کہا جاتا ہے کہ تم خود عمل کر کے دکھلاؤ پہلے اپنی اصلاح کرو کیونکہ تمہارا نہ ظاہر ٹھیک ہے نہ باطن، نہ صورت، نہ سیرت، اور مسلمانوں کے رہبر اور مقتدا بنتے ہو؟ تو جواب میں کہتے ہیں کہ آپ ذاتیات پر حملہ کرتے ہیں۔ ارے بھلے مانسو! تم اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر حملہ کرو، احکام الہیہ کے بجائے اپنے دماغ سے تراشی ہوئی باتوں پر عمل کرنے کے لئے دنیا (کے مسلمانوں) کو مجبور کرو۔ اسلامی احکام کی پامالی کرو۔ مگر دوسرا تمہارا کسی حالت پر بھی نوٹس نہ لے، ایسی حالت میں تمہیں ہی دوسروں کو کہنے کیا حق ہے؟ دوسرا تمہاری کیوں ماننے لگے۔ وہ بھی یہی کہہ کر الگ ہو جائے گا کہ میری ذاتیات سے آپ کو کیا بحث، چلو چھٹی ہوئی۔ آدمی کچھ تو عقل سے کام لے۔

(ایسے لوگوں) کی بڑی دوڑیہ ہوتی ہے کہ کوئی جلسہ (ہنگامہ) کر لیا، دو چار ریز رویش پاس کر لئے۔ (ایسے ہی لوگ) دین کے پکے دشمن ہیں۔ دوستی کے پرده میں دشمنی کر رہے ہیں۔ احکام اسلام کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں..... ہاتھ دھو کر اسلام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں..... اور قوم کے خیر خواہ، رہبر، مقتدا بنے ہوئے ہیں۔ اسلام کو غیروں سے شکایت نہیں اس کو تو مسلمانوں ہی سے شکایت ہے۔

## طلبه مدارس کی سیاست میں شرکت

سخت افسوس ہے کہ بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ علم دین میں مشغول ہونے کو فضول اور بے کار سمجھتے ہیں نہ معلوم یہ سبق کہاں سے حاصل کیا ہے یورپ میں بھی تو یہ طریقہ نہیں، وہاں بھی بعض اوقات اس قسم کی (سیاسی) تحریکات ہوتی ہیں مگر جو جماعت علم حاصل کرنے میں مشغول ہے اس کو ان تحریکات میں شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی۔ (الافتراض ص ۱۳ ج ۱)

میری رائے ہے کہ کسی تحریک میں بھی طالب علم کو شرکت کی اجازت نہ ہونا چاہئے۔ آئندہ کے لئے اس میں سخت نقصان ہے جو اس وقت محسوس نہیں ہوتی۔ آخر میں پوچھتا ہوں کہ جب پڑھنے پڑھانے میں کوئی مشغول نہ رہے گا۔ تو پھر کام کرنے والی علماء کی جماعت کہاں سے پیدا ہوگی..... جو کرنا ہے تم ہی کرو۔ طلبہ کو تو اپنے کام میں لگا رہنے دوتا کہ آئندہ دین کے احکام بتلانے والی جماعت کا سلسلہ جاری رہے۔ کیا یہ خیال ہے کہ آئندہ دین کی ضرورت ہی نہیں رہے گی جیسا کہ کہتے ہیں کہ مسائل کا وقت نہیں کام کا وقت ہے..... میں کہتا ہوں اگر دین نہ رہا اور احکام اسلام کو پامال کرنے کے بعد کوئی کام بھی کیا تو وہ کام پھر دین کا نہ ہو گا۔

طلبہ کو اس قسم کی کمیٹیوں اور جلسوں میں شرکت کی اجازت ہرگز ہرگز نہیں دینا چاہئے۔ کیا ان کاموں کے لئے طلبہ ہی رہ گئے ہیں۔ اور مسلمان کچھ کم ہیں ان سے کام لو۔ (الافتراض ص ۹۹ ج ۱، ص ۱۲۱ ج ۱)

## دینی مدارس میں سیاست کی تعلیم

فرمایا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے علوم اولین و آخرین کے جانے والے کے لئے نن یا با غبائی کا مسئلہ تاپیر سے واقف ہونا لازم نہیں (جیسا کہ مشکلۃ شریف کی روایت میں آیا ہے) تو معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی نقص (اور عیب) نہیں۔ پھر غصب ہے کہ نبی کا توفیق سے واقف نہ ہونا کوئی نقص (عیب) نہ ہو۔ اور ایک مولوی یہ چارہ اگر فن سیاست نہ جانتا ہو تو اس کا یہ نقص سمجھا جائے۔ اور اس کو ملامت کا نشانہ بنایا جائے۔

تو تعلیم یافتہوں کی کیا شکایت آج کل کے مولوی خود پھسل گئے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے یہ سامنے خود یہ تجویز پیش کی کہ علماء کو ماہر سیاست ہونا چاہئے۔ ان کو مصروف پہنچایا جائے

بیروت بھیجا جائے۔ تاکہ وہاں کے ماہرین سیاست سے وہ سیاست سیکھ کر آئیں۔ اور یہاں کے مدارس دینیہ میں طلبہ کو سیاست کا باقاعدہ نصاب تجویز کر کے سیاست کا درس دیا کریں۔ میں نے کہا کہ اس کے بجائے کہ یہاں سے علماء وہاں سیاست سیکھنے کے لئے بھیج جائیں، وہاں سے ماہرین سیاست کو تخلوادے کر بلایا جائے اور وہ علماء کے سامنے اپنے سیاسی اصول کو پیش کر کے ان کے متعلق احکام شرعیہ پوچھیں، اور علماء انہیں سیاسی جزئیات کے متعلق شرعی احکامات بتلائیں اس طرح ماہرین سیاست تو ماہر شریعت ماہر ہو جائیں۔ اور ماہرین شریعت ماہر سیاست ہو جائیں۔۔۔۔۔ بس اس وقت توہاں ہاں کرتے رہے پھر وہی خبط۔ (افتتاحیات الیومیہ ۲۷ ج ۱۰)

### مروجہ سیاست میں علماء کے شریک نہ ہونے کی ایک وجہ

ہندوستان میں موجودہ سیاست کا حاصل یہ ہے کہ گورنمنٹ کے قانون کے ماتحت رہ کر اپنے حقوق کی حفاظت کی جائے۔۔۔۔۔ لہذا موجودہ سیاست کے لئے ضروری ہوا کہ گورنمنٹ کے تمام قوانین پر بھی عبور ہو اور انگریزوں (یعنی حکام) کی طبیعت اور مزاج سے بھی پوری واقفیت ہو۔ اور یہ بات پیدا ہوتی ہے ان میں گھل مل کر رہنے سے۔ اور ظاہر ہے کہ علماء ان سب باتوں سے ناواقف ہیں۔ تو یہ اگر سیاست میں بھیثیت لیڈر کام کریں گے تو ان کی ناواقفی کے سبب مسلمانوں کو بجائے نفع کے نقصان پہنچے گا۔ پھر تجربہ شاہد ہے کہ عام سیاسی لیڈر ملکی مصلحتوں کو دین پر مقدم رکھتے ہیں اور جب مصلحت و مذہب میں تعارض ہوتا ہے تو مذہب میں بعید تاویل کرنے میں دربغ نہیں کرتے علماء بھی اس میں بتلا ہو رہے ہیں۔ اور ان کی تاویل چونکہ برنگ دین ہوتی ہے اس لئے وہ عام مسلمانوں کو زیادہ غلطی میں بتلا کرتی ہے۔ (البدائع بدیعہ نیر ۲۰ ص ۲۷)

### علماء کو سیاست میں حصہ لینا کب ضروری ہے؟

اگر کسی وقت کوئی سیاسی جماعت ایسی نہ ہو جو کہ علماء سے احکام پوچھ پوچھ کر عمل کیا کرے جیسا کہ اس وقت غالب ہے تو اس وقت علماء ایسی جماعت کے پیدا ہونے کے منتظر نہ رہیں ورنہ مجبان دنیا (مفاد پرست لیڈر) دینی مقاصد کو (اور امت کو) تباہ کر دیں گے۔ بلکہ وہ خود اپنے میں سے ایسی جماعت بنائیں جو علم و عمل دونوں میں سیاست و شریعت کے

جامع ہوں۔ مگر یہ حکم سیاست مدنیہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سیاست بدنیہ یعنی طب بلکہ اسباب معاش میں سے جتنے فرض کفایہ ہیں، مثلاً تجارت، زراعت سب کا یہی حکم ہو گا۔ اور ان سب مفاسد کی اصلاح کے لئے جماعت کا انتظام کرنا ہر حال میں استطاعت کے ساتھ مشروط ہو گا یا ایک کلی تحقیق ہے۔ (البدائع ص ۲۲، افادات اشرفی ص ۹۵)

### علماء کی سیاسی جماعت کا طریقہ کار

اس وقت طریقہ کار یہ مفید ہو سکتا ہے ہے کہ سیاسی جماعت علیحدہ ہو اور مذہبی علیحدہ۔ اور مذہبی جماعت اپنا اصلی کام تبلیغ کا اس طرح انجام دے کہ مسلمانوں کی سیاست جماعت کی نگرانی کرے کہ یہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے حقوق گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے وقت شریعت کے خلاف عمل نہ کر بیٹھے اور چونکہ موجودہ زمانہ میں سیاسی جماعت مذہبی جماعت سے پوچھ کر عمل کرنے کی عادی نہیں رہی، اس لئے علماء کے ذمہ ہے کہ خود اس جماعت کے پاس پہنچیں اور احسن طریقہ سے تبلیغ کریں۔

اگر علماء اپنا اصلی کام تبلیغ رکھتے تو عظمت و وقار میں چار چاند لگ جاتے۔ اگر علماء حضرات تبلیغ فرمائیں تو سنجاتے اور ان کو مفید مشورے اور طریقہ کار سے رہنمائی کرتے تو اس طرز میں شرعی طریقہ پر مسلمانوں کے حقوق (ان کے جان و مال) کی حفاظت بھی ہوتی اور علماء کی عظمت بھی بڑھتی۔ (البدائع ص ۲۸)

### سیاست میں کفار مشرکین سے مدد لینے اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا شرعی حکم

فِي شَرِحِ السِّيرِ الْكَبِيرِ بَابُ السَّيَّانِهِ بِأهْلِ الشَّرْكِ وَاسْتِعَانَهُ  
الْمُشْرِكِينَ بِالْمُسْلِمِينَ..... وَلَا بَاسَ بِأَنْ يَسْتَعِينَ الْمُسْلِمُونَ بِأَهْلِ  
الشَّرْكِ عَلَى أَهْلِ الشَّرْكِ إِذَا كَانَ الْإِسْلَامُ بِوَالظَّاهِرِ.

اس روایت کا حاصل یہ کہ کفار کے ساتھ ایسے معاملات میں (معنی سیاسی امور میں کفار..... کے ساتھ) شرکت کی شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے تابع ہوں، اور اگر وہ ہمارے تابع

نہ ہوں خواہ متبوع ہوں (یعنی ہم ان کے تابع ہوں) یادوں تو قوت عمل میں برابر ہوں تو ان کے ساتھ شرکت جائز نہیں۔ جس کی وجہ سے اسی روایت میں مذکور ہے کہ جب انہیں بھی مستقل قوت حاصل ہے تو شرکت میں اندیشہ ہے کہ جب مجموعی قوت سے ان کا مقابل مغلوب ہو جائے پھر وہ اپنی قوت سے مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں۔

اور اگر کہیں اس شرط کے خلاف ہوا ہے جیسے ایک غنیم کے مقابلہ میں نجاشی کی مدد حضرات صحابہ نے لی تو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ نجاشی اس وقت مسلمان ہو گئے تھے یا یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت میں کسی پناہ کی حاجت تھی اور نجاشی نسبت اس غنیم کے مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید تھے اس لئے اس موقع پر وہ شرط نہیں رہی یہ حاصل ہے روایت کا۔ (معاملہ اسلامیں ص ۳۱، اشرف السوانح ص ۲۰۳/۲)

### فاسقوں فاجر و بدقیقیوں کی ساتھ مل کر کام کرنی کا حکم

کہاں اصل ایمان کا فقدان اور کہاں فروع اعمال کا نقصان (اول میں تو سرے سے ایمان ہی نہیں، دوسرے میں ایمان کے ساتھ صرف اعمال کی کوتاہی ہے) ایک کا قیاس دوسرے پر محض فاسد، اور قیاس مع الفارق ہے خصوصاً جب کہ اس دوسرے نقصان کی اصلاح کی توقع بھی ہو۔  
شرح سیر کبیر سے ایک روایت نقل کرتا ہوں (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خواہ فاسق، فاجر، بدعتی، خارجی ہی کیوں نہ ہو) حریبوں کے مقابل میں ان کے ساتھ مل کر کوشش کرنا درست ہے۔

### وَفِي شَرْحِ السَّيْرِ وَلَا بَاسَ بِإِنْ يَقَاتِلَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ أَهْلِ الْعَدْلِ مَعَ الْخَوَارِجِ الْمُشْرِكِينَ مِنْ أَهْلِ الْحَرْبِ (ص ۳/۲۲۱)

اور ظاہر ہے کہ اہل مسلم کی کوتاہیاں خوارج کی بد دینی کے درجہ تک تو نہیں۔ پھر جب کفار کے مقابلہ کے لئے خوارج کے ساتھ (جن کی امانت بھی مکروہ ہوتی ہے) اشتراک عمل (یعنی ان کے ساتھ مل کر کام کرنا) جائز ہے تو مسلم لیگ کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔  
(الطريق الامم بالحقه افادات اشرف ص ۸۰)

## سیاست میں کافر کی اقتداء

ایک صاحب نے عرض کیا کہ اگر ایک شخص سیاست کا ماہر ہے مگر ہے کافر، اگر اس میں اس کی اقتداء کر لی جائے تو کیا حرج ہے؟ فرمایا اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ اگر کافر نماز خوب جانتا ہو۔ اور مسلمان نہ جانتا ہو تو اس کافر کی اقتداء جائز ہے؟

شبہ کا منشایہ ہے کہ سیاست کو لوگ دین نہیں سمجھتے خود یہی سخت غلطی اور بڑی جہالت ہے، سیاست بھی تو دین ہی ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسلام نے سیاست کی تعلیم نہیں کی، یہ کتنی بڑی تحریف ہے پھر دین میں کافر کی اقتداء کرنے کا کیا مطلب؟ نیز کیا اس میں اسلام اور مسلمانوں کی اہانت (ذلت) نہیں ہے؟ اور کیا کوئی شخص کہیں یہ بات دکھلا سکتا ہے۔ کہ اس طرح سے اسلام اور مسلمانوں کی اہانت کرانا اور ان کو ذلیل کرانا جائز ہے؟ اور کیا مسلمانوں میں ایسا کوئی نہیں جو سیاست جانتا ہو۔

البتہ اس طریقے سے ان کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں کہ کافر تابع اور مسلمان متبع (یعنی کافر مسلمان کی اتباع کرتے ہوں تو درست ہے) (الافتادات الیومیہ ص ۱۵۲/۳)

### فصل

موجودہ حالات میں کس جماعت کے ساتھ مل کر کام کریں  
شرعی احکام و قسم کے ہیں ایک اصلی دوسرے عارضی یعنی احکام کبھی کسی شی کی ذات پر نظر کر کے مرتب ہوتے ہیں، اور کبھی عوارض (یعنی عارضی حالات) پر نظر کر کے اور ان دونوں قسم کے احکام باہم مختلف بھی ہو جاتے ہیں۔ (بودارالنواور ص ۲۱/۲)

(مثال کے طور پر) مسجد الحرام میں جب تک مشرکین مکہ مسلط (اور غالب) رہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وہاں نماز بھی بیت اللہ کا طواف بھی فرماتے رہے۔ اسی درمیان میں وہ زمانہ بھی آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے عمرہ کے لئے مکہ تشریف لائے اور مشرکین نے آنے نہیں دیا۔ پھر اس پر صلح ہوئی کہ تین روز کے لئے تشریف لائیں اور عمرہ کر کے چلے جائیں آپ نے اس صلح کو قبول فرمایا اور محمد و دو قوت تک

قیام فرمائے اپنے تشریف لے گئے یہ سب اس وقت ہوا جب آپ کا سلطان (غلبہ) نہ تھا، ندر کی حالت میں آپ نے اس عارضی حکم پر عمل فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو باقاعدہ سلطان فرمادیا اس وقت اصلیٰ حکم پر عمل فرمایا۔ (امداد القتاوی، فتنہ ختنی کے اصول ص ۶۲)

اور یہ شرعی و عقلی قاعدہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے ضرر (نقصان) جمع ہوں ایک اشد (نگین) دوسرا اہون (یعنی کم درجہ کا) تو اہون کو اختیار کر لینا چاہئے یعنی جہاں دونوں شقتوں میں مفسدہ ہو مگر ایک میں اشد، ایک میں اخف تو اشد سے بچنے کے لئے یا اس کو دفع کرنے کے لئے اخف (ہلکے) کو گوارہ کر لیا جاتا ہے اور ہے تو یہ بھی برا مگر دوسرے مفسدہ کے مقابلہ میں پھر بھی اخف ہے۔ (ملفوظات اشرفی ص ۳۲، افادات اشرفی ص ۳۲)

(اس کے بعد سمجھئے) کہ موجودہ حالات میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ مسلمانوں کی ایسی جماعت (جو خالص اسلامی جماعت..... اور غلبہ و قوت والی ہونے موجود ہے نہ قریب میں اس کی توقع ہے۔

(اس لئے ایسے حالات میں عارضی حکم یہی ہے اور) اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ (مسلمان) موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور تو اعد شرعیہ کی رو سے ان میں جو نقش ہو اس کی اصلاح کریں اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان ہو اور دوسرے کی دشوار ہو تو مذکورہ قاعدہ کے مطابق اس میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہے۔

بس مسلمانوں کو اطمینان و توکل کے ساتھ (ایسی ہی) جماعت میں داخل ہو جانا چاہئے پھر ان میں جو اہل قوت و اہل اثر ہیں ان کو اپنی قوت و اثر سے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے اور اصلاح کے طریقوں میں علماء محققین سے مدد لیتے رہیں، (یہ حکم عارضی ہے) اور جب کوئی جماعت مسلمہ منظم، صاحب قوت صاحب اثر تیار ہو جائے..... (اس کے ساتھ) مل کر کام کریں، موافق مخاطب ہر ایک کے ساتھ اسلامی اخلاق کو اپنا شعار رکھیں۔ (تنظيم اسلامی، افادات اشرفی ص ۷۲، ۷۳، ۷۴)

موجودہ پارٹیوں میں سے کسی پارٹی میں

شریک ہونے کا شرعی ضابطہ

وَاعْتَحِمُوا بِعَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ موجودہ فضائیں مسلمانوں کو شدید استحکام (مضبوطی) کے ساتھ منتظم ہونے کی سخت ضرورت ہے اور ان کے تمام مصالح و منافع کی حفاظت اور تمام مضر و مفاسد سے صیانت (یعنی ترقی کرنے اور نقصان سے بچنے کی مدد و میری) اسی تنظیم پر موقوف ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی ہر مسلمان پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ تنظیم حسب قدرت احکام شرعیہ کے بالکل موافق ہو۔ اگر اس وقت ملک میں اس صفت کی کوئی منتظم جماعت موجود ہوتی یا قریب میں اس کی توقع ہوتی تو جواب واضح تھا۔ لیکن موجودہ حالت میں نہایت افسوس ہے کہ ایسی جماعت کا نہ تھقق ہے۔ نہ قریب میں توقع۔ اس لئے اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور قواعد شرعیہ کی رو سے۔ اس میں جو نقص (غلط کام) ہو، (حسب قدرت) اس کی اصلاح کریں اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان اور دوسرے کی دشوار ہو (یا ایک میں ضرر زیادہ ہو دوسرے میں کم ہو) تو اس میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہو۔ بـہ قاعدہ عقلیہ و نقلیہ مـن اہـلی بـلـیـتـیـن فـلـیـخـرـاـہـوـنـہـا (اقاـدـاتـاـشـرـفـیـسـ ۲۲)

یہ قاعدہ شرعیہ ہے کہ جس جگہ وہ قسم کے ضرر جمع ہوں ایک اشد (سخت) دوسرا ہوں (ہلکا) تو اشد سے بچنے کے لئے اس کو دفع کرنے کے لئے اہون (ہلکے) کو اختیار کرنا چاہئے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۳۲۰، ۳۲۱، کمالات اشراقی ص ۱۱۵، افادات اشراقی ص ۳۲)

کسی سیاسی جماعت میں شریک ہونے کے بعد

علماء و عوام کے لئے لائے عمل اور ضروری ہدایت

موجودہ حالت میں اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ موجودہ (سیاسی) جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں..... اس لئے میری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اطمینان

دوکل کے ساتھ ایسی جماعت) میں داخل ہو جانا چاہئے جس کی اصلاح آسان ہے۔

- ۱- (پھر) قواعد شرعیہ کی رو سے اس جماعت میں جو شخص (خربیاں) ہوں اس کی اصلاح کریں۔
- ۲- جو لوگ اہل قوت اور اثر والے ہیں ان کو اپنی قوت و اثر سے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے۔
- ۳- اور جو اہل قوت نہیں (جن کا اثر نہیں ان کو چاہئے کہ) وہ اہل قوت کو وقتاً فوقتاً یاد دہانی کر کے تقاضے کے ساتھ ان سے اصلاح کی درخواست کرتے رہیں۔
- ۴- اور اصلاح کے طریقوں میں علماء محققین سے مدد لیتے رہیں۔
- ۵- جو علماء اس میں شریک ہوں ان سے تعلیمی و عملی دونوں قسم کی امداد حاصل کریں۔
- ۶- اور جو علماء اس میں کسی مصلحت یا اعذر سے باضابطہ شریک نہ ہوں ان سے صرف علمی مدد لیں یعنی ان سے واقعات (اور صورت حال) ظاہر کر کے شرعی احکام معلوم کرتے رہیں اور ان کے موافق حالت کو درست کرتے رہیں۔
- ۷- اور جو علماء باضابطہ کسی جماعت میں شریک نہ ہوں وہ بھی بیکار نہ رہیں، بلکہ وہ اس سے اہم خدمت میں مشغول رہیں۔ اور وہ خدمت ہے خدا کے بندوں کو احکام شرعیہ کی تعلیم و ترغیب دینے کی جو مشترک طریقہ ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا۔
- ۸- بلکہ پہلی قسم کے علماء (جو باضابطہ سیاسی جماعت میں شریک ہیں ان) کو بھی جتنا وقت خدمت سے بچے احکام کی اشاعت میں حصہ لینا ضروری ہے۔
- ۹- اپنی تنظیم کو ہمیشہ ہمیشہ مستقلًا جاری و باقی رکھیں۔ اس کو کمزور نہ کریں۔

سب حالات میں قول و عمل، تقریر و تحریر میں موافق و مخالف ہر ایک کے ساتھ اسلامی اخلاق کو اپنا شعار رکھیں۔

خلاصہ دستور العمل یہ ہے کہ ..... رضاۓ حق کو مطیع نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں۔ اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں اس کا پورا الحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پائے۔ یہی عبادیت کی روح اور حیات مسلم کی اصل الاصول ہے۔ اور اس استقلال و استقامت کے ساتھ دعا و ابہال کو اصل وظیفہ و تدبیر سمجھیں۔ اور پھر حق تعالیٰ کی

نصرت کے منتظر ہیں اور ایک دعا بھی نماز کے بعد و درکھنے کے قابل ہے۔

اللهم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم و جعلنا منہم  
واخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلنا منہم  
(آمین) (تنظيم المسلمين، امداد الفتاوی ص ۶۳۰/۳)

### سیاسی اختلاف

## سیاسی مسائل میں اختلاف کی بنیاد

بعض مسائل تو قطعی ہوتے ہیں ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی، اور بعض مسائل اجتہادی ظنی ہوتے ہیں ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے استاذ کے ساتھ، مرید نے پیر کے ساتھ، چھوٹی جماعت نے بڑی جماعت کے ساتھ، ایک نے کئی کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور علمائے امت نے اس پر نکیر نہیں فرمائی اور نہ ایک نے دوسرے کو گراہ گنہگار کہا، نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا۔ نہ اختلاف کے ہوتے ہوئے بغض عداوت، ہوا، نہ مناظرہ پر اصرار کیا گیا۔ چنانچہ مشاجرات میں صحابہ کا اختلاف اور علیحدہ رہنے والوں کی علیحدگی کو سب کا جائز رکھنا معلوم ہے۔

ایسے ظنی اجتہادی مسائل میں اختلاف دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک دلائل کے اختلاف سے جیسے حنفی شافعی میں قرأت فاتح خلف الامام کے مسئلہ میں۔ دوسرے واقعات (حالات) یا عوارض کے اختلاف سے جیسے امام صاحب اور صاحبین نے صائبات کے مسئلہ میں کہ جن کی تحقیق یہ ہے کہ وہ اہل کتاب میں سے ہیں انہوں نے ان سے نکاح کو جائز رکھا اور جن کی تحقیق یہ ہے کہ وہ اہل کتاب میں سے نہیں انہوں نے اس نکاح کو ناجائز رکھا۔ تو یہ واقعہ کی تحقیق میں اختلاف ہوا کہ وہ اہل کتاب میں ہیں یا نہیں۔ اس لئے فتوی میں اختلاف ہوا، سیاسی مسائل میں بھی اختلاف کی تھی دو بنیادیں ہوتی ہیں۔ (سیاست حاضرہ ص ۵)

## سیاسی اجتہادی مسائل میں اختلاف کا حکم

اس تمهید سے امور ذیل معلوم ہوئے۔

ایک یہ کہ اس (قسم) کے اختلاف قطعی نہیں ظنی اجتہادی ہیں پس ان میں اختلاف کی گنجائش ہے گو کوئی چھوٹے درجہ کا طالب علم ہی کسی بڑے عالم کے ساتھ اختلاف کرے۔ محض اس اختلاف سے کسی فریق (جماعت) کو دوسرے فریق پر عن طعن سب و شتم (برا بھلا کہنا) یا اس کو کافر، فاسق کہنا یا ظلم و زیادتی کرنا، ایذا پہنچانا، زبان سے یا عمل سے، یا کسی بزرگ کا مخالف و بے ادب مشہور کر کے بدنام کرنا جائز نہیں۔

البته منکرات شرعیہ پر انکار اور اس کی برائی کرنا یہ واجب ہے اس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں۔ (سیاست حاضرہ، افادات اشرفیہ ص ۷)

## سیاسی امور میں اہل حق کا مسلک

سیاسی مسائل میں جب تک کسی قطعی فیصلہ کی شرعی ضرورت نہ ہو سکوت (یعنی خاموش رہنا ہی) مصلحت ہے۔

اس درسگاہ کا مسلک مختصر الفاظ میں ہمیشہ یہ رہا اور ہے کہ اس نے نہ اعلان حق میں کبھی دریغ کیا نہ عمل میں کبھی نمائش اور ہنگامہ آرائی کو دخل دیا اس کی جماعت جس طرح شورش پسند نہیں ہے۔ اسی طرح کسی اثر سے متاثر ہو کر کتنا حق کرنے والی (یعنی حق کو چھپانے والی) بھی نہیں ہے یا اس کا قدیم جماعتی مسلک ہے جس پر کسی انفرادی یا شخصی عمل کی ذمہ داری نہ کبھی پہلے عائد ہوئی ہے اور نہ اب ہو سکتی ہے۔ (معاملۃ المسلمين ص ۳۲)

## سیاسی مسئلہ میں شرعی حکم میں اگر علماء کا اختلاف ہو جائے

جو معاملات پیش آئیں ان کے متعلق اگر علماء میں اختلاف ہو تو جو علماء کسی جماعت میں باضابطہ شریک نہ ہوں ان سے استفتاء کیا جائے۔

اور ان میں بھی اگر اختلاف ہو جائے تو شرعاً دونوں شقوق میں گنجائش کبھی جائے۔ اور دونوں شقوق (صورتوں) میں سے مدبروں (جن کو سیاسی تجربہ حاصل ہے اور اللہ نے انہیں عقل سلیم دی ہے ان کے) نزدیک جو مصلحت ہو اس پر عمل کیا جائے۔ (تنظيم المسلمين، اہد الاتقاؤی ص ۲۲۹ ج ۲)

## سیاسی مسائل میں عوام کس کے فتوے پر عمل کریں

سوال:- اگر کسی ایک عالم یا علماء کی جماعت نے افعال مذکورہ میں شرکت یا موافقت کا فتویٰ دے دیا خواہ کسی فاسد غرض سے یا خلوص کے ساتھ اجتہادی غلطی سے..... مگر بہت سے علماء اس فتویٰ سے متفق بھی نہیں تو کیا سب مسلمانوں پر اس فتوے پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے یا جس سے جس کو اعتقاد ہو اس کے فتویٰ پر عمل کر سکتا ہے اور کیا چند علماء سے خواہ وہ اکثر ہوں اتفاق کر لینا اجماع میں داخل ہوگا جس کی مخالفت ناجائز ہوتی ہے۔

الجواب:- ایسا فتویٰ سب پر جلت نہیں، ہر شخص کو جائز ہے کہ جس عالم سے عقیدت ہو اس کے فتوے پر عمل کرے..... اور جواز شرکت کا فتویٰ دینے والوں کے قول میں اگر تاویل ہی کر دی جائے تو غیمت ہے۔ مثلاً یہ کہ ان کی نیت نیک ہوگی، اور ان مفاسد پر ان کی نظر نہ ہوگی۔ اور اس کو اجماع تو کسی طرح کہہ ہی نہیں سکتے۔

اجتہادی مسائل میں ایک شق کو درست سمجھنا اور دوسری شق پر ملامت کرنا، ظلم و تعدی (حد سے آگے بڑھنے) کا مصدقہ ہے۔ (معاملات اسلامیں، افادات اشرفی ص ۲۲)

ممکن ہے کوئی اپنے اجتہاد سے کسی مصلحت سے (کسی سیاسی نظریہ کو) ضروری کہہ دے مگر وہ وجوب اجتہادی ہوگا دوسرے پر جلت نہیں۔ (افادات اشرفی ص ۱۰)

## سیاست کے شرعی احکام

یا تو قتال یا پھر صبر اس کے علاوہ بھوک ہڑتال

جیل بھر و تحریک شرعی حکم کے خلاف ہے

فرمایا شریعت میں دو ہی صورتیں ہیں قوت کے وقت مقابلہ اور عاجزی کے وقت صبر، خدا معلوم، یہ تیسری صورت بخوبی گرفتار ہو جانے کی کہاں سے نکال لی۔

فرمایا شرعی دستور العمل یہ ہے کہ اگر قدرت ہو تو قتال کریں اور اگر قدرت نہیں ہے تو صبر کریں۔ اور درمیانی صورتیں مثلاً جھوٹوں کا جیل جانا، پٹنا، بھوک ہڑتال وغیرہ سب نصوص

کے مقابلہ میں اجتہاد ہے اور نصوص کے خلاف اجتہاد کرنے میں بہت بڑا حرج ہے۔ اگر خود کشی سے کسی کو فائدہ پہنچے تب بھی خود کشی جائز نہیں چہ جائیکہ کوئی فائدہ بھی نہ پہنچے تو اس کا درجہ ظاہر ہے۔ یعنی اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خود کشی کرنے سے کفار پر اثر ہو گا تو کیا خود کشی کرنا جائز ہو جائے گا؟ اگر خود کشی پر کوئی نفع بھی مرتب ہو تو یہ خود اتنا زبردست نقصان ہے جس کا پھر کوئی بدل نہیں۔

نیز ہر نفع کا اعتبار نہیں اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی شخص یوں کہے کہ اگر تم کنویں میں گرجاؤ تو فلاں شخص کی جان بچ سکتی ہے تو کیا اس کی جان بچانے کی غرض سے کنویں میں گرجانا جائز ہے؟ نیز قدرت علی اضرار الخصم (یعنی اپنے مخالف فریق کو نقصان پہنچانے کی قدرت) یہ ہے کہ جس میں خصم کا کوئی معتدبہ (لائق اعتبار) نقصان ہو اور اس کے ساتھ اپنا کوئی لیقی ضرر نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جیل وغیرہ جانے میں اپنا تو ضرر ہے۔ اور ان کا کوئی معتدبہ (خاص) ضرر نہیں۔

نیز قدرت کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں اس پر قدرت ہے لیکن اس کے کر لینے کے بعد جن خطرات کا سامنا ہو گا ان کے دفع کرنے پر قدرت نہیں۔ دوسرے یہ کہ فعل پر قدرت ہے اور پھر جو خطرات پیش آئیں گے ان کے دفع کرنے پر بھی قدرت کا عادتاً ظن غالب ہو، پہلی صورت استطاعت لغویہ ہے دوسری صورت استطاعت شرعیہ ہے۔

مدافعت کی فرضیت کیلئے استطاعت شرعیہ شرط ہے۔ (یعنی دوسری قسم کی قدرت) استطاعت لغویہ کافی نہیں..... نیز ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں بدلانہ ہو جائیں۔ (ملفوظات اشرفیہ ص ۷۹ طبع پاکستان)

## کافروں سے باریکاٹ اور ان سے قطعًا معاملات نہ کرنے کا شرعی حکم

باریکاٹ یا نان کا اپریشن جہاد کے افراد میں سے نہیں..... بلکہ مقاومت (ومقابلہ) کی مستقل مددیریں جو مباح ہیں کرنا چاہئے۔ اور ممکن ہے کہ کوئی اپنے اجتہاد سے کسی ضروری

مصلحت سے ضروری بھی کہہ دے مگر وہ وجوب اجتہادی ہو گا دوسرے پر جنت نہیں، اور اس کو واجبات مقصودہ شرعیہ سے نہیں کہا جا سکتا۔

(شرعی حکم تو یہ ہے کہ) بعض خاص تجارتوں کے علاوہ سب چیزوں کی خرید و فروخت کا معاملہ اہل حرب (یعنی حربی کافر) تک کے ساتھ بھی جائز ہے چہ جائیکہ معاہدین کے ساتھ (جن کے ساتھ صلح و معاہدہ ہوا ہو) شرح سیر کیرج سوم میں اس کی تصریح موجود ہے۔

باب ما یکرہ ادخال دارالحرب الا انه لا باس بذالک فی الطعام

والشیاب و نحو ذالک

اس وقت گاڑھا اور ولایتی کپڑا پہننے کا سوال اکثر ہوتا ہے اگر اس کی بناء (مقصد) بائیکاٹ ہے تب تو اس کا حکم وہی ہے جو اوپر گزر چکا ہے اور اگر اس سے قطع نظر یوں ہی (یعنی بائیکاٹ کے بغیر) ہے تو دونوں میں اباحت ہے (خواہ پہنے یا نہ پہنے) مگر قبہ نہ ہندوؤں کے ساتھ جائز ہے نہ انگریزوں کے ساتھ۔ (آفادات اشرفیہ در مسائل سیاریہ ص ۲۷، ۲۸، ۲۹)

**ہڑتاں کرنے کا شرعی حکم**

سوال:۔ اپنے رہبروں (علماء لیڈروں) کی گرفتاری وغیرہ کے موقع پر ہڑتاں کر دینا یعنی دکانیں بند کرانا اگرچہ کسی کو دکان بند کرنے سے فاقہ ہی کی نوبت آجائے اور جو شخص ان مقاطعہت اور احتجاجات میں شریک نہ ہو اس کو تکلیف پہنچاتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات موقع پاکر مار پیٹ میں بھی در لغ نہ کریں۔ شریعت میں اس کا کیا حکم ہے۔

الجواب:۔ اس میں بھی وہی خرابیاں ہیں جو نمبر ۳ میں مذکور ہوئیں اور اگر ان احتجاجات میں شرکت نہ کرنے پر جسمانی ایذا (تکلیف پہنچانے) کی بھی نوبت آجائے تو اس کا گناہ مالی نقصان سے بھی زیادہ سخت اور اسلام تقاضے کے منافی ہے۔

قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم المُسْلِمُ مِنْ سُلْمِ الْمُسْلِمِوْنَ

حضرور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کامل مسلمان وہ ہے جو کہ دوسرے مسلمان اس کی زبان و ہاتھ سے محفوظ ہوں اور مومن تو وہی ہے کہ جس سے لوگ اپنے مالوں اور جانوں کے حق میں مطمئن ہوں۔“

پھر ان مقاطعات (بائیکاٹ) پر مجبور کرنے میں یہ ظالم خود اپنے تسلیم کر دہ قانون آزادی کے بھی خلاف کر رہے ہیں، ورنہ کیا وجہ ہے کہ اپنی آزادی کی تو کوشش کریں اور دوسروں کی آزادی کو ختم کریں۔ (اقادات اشرفیہ ص ۲۲، درسائل سیاسیہ ص ۲۸)

### شرعی قاعدہ کا مقتضی

فرمایا جن چیزوں کی خیر القرون میں حاجت نہیں ہوئی اور خیر القرون کے بعد وہ حاجت پیش آئی اور نصوص ان کے خلاف نہ ہوں وہ تو مسکوت عنہا ہو سکتی ہے۔ اور حکام کے مظالم تو ہمیشہ پیش آتے رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی نصوص میں جہاد یا صبر ہی کا حکم ہے تو اس اعتبار سے یہی گھڑی ہوئی۔ تدبیر مسکوت عنہا ہوں گی بلکہ منی عنہا (یعنی منع) ہوں گی کہ باوجود ضرورت کے معتقد میں نے ان کو ترک کیا تو اجماع ہوا، اس کے ترک پر اس لئے منوع ہیں۔ (ملفوظات کمالات اشرفیہ ص ۷۷)

### از خود بھوکارہ کر جان دے دینے کا شرعی حکم

سوال:۔ اگر کوئی گرفتار ہو جائے ان میں سے بعض لوگ جیل خانہ میں مقابلہ جوئی کرتے ہیں یعنی بھوک کی ہڑتاں کرتے ہیں یعنی کھانا نہیں کھاتے یہاں تک کہ مر جاتے ہیں اور قوم میں ان کی تعریف کی جاتی ہے۔

الجواب:۔ اس کا خود کشی اور حرام ہونا ظاہر ہے۔

قال اللہ تعالیٰ وَلَا تَقْتُلُوْا اَنفُسَكُمْ

کتب فقہہ ہدایہ وغیرہ میں تصریح ہے کہ جان بچانا اس درجہ فرض ہے کہ اگر حالت اضطرار میں مر جانے کا اندیشہ ہوا اور مردار کھانے سے جان نجی سکتی ہو اس کا نہ کھانا اور جان دے دینا معصیت (اور گناہ) ہے چہ جائیکہ حلال کھانا چھوڑ کر جان دے دینا۔

اور اس فعل کی تعریف کرنے میں تو کفر کا اندیشہ ہے کہ شریعت کی صریح تکذیب ہے کہ شریعت جس چیز کو مذموم کہتی ہے یہ اس کو محدود کہتا ہے۔ (اقادات اشرفیہ ص ۲۳، ۳۹)

## حکومت کے خلاف بائیکاٹ کرنے اور حکومت کی قانون شکنی کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ملک ہندوستان میں ایک غیر مسلم قوم حکراں ہے اس سے آزادی حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تدبیریں اختیار کرنے کا شرعی حکم کیا ہے؟

۱:- حکومت کی قانون شکنی کی جائے گو وہ قانون نفسہ مباح ہو یعنی اس کے ماننے سے کسی واجب کا چھوڑنا یا حرام کا ارتکاب لازم نہ آئے اور اگر حکومت اس پر ختنی کرے تو بھی مدافعت نہ کرے نہ مقابلہ سے نہ قانون شکنی سے باز آنے سے گواں اصرار سے بعض اوقات ہلاکت تک کی نوبت آجائے، حالانکہ قانون شکنی سے بچ کر اپنی جان کی حفاظت ہو سکتی تھی۔

۲:- حکومت سے معاملات میں مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا جائے یعنی نہ ان کی نوکری کریں اگرچہ جائز ہی نوکری ہو، اور اگرچہ دوسرے ذرائع معاش کے نہ پائے جانے سے اور نوکری نہ کرنے سے کتنی ہی تنگی ہو، اور اس کی تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کی جائے اگرچہ وہ تعلیم مباح ہی ہو، اور نہ اس کے ملک کی تجارتی اشیاء خریدی جائیں۔

۳:- جن دکانوں پر ایسی چیزوں کی تجارت ہوتی ہے ان پر پہرے دار مقرر کئے جائیں کہ وہ خریداروں کو جس طرح ممکن ہو روکیں..... نہ مانیں تو راستے میں لیٹ جائیں تاکہ وہ مجبور ہو جائیں، اگر خرید چکے ہوں تو ان کو واپسی پر مجبور کریں، گو دکاندار خوشی سے واپس نہ کرے اسی طرح دکانداروں کو ایسی چیزوں کی تجارت بند کرنے پر مجبور کریں اگر وہ نہ مانیں تو اس کو طرح طرح کی تدبیروں سے نقصان پہنچائیں۔ دھمکیاں دیں گواں دکاندار کے پاس اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہو۔

الجواب:- یہ افعال شرعاً جائز نہیں اور مسلمانوں کو ایسے افعال کا ارتکاب جائز نہیں

۱:- حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں۔

وَلَا تُلْقُوا إِلَيْنَا مِنْهُمْ إِلَّا مَنْ تَهْلِكَتْ

اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔

اور جس حالت میں اس قانون پر عمل کرنا شرعاً جائز ہو تو بلا ضرورت ایسی قانون شکنی کا انجام ہلاکت ہے۔

۲:- یہ مقاطعہ (بایکاٹ) بعض اوقات واجب کے چھوڑنے کا ذریعہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کے پاس جائز نوکری یا کسی خاص تجارت کے علاوہ دوسرا کوئی ذریعہ معاش نہیں اور اہل و عیال کے حقوق کی ادائیگی کے لئے اس پر کمانا واجب ہے تو اس بایکاٹ سے اس واجب کا ترک لازم آتا ہے اور واجب کا ترک معصیت ہے۔

اور جن مقاطعات میں واجب کا ترک لازم نہ بھی آتا ہو مگر حکومت سے عداوت لازم آتی ہے اور بلا ضرورت شرعیہ کمزور کے لئے جائز نہیں کہ قوی (طاقتور) کو اپنا دشمن بنالے کہ اس میں بھی اپنے کو مصیبت میں ڈالنا ہے..... اور اس پر کسی کو مجبور کرنا ظلم و اکراہ ہے جس کا حرام ہونا ظاہر ہے۔

۳:- یہ صورت بھی کہی گناہوں پر مشتمل ہے، ایک مباح فعل کے ترک پر مجبور کرنا۔ دسرے خرید فروخت پوری ہو جانے کے بعد واپسی پر مجبور کرنا اور زیادہ گناہ ہے کیوں کہ اس میں شرعاً متعاقدین (یعنی خریدنے والے) کی رضامندی شرط ہے، تیرے نہ ماننے والوں کو تکلیف دینا جو کہ صریح ظلم ہے، چوتھے اہل و عیال کو تکلیف پہنچانا کہ یہ بھی ظلم ہے۔ (افادات اشرفیہ ۲۷)

### خلاف قانون گولہ، بارود بھم بنانا

سوال:- سکہ ڈھالنا یا بندوق کی بارود بلا لائسنس بنانا قانوناً تو ناجائز ہے تو کیا شرعاً بھی ناجائز ہے؟ اور کیوں؟

الجواب:- چونکہ اس میں خطرہ ہے اور خطرہ میں پڑنا شرعاً ناجائز ہے۔ اس لئے پہنا واجب ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۱۳۹ ج ۲)

نوت:- جن حالات میں اپنے کو خطرہ میں ڈالنا جائز ہوگا اس وقت اس کا حکم بھی مختلف ہوگا۔ (مرتب)

## کفار کی نہ ملت اور ان کی برائی کرنے کا شرعی حکم

کفار کی نہ ملت مطلقاً معیوب و نہ موم نہیں اگر کسی صحیح غرض کے لئے ہوتا دفاع کے لئے جب قاتل تک جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں واجب وفرض ہے تو ہجوج (یعنی ان کی برائی تحقیر کرنا) اس سے بہت بلکی چیز ہے خصوصاً جب کہ اس کا مقصد اپنے ذاتی دشمنوں سے نہیں بلکہ دشمنان دین سے انتقام لینا ہوا و تجربہ سے اس حریبہ کا موثر اور کارگر ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ ہم کہیں گے تو اس سے زیادہ سنیں گے تو ان کی ہمت ٹوٹ جائے گی تو اس میں مسلمانوں کی حفاظت ہے اور شرروایڈ اسے اہل حق کی حفاظت اعظم اخلاق میں سے ہے..... اس حکمت کی طرف خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ قریب بصراحت فرمایا ہے۔ حیث قال۔

”اہجوا فریشا فانه اشد علیها من شق النبل وقال صلی اللہ علیہ

وسلم ان روح القدس یویدک (رواہ الفتاویٰ ص ۵۸۳/۲)

(لیکن) غیبت کافروذمی کی بھی حرام ہے کیونکہ اس کو تکلیف دینا حرام ہے اور حریب کافر کی غیبت تضییع وقت کی وجہ سے مکروہ ہے۔ (بیان القرآن سورہ جبرات)

## صلح و اتفاق کے لئے شعائر اسلام کو ترک نہیں کیا جائے گا

صلح حدیبیہ کے قصہ سے استدلال کیا گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھوانا چاہا تو مشرکین نے اس کے لکھنے جانے سے انکار کیا۔ آپ نے اپنی اس درخواست کو منظور فرمایا کہ بسم اللہ لکھوانا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد رسول اللہ لکھوانا چاہا تو انہوں نے محمد رسول اللہ لکھنے جانے سے بھی انکار کیا آپ نے محمد بن عبد اللہ اس کی جگہ لکھوایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صلح کے لئے شعائر اسلام کو بھی چھوڑنا درست ہے۔

میں اس کے متعلق ایک موٹی سی بات عرض کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ باریک بات تو علماء جانتے ہیں وہ یہ کہ دنیا جانتی ہے۔ اور ہر شخص کو یہ بات معلوم ہے کہ جب دو قوموں سے صلح ہوتی ہے اور صلح نامہ لکھا جاتا ہے تو وہ صلح نامہ فریقین کی طرف مفسوب ہوتا ہے۔ اور اس

صلح نامہ میں وہی مضمون لکھا جاتا ہے جو دونوں فریق کے مسلمات میں سے ہو (یعنی دونوں کو تسلیم ہو) اس میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی جاتی جو فریقین کو تسلیم نہ ہو۔

جب یہ حقیقت ہے تو اب سنئے کہ جس صلح نامہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمن الرحیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھوانا چاہا تھا۔ اس کے ساتھ صرف مسلمان ہی کا تعلق نہ تھا بلکہ مشرکین مکہ بھی اس سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی وہ (صلح نامہ) دونوں کی طرف سے منسوب تھا، اور دونوں ہی کے اس پر دستخط ہوئے ہیں۔

اور جیسا کہ اس میں یہ بات قابل لحاظ تھی کہ اس میں کوئی بات مسلمانوں کے خیالات کے خلاف نہ ہو۔ اسی طرح یہ بات بھی قابل رعایت تھی کہ صلح نامہ کا ہر مضمون خصم کو بھی تسلیم ہو اسی وجہ سے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمن الرحیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھوانا چاہا تو مشرکین اور کفار مکہ نے صلح نامہ میں اس کا لکھا جانا منظور نہ کیا۔ اور ان کا اس انکار کرنے سے مطلب یہ تھا کہ صلح نامہ جس طرح مسلمانوں کی طرف منسوب ہوگا۔ اسی طرح ہماری طرف منسوب کیا جائے گا۔ اور جس طرح مسلمانوں کے اس پر دستخط ہوں گے اسی طرح ہم کو بھی دستخط کرنے ہوں گے، اس لئے صلح نامہ میں ایسے الفاظ نہ ہونا چاہئے۔ جس کے قبول کرنے سے ہم کو انکار ہے۔ کیونکہ ایسے الفاظ ہوتے ہوئے اس پر ہمارے دستخط کیسے ہوں گے۔ کفار مکہ کو فریق ہونے کی..... حیثیت سے صلح نامہ کے مضمون میں دخل دینے کا حق حاصل تھا۔ اور بسم اللہ اور محمد بن عبد اللہ کا لکھا جانا مسلمانوں کے کسی خیال کے خلاف نہ تھا۔ اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس درخواست کو منظور فرمایا۔ اور وہی الفاظ مضمون صلح نامہ میں درج کرائے جو دونوں فریق کے متفق علیہ تھے اور جن الفاظ پر فریقین کو دستخط کر دینا آسان تھا۔

اب اس کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد بتائیے کہ کیا اس سے یہ استدلال صحیح ہو سکتا ہے کہ صلح کیلئے مذہب کے اصول (شعائر اسلام) کو ترک کرنا درست ہے۔ (الافتراضات الیومیہ ص ۲۲، ۲۳ ج ۱)

## مسئلہ امامت و امارت اور اس کے شرائط

سوال: موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی غیر منظم حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے ضرورت

کا تقاضا ہے کہ امارت الاسلام کی کوئی صورت نکالی جائے۔ کیا آپ بیان فرمائیں گے کہ یہ مسئلہ شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

۱: کیا ہم کوکل ہندوستان کے لئے یا کسی خاص علاقہ کے لئے اپنا امیر مقرر کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

۲: اگر حق حاصل ہے تو کیا شرائط ہیں۔

۳: اور آپ کی رائے عالی میں اس کے حاصل ہونے کے کیا ذرائع اور صورتیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں؟

الجواب: ۱: حاصل ہے بشرط قدرت۔ اور مشاہدہ ہے کہ موجودہ حالت میں امارت ارادیہ پر قدرت ہے اور امارت قہریہ پر قدرت نہیں۔

۲: تدبیر اور عقل۔

۳: یہ حکم شرعی کا سوال نہیں جس کا اہل علم سے جواب لیا جائے تدبیر کا سوال ہے جس کا جواب اہل تجربہ سے لینا چاہئے۔ (امداد القوادی ص ۵۸۰/۲)

اس کام میں ضرورت ہے اتفاق کی..... اس کے لئے ارادت کافی نہیں قہر و قوت کی ضرورت ہے۔ اور وہ قوت امیر المؤمنین ہے اور اس وقت مسلمانوں کا کوئی (ایسا) امیر یا سردار نہیں جو ان کی قوت کو ایک مرکز پر جمع رکھ سکے جو روح ہے اس کام کو کرنے کی سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہ ہے۔ (الافتراضات الیومیہ ص ۱۱۹)

## امیر مقرر کرنے کے شرائط و جو布

نصب خلیفہ (یعنی امیر مقرر کرنا) واجب ہے۔ لیکن واجب کے لئے قدرت شرط ہے اور قدرت اس وقت مفقود ہے۔ اس واسطے گو عالم اس وقت خلیفہ سے خالی ہے لیکن باس حالات خلیفہ کے نہ ہونے سے کوئی گناہ نہیں۔ (الکلام الحسن ص ۱۵)

(الغرض) امام کا مقرر کرنا دیگر دلائل سے واجب ہے اور تمام واجبات کا وجوہ قدرت کے ساتھ مشروط ہے اور امام مقرر کرنے پر قدرت کی شرائط میں مسلمانوں کا اتفاق بھی ہے اور وہ موجودہ حالت میں (قدرت قہریہ نہ ہونے کی بنا پر) کبریت احر (گویا محال) ہے۔ لہذا نہ گناہ

لازم آئے نہ جاہلیت کی موت لازم آئے گی۔ (امداد الفتاویٰ ص ۳۶۹/۳ سوال ۳۶۱)

### حدیث من لم یعرف امام زمانہ کی تشریع

من لم یعرف امام زمانہ اس حدیث کے معنی بندہ کے نزدیک یہ ہیں کہ اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانایے امام کی اطاعت نہ کرنے سے کنایہ ہے۔ اور یہ صادق آتا ہے امام کے موجود ہونے پر (گویا) لازم یوں کر ملزم مراد لیا ہے۔ کیونکہ امام کو نہ پہچانایے ملزم ہے اطاعت نہ کرنے کو۔ (امداد الفتاویٰ ص ۳۶۹/۳)

### کس امیر و سلطان کی اتباع واجب ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور کہنا سنو اور بات مانو اگرچہ جبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ (ابوداؤد)

فائدہ: اگرچہ جبشی غلام شرعی قاعدہ سے امام و خلیفہ نہیں ہو سکتا مگر شریعت میں جس طرح امام خلیفہ کی اطاعت واجب ہے اسی طرح سلطان کی بھی یعنی جس کو تسلط و شوکت (اور غلبہ) حاصل ہو جائے اور مسلمان اس کے سایہ حمایت میں امن و عافیت سے رہ سکیں۔ سلطان ہونے کے لئے وہ شرائط نہیں جو امامت و خلافت کے لئے ہیں البتہ اسلام شرط ہے۔

لقوله تعالیٰ وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ (فروع الایمان ص ۷۷)

### جس نے کسی امام سے بیعت نہیں کی

### وہ جاہلیت کی موت مرے گا

سوال:۔ ایک صاحب یہاں مذکوٰۃ شریف پڑھتے ہیں ان کو ایک حدیث میں شہ ہے اور بندہ کو بھی شہ ہے وہ حدیث یہ ہے۔

من مات ولیس فی عنقه بیعه مات میتہ الجاہلیہ (رواه مسلم)  
جو شخص اس حال مرا کہ اس کو اپنے امام کی بیعت حاصل نہ ہو ایسا شخص جاہلیت کی موت مرا۔  
(شرح نے) بیعت کے تحت میں اے للام لکھا ہے۔ اس حدیث کا کیا مطلب

ہے۔ اور ہم لوگوں کے لئے اس امر میں نجات کی کیا صورت ہے؟

الجواب:- لیس فی عنقہ سے کنایہ ہے خروج عن طاعة الامام سے (یعنی امام کے خلاف بغاوت کرنے سے) اور یہ محقق ہے وقت تحقیق امام کے (یعنی یہ اسی وقت ہوگا جبکہ خلیفہ امام موجود ہو) اور جب امام نہ ہو تو اس معنی کرولیس فی عنقہ بعید صادق نہیں آتا اس لئے کوئی تردی نہیں۔ (امداد الفتاوی ص ۸۸/۵)

### الائمه من قریش

فرمایا خلافت قریش کے لئے ہے غیر قریشی بادشاہ کو سلطان کہا جائے گا لیکن اطاعت اس کی بھی واجب ہوگی۔

اور بعض لوگوں نے جو کہا ہے کہ غیر قریشی بھی خلیفہ ہو سکتا ہے تو یہ نص کے خلاف ہے حدیث میں ہے الائمه من قریش (یعنی امیر المؤمنین قریشی ہوں گے)

نیز حضرات انصار پر جب یہ نص (حدیث) پیش کی گئی تو انہوں نے بھی اس کو تسلیم فرمایا پس گویا اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔

اور وجہ اس کی وہ ہے جس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ اسلام سے اور دوں کا تو محض مذہبی تعلق ہے۔ اور قریش کا خاندانی بھی تعلق ہے کہ نبی اس خاندان کے ہیں تو ان کو اسلام کی حمایت دو وجہ سے ہو گی..... البتہ جن لوگوں کے قبضہ میں سلطنتیں ہیں وہ اگر قریش کو جب کہ اس میں الہیت ہو خلیفہ نہ بنائیں تو مجرم ہوں گے۔

(الکلام الحسن ص ۱۵، شریعت و سیاست ص ۷۱، القول الجلیل ص ۲۷)

### شرعی حاکم نہ ہونے کی صورت میں اہل حل و عقد حاکم کے قائم مقام ہوں گے

شریعت نے بہت سے احکام میں ضرورت کے وقت عامۃ المسلمين (یعنی عام مسلمانوں) کو سلطان کے قائم مقام خبر دیا ہے جیسے نصب امام خطیب جماعت اور وقف کے متولی

کا نصب کرنا وغیرہ لفقد ان السلطان لمسلم۔ (ملفوظات اشرفی مص ۳۰۲)

لیکن اب عام مومنین کا اجتماع تو مشکل ہے اسی لئے وہ لوگ ان کے قائم مقام ہوں گے جن کو عام مومنین سمجھیں گے کہ یہ ہمارے بڑے ہیں۔ ان کو زبان حال سے مانتے ہوں خواہ ان کا دینی اثر ہو یاد نیا وی اثر۔

وہ کون لوگ ہیں؟ التقياء و اہل حل و عقد۔ (حسن العزیز مص ۲۳/۱۷۳ سوم)

خلاصہ یہ کہ عام مومنین کا اجتماع ہر وقت دشوار ہے تو اس ضرورت سے عام مومنین میں جو ذی اثر لوگ ہوں گے۔ جیسے علماء و روساء، امراء، سلاطین، جن کو اہل حل و عقد کہا جاتا ہے وہ ان کے قائم مقام سمجھے جائیں گے اور ان ذی اثر لوگوں کا اجتماع (اتفاق) عام مومنین کا اجتماع قرار دیا جائے گا۔ (اقاضات الیومیہ مص ۱۰/۲۲۰)

## مذہب و سیاست

از افادات حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی

### کفار حکمران ہم پر کیوں مسلط کر دیئے گے

ایک شخص نے مجھ سے کہا، بتائیے کفار میں کون سی لیافت اور کون سا ایسا اتحاق ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کو محروم کر کے ان کافروں کو حکومت عطا کی گئی ہے؟ میں نے کہا کہ مسلمان تو اپنی نالائق اور نا اہلی کی وجہ سے محروم ہوئے ہیں اور کافروں کو بلا اتحاق اور بلا قابلیت حکومت دے دی گئی تاکہ ہم کو تنبیہ ہو اور ہم خواب غفلت سے بیدار ہوں کہ جو چیز ہمارے پاس ہونا چاہئے تھی وہ ہماری غفلت کی وجہ سے دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔ سو جب تک ہم اپنی حالت کو شرعی آئین کے ماتحت درست نہ کریں گے، حکومت کی باگ ڈور بھی ہمارے ہاتھ نہ آئے گی۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ بعض اوقات بادشاہ اپنی اولاد کو معمولی اور کم درجہ کے ملازمین سے سزادلواتے ہیں تو کیا اس سے ان ملازمین کا محبوب اور اہل ہوتا لازم آتا ہے؟ ہرگز نہیں ہاں اولاد کا نالائق ہوتا ضرور ثابت ہوتا ہے (اسعد الابرار)

اتعااظ بخیر محقق آداب انسانیت ص ۱۹۲، ص ۱۹۳ اسلامی احتجاجی ص ۵۰۷

### کیا اللہ تعالیٰ کافروں کا مددگار ہے؟

رہایہ شہر کہ اللہ میاں بھی کافروں کے مددگار ہیں جیسا کہ بعض گستاخوں نے کہا ہے۔ سنئے: نافرمانی وہ چیز ہے کہ بھنگی سے شہزادہ کے کوڑے لگوائے جاتے ہیں۔ تو کیا اس صورت میں بادشاہ بھنگی کا طرف دار ہے۔ اور کیا اس سے یہ لازم آ گیا کہ بھنگی مقبول ہے۔ بلکہ بات یوں ہے کہ شہزادہ اپنے مردود ہونے کی وجہ سے مغلوب ہے۔

ایک آیت شریف یاد آئی، سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔ اور یہ بنی اسرائیل کافرنہیں تھے۔ اہل کتاب تھے۔ انبیاء کے قائل تھے۔

وہ آیت یہ ہے۔

وَقَضَيْنَا لِلْبَنِي إِنْرَاءِيلَ فِي الْكِتَابِ لِتُقْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ.....

الى قوله تعالى **وَكَانَ وَعْلَامَفَعُولًا** (بني اسرائيل)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ بات بتلادی تھی کہ تم سرز میں میں دوبارہ فساد مچاؤ گے۔ جب اول مرتبہ شرارت کر دے گے تو ہم تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کریں گے جو بڑے خونخوار (ظالم) ہوئے پھر وہ گھروں میں گھس پڑیں گے۔ اب اس میں دیکھنا چاہئے کہ ان لوگوں کو جواہل کتاب ہیں مفسد اور حد سے گزرنے والا فرمایا ہے۔ اور دوسری بات ہے کہ جن کو عبادُ اللہ فرمایا ہے یہ کون لوگ ہیں؟ یہ مشرک ہیں بت پرست ہیں ان کو اپنا بندہ فرمار ہے ہیں اس حیثیت سے کہ ہمارے مملوک ہیں۔ اور ہمارا آلہ عذاب ہیں۔ نہ اس حیثیت سے کہ مقبول ہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ تمہارے مردود ہونے کی وجہ سے ان کو تم پر مسلط کر دیا ہے۔

دیکھئے اگر ٹوپی پر نجاست پڑ جاتی ہے تو اسے اتار کر پھینک دیتے ہیں ایک منٹ سر پر نہیں رکھتے۔ اور جو تہ اگر نجاست میں بھر جائے تو اسے کوئی نہیں پھینکتا۔ اسی طرح کافر اور مسلم کی مثال ہے کہ مومن مثل ٹوپی کے ہے۔ کہ اس میں اگر ایک دھبہ بھی پڑ جاتا ہے تو ناگوار ہوتا ہے اور کافر مثل جو تہ کے ہے کہ اگر پورا بھی نجاست سے بھر جائے تو ناگوار نہیں ہوتا۔ تو کیا اس سے یہ لازم آ گیا کہ جو تہ ٹوپی سے افضل ہے؟ (مزیداً الجید ص ۸۹)

(اس لئے) کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ہم تو گناہ کرنے والوں کو بڑے عیش (آرام) میں دیکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ استدرج (ڈھیل) ہے اس کا اور بھی زیادہ خطرہ (اور سخت و بال) ہے۔ جیسے مکتب (سکول) میں کوئی لڑکا سبق نہ یاد کرتا ہو اور معلم ماسٹر ضد میں سزا نہیں دیتا کہ کل سبق نہ یاد ہو گا اس وقت اکٹھی سزا ہوگی۔

## ایک شہر اور اس کا جواب

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اہل یورپ (غیر مسلم کفار) تو بغیر دین کے آرام سے ہیں (اور برابر ترقی کر رہے ہیں اور ہم کیوں بغیر دین کے ترقی نہیں کر سکتے)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ..... آپ اپنے کو ان پر قیاس نہیں کر سکتے۔ ان کا فروں کو بغیر دین کے دنیا کی راحت حاصل ہو سکتی ہے مگر آپ کو بغیر دین کے دنیا کی راحت ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ آپ اطاعت فرمانبرداری کے مدعی نہیں۔ اور وہ اطاعت کے مدعی ہیں۔ بلکہ کفر اختیار کر کے وہ خدا سے باغی ہو چکے ہیں۔ پس آپ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کہ جائے گا جو مدعی اطاعت (یعنی جو اطاعت کا دعویٰ کرتا ہو) اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کہ بات بات پر گرفت ہو گی اور جہاں ذرا شریعت کے قانون سے باہر قدم رکھا فوراً سزا ہو گی۔ اور ان (غیر مسلموں) سے وہ برتابو کیا جا رہا ہے جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ باغی اگر دن میں سو دفعہ قانون کی مخالفت کرے تو اس سے تعریض نہیں کیا جاتا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تولقانی ریاستیں کے سلطان سے باغی ہو کر ان کے احکام کی مخالفت کرتی ہیں۔ اور ایک شخص سلطان کے کسی حکم کی مخالفت کرے تو تولقانی ریاستوں کی جزوی مخالفتوں پر نظر نہیں کی جاتی۔ بلکہ ان کی بغاوت کی سزا اکٹھی دی جائے گی۔ اور اس کا کچھ تذکرہ بھی نہ ہو گا۔ کہ بغاوت کے بعد انہوں نے اور کون کون سے کام خلاف قانون کئے تھے۔ کیونکہ بغاوت اتنا بڑا جرم ہے جس نے دوسرے جرائم کو نظر انداز کر دیا۔

اور ترکی ذرا سی قانونی مخالفت کرے تو فوراً سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے کو سلطنت کا مطیع کہتا ہے اس لئے اس کی ہر بات پر موافذہ ہوتا ہے۔

اسی طرح یہاں سمجھئے کہ مسلمان کو تو ذرا سی مخالفت پر سزا ملتی ہے اور جہاں اس نے کوئی گناہ کیا فوراً اس کی دنیوی راحت سلب کر لی جاتی ہے گو ظاہری ساز و سامان جلدی سلب نہ کیا جائے مگر قلوب (دلوں کی راحت فوراً ختم ہو جاتی ہے جو کہ فلاح و کامیابی کی اصل حقیقت ہے کیونکہ وہ اطاعت کا مدعی ہے۔ اور کفار کے جزوی افعال پر نظر نہیں کی جاتی۔ بس ان کو تو بغاوت کی سزا اکٹھی دی جائے گی۔ جس کے لئے ایک میعاد معین ہے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اطاعت کے دعویٰ سے بغاوت ہی اچھی کہ روز کی گرفت سے تو بچ رہیں گے۔ تو سمجھ لیجئے کہ اطاعت کرنے والے کو تو ابھی سزا ہو گی مگر یہ سزا بھگتے کے بعد پھر وہ ہمیشہ کے لئے راحت میں ہے۔ جیسے کوئی ترکی چوری یا زنا کرے تو اس کو اس وقت

کچھ دنوں کے واسطے قید کر دیا جاتا ہے۔ مگر قید کا نئے کے بعد پھر سلطنت میں وہ کوئی عہدہ لے سکتا ہے اور اپنی زندگی آرام سے گزار سکتا ہے۔ مگر با غی کو چند روز یا چند سال کے لئے گو کچھ نہ کہا جائے لیکن جب کچڑا جائے گا تو اسکی سزا سوی سے ادھرنہ ہوگی۔

اسی طرح جو خدا تعالیٰ سے بغاوت کرے گا وہ چند روز دنیا میں گورا حت سے گزار لے۔ مگر جب اس کو کچڑا جائے گا تو ہمیشہ کے لئے عذاب جہنم سے ادھراس کی سزا کچھ نہ ہوگی۔ اب اختیار ہے جس کو چاہو اختریار کرلو۔

غرض آسائش (آرام) کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو کوئی بالکل با غی ہو کر رہے تو بغاوت کی سزا کے وقت سے پہلے اس کو جہنن ہے اور یا بالکل مطیع فرمانبردار ہو کر رہے تو اس کو ہمیشہ کے لئے جہنن ہے۔ یہاں بھی اور آخرت میں بھی باقی مطیع و نافرمان دنوں بن کر دنیا کی راحت تو حاصل نہیں ہو سکتی ہاں آخر میں کچھ سزا بھگتے کے بعد پھر راحت ہو جائے گی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آسائش کا طریقہ جو کہ کامیابی کی اصل ہے وہ دین کی پابندی کے بغیر ممکن نہیں۔

اس مضمون کو میں نے اس لئے بیان کیا کہ آج کل سب لوگ فلاج کامیابی کے طالب ہیں جن میں زیادہ تر دنیا کی کامیابی کے طالب ہیں۔ تو میں نے بتا دیا کہ دنیا بھی دین کے اتباع سے مل سکتی ہے۔ اس کے بغیر مسلمان کو تو کامیابی مل نہیں سکتی۔ اور اس وقت خطاب مسلمانوں ہی سے ہے۔

## قدرت نے مسلمان اور غیر مسلم کی ترقی کا مدار الگ الگ مقرر کیا ہے

مسلمانوں تم اپنی ترقی کے لئے یہ دیکھو کہ مسلمانوں کو اس سے پہلے کیسے اور کیوں کر ترقی ہوئی۔ اور یہ ہرگز نہ دیکھو کہ کفار کو ترقی کیوں (اور کیسے) ہوئی۔ کیونکہ ہر قوم کا باطنی مزاج الگ ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو طریقہ ایک قوم کو مفید ہو وہ سب کو مفید ہو۔ بلکہ یہ ضروری نہیں کہ جو صورت ایک قوم کے کسی فرد کو مفید ہو وہ سب افراد کو مفید ہو۔ جس کا مزاج لطیف

ہواں کو وہ چیزیں لفظ نہیں دیتیں۔ جو ایک گنوار کو لفظ دیتی ہیں۔

مسلمانوں! تم اسلام (لے آنے کے بعد) لطیف المزاج ہو گئے ہو تمہارا مزاج شاہانہ ہو گیا ہے تم کو وہ صورتیں مفید نہ ہوں گی جو کفار کو مفید ہیں۔ نیز تم ایسے ہو جیسے سر کی ٹوپی کہ جہاں اس میں ذرا سی ناپاکی گلی فوراً اتار کر پھینک دی جاتی ہے۔ اور جوتے میں اگر ناپاکی لگ جائے تو اس کو نہیں پھینکتے۔ اسی طرح حق تعالیٰ تم کو ناپاکی اور گندگی میں ملوث نہیں دیکھنا چاہتے اگر ملوث ہو گے تو فوراً کوئے پیٹے جاؤ گے۔ اور کفار چاہے جتنا ملوث ہو جائیں گوارا کیا جائے گا۔ (شریعت و سیاست ص ۲۰)

### وضاحتی مثال

اپنی ترقی کو کفار کی ترقی پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے (یعنی صحیح نہیں) اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک بھٹکی عطر فروشوں کے بازار میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ وہ لوگ اپنی عادت کے موافق اس کو عطر سوچھانے لگے لیکن وہ ہوش میں نہیں آیا۔ اتفاقاً ایک دوسرے بھٹکی کا ادھر گزر ہوا اس نے کہتے کا پا خانہ سوچھایا اور وہ فوراً ہوش میں آگیا اب اگر کوئی شخص اس بھٹکی کے ہوش میں آنے کی اس تدبیر کو علی الاطلاق مفید سمجھے لے۔ (اور ہر شخص کے لئے اس کو کرنے لگے) اور عطر سوچھانے کے طریقہ کو غیر مفید سمجھ کر چھوڑ دے۔ اور پھر اسی بھٹکی کے نہ کو کسی شریف آدمی نہیں المزاج اور لطیف الطبع پر استعمال کرے کہ اس کے بے ہوش ہونے پر اس کو کہتے کا پا خانہ سوچھائے) تو نتیجہ یقیناً ناکامی کی شکل میں ظاہر ہو گا وہ ہوش میں تو کیا آئے گا اس کی بے ہوشی اور دماغی مرض بڑھ جائے گا۔ یہ تو عمدہ تم کے بیش بہا عطریات کے سوچھانے سے ہوش میں آئے گا۔

بس ایسے ہی مسلمان کفار کے طریقوں سے ترقی کی راہ پر گامزن نہ ہو سکیں گے۔ مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کا راز اعمال صالح اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں مضر ہے لہذا اس پر پابندی کیجئے اور رحمت خداوندی سے ثرات و نتائج کے امیدوار رہئے۔

## غفلت کا وقت نہیں

یہ وقت مسلمانوں کی غفلت کا نہیں مگر مشکل تو یہ ہے کہ اگر مسلمان غفلت سے بیدار ہوتے بھی ہیں تو اس کے مصدق ہو جاتے ہیں۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی طلاقی کی بھی ظالم نے تو کیا کی اس بیداری میں نہ احکام (شریعت) کا اتباع ہوتا ہے نہ آپس میں اتفاق ہوتا ہے۔ (ملفوظات ۲۱۲، ۲، ارشادات حکیم الامت ص ۵۰۸)

## حکام کی برائی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں

بعض لوگ مصیبتوں سے تنگ ہو کر حکام وقت کو بر ابھلا کتے ہیں۔ یہ بھی بے صبری کی علامت ہے۔ یہ پسندیدہ تدبیر نہیں۔ حدیث شریف میں اس کی ممانعت بھی آئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لا تسبوا الملوك یعنی با دشاؤں کو برامت کہو۔ ان کے قلوب میرے بقدر میں ہیں۔ میری اطاعت کرو میں ان کے دلوں کو تم پر زرم کر دوں گا۔

یاد رکھو جو مصیبت آتی ہے وہ اللہ کی جانب سے ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا يَأْذِنُ اللَّهُ یعنی کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ کے حکم سے اور جب مصیبت اللہ کی طرف سے ہے تو اس کا علاج یہی ہے کہ ادھر جو ع کرے (یعنی اللہ سے توبہ استغفار کرے) اور پھر جو پیش آئے (ای میں) خیر سمجھے اصر ص ۳۶) (املاج اسلامیں ص ۵۳۲)

## اتباع شریعت کے بغیر ہم ترقی نہیں کر سکتے

حضرات آپ کو اس عقیدہ پر مضبوطی کے ساتھ جم جانا چاہئے۔ کہ مسلمان جب بھی ترقی کرے گا۔ احکام شریعہ کی پابندی سے کرے گا۔ یہ خیال دل سے بالکل نکال دینا چاہئے کہ اتباع شریعت کے بغیر بھی مسلمان ترقی کر سکتے ہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیندار ہونے اور نماز روزہ کی پابندی کو ترقی میں کیا دخل ہے۔ بلکہ اس کے لئے صرف سیاسی تدبیریں کافی ہیں۔

مسلمانوں کا خدا کی ذات کے سوا کوئی حامی اور مددگار نہیں۔ اور ان کو کسی اور کی ضرورت بھی نہیں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں نظر ہو اور دین ہو تو تمام دنیا کی غیر مسلم قومیں اس ضعف (کمزوری) کی حالت میں بھی انکا کچھ نہیں بجا سکتیں۔ لیکن مسلمان دیے تو بہت گز بڑ کرتے ہیں مگر جو اصل تدبیر ہے اور کام کی تدبیر ہے۔ جس سے پہلے لوگوں کو کامیابی ہو چکی ہے وہ نہیں کرتے وہ تدبیر یہ ہے کہ اپنے خدا کو راضی کرنے کی فکر کریں۔

حضرات مسلمان کو خدا کی امداد کے سوا کسی کی امداد کی ضرورت نہیں اور امداد الٰہی کی شرط، احکام الٰہی کی پابندی ہے۔ جس کا سینکڑوں برس تک تجربہ کیا جا چکا ہے۔

اسلام کی قوت کا مدار لوگ شخصیتوں پر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کی قوت کا مدار حق پر ہے نہ کہ کسی حقوق پر اسلام کی قوت خارج سے نہیں داخل سے ہے۔ حق میں وہ قوت ہے کہ اگر ایک شخص حق پر ہو اور سارا عالم اس کا مخالف ہو تو وہ کمزور نہیں۔ اور اگر یہ شخص حق پر نہیں سارا عالم اس کا معتقد ہو وہ شخص ضعیف ہے اس میں کچھ بھی قوت نہیں۔

## مسلمانوں کی ترقی کی بنیاد

اگر تم ترقی کرنا چاہو تو دیکھو کہ پہلے مسلمانوں کو ترقی کیوں (اور کیسے) ہوئی تھی۔ چنانچہ جن لوگوں نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترقی کا حال تاریخ میں دیکھا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ان حضرات کو مخفی دین کی اتباع کی وجہ سے ترقی ہوئی۔ وہ دین میں پختہ تھے۔ ان کے معاملات و معاشرت و اخلاق بالکل اسلامی تعلیم کے مطابق تھے۔ اس لئے دوسری قوموں کو خود بخود اسلام کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اور جب مقابلہ کا وقت آیا۔ تو چونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو راضی کر کھا تھا۔ اس لئے خدا تعالیٰ ان کی مدد کرتا تھا یہی توجہ ہے کہ بے سر و سامانی اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی سلطنتوں کو ان سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ (شریعت و سیاست ص ۲۱)

## فتح و ترقی کا مدار

فتح و نصرت کا مدار قلت و کثرت پر نہیں۔ وہ چیز ہی اور ہے۔ مسلمانوں کو صرف اسی ایک چیز

کا خیال رکھنا چاہئے۔ یعنی خدا تعالیٰ کی رضا کا۔ پھر کام میں لگ جانا چاہئے۔ اگر کامیاب ہوں شکر کریں۔ ناکام ہوں صبر کریں۔ اور مومن تو حقیقت میں ناکام ہوتا ہی نہیں۔ گو صورۃ (ظاہرا)

ناکام ہو جائے اس لئے کہ آخرت کا اجر تو ہر وقت حاصل ہے۔ جو ہر مسلمان کا مقصد ہے۔

حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سانحہ ہزار کے مقابلے میں تمیں آدمی تجویز کئے تھے۔ حضرت عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ امت محمدیہ کو ہلاک کراؤ گے۔ تب سانحہ آدمی تجویز کئے۔ یعنی ایک ہزار کے مقابلے میں ایک آدمی۔ قلت و کثرت کی طرف ان حضرات کا خیال ہی نہ تھا۔ (شریعت و سیاست ص ۲۶)

## مسلمانوں کی عزت کی کنجی

مسلمانوں نے شریعت پر عمل کر کے دیکھوانشاء اللہ سب تمہاری عزت کریں گے۔ جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ جو کچھ مسلمان ہیں۔ انگریز ہندو یا پارسی وغیرہ۔ سب ان کی عزت کرتے ہیں۔ تم دین پر قائم رہو۔ ساری قومیں تمہارے تابع ہو جائیں گی۔ (شریعت و سیاست ص ۲۶)

اسلام کو اپنی طرف جذب کرنے یعنی راغب کرنے کے لئے غیر قوم کو بھائی بنانے کی ضرورت نہیں (اسلام کی تعلیم میں وہ حسن ہے کہ) وہ دشمن کو دشمن کہہ کر بھی اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام نے دوسری قوموں کے حقوق کی بھی رعایت کی ہے۔ وہی حقوق اور وہی رعایت سب کے کھینچنے کے لئے کافی ہے۔ (کمالات اشرفی ص ۶۷)

## پریشانیوں کی جڑ اور ہماری قوت کا سرچشمہ

تمام پریشانیوں کی جڑ خدا تعالیٰ سے صحیح تعلق نہ ہوتا ہے اور یہ مسلمانوں کی انتہائی بد نہیں ہے کہ غیر قوموں کو (اپنا خیر خواہ ہمدرد سمجھتے ہیں) ان کی بغلوں میں جا کر گھستے ہیں اور ان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

انما ولیکم اللہ و رسوله والذین امنوا

حرر کے ساتھ فرماتے ہیں۔ کہ تمہارا کوئی دوست نہیں سوائے اللہ اور رسول اور مؤمنین کے۔ (الآفاضات ص ۲/۱۳۹)

حضرات جنگ آئینی ہو یا غیر آئینی مسلمانوں کو خدا کے سوا کسی کی امداد کی ضرورت نہیں۔ امداد الہی کی شرط اللہ کے احکام کی پابندی ہے۔ جس کا سینکڑوں برس تک تجربہ کیا جا چکا ہے۔ جب تک مسلمان مج مذہبی دیوانے بنے رہے دنیا ان کی جو تیوں سے لگی رہی اور جیسے جیسے اس میں کمی آتی گئی مسلمان ترقی سے محروم ہوتے گئے۔

مسلمانو! یاد رکھو تمہاری فلاح بہبودی (کامیابی) صرف حق تعالیٰ کی ایتیاع اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ہے۔

کیوں در بدر کی گداگری کرتے پھرتے ہو تمہارے گھر میں خزانہ مدون ہے۔ تم کو خبر نہیں۔ تمہارے پاس ایک اتنی بڑی دولت ہے کہ تمام عالم کے غیر مسلم..... اس دولت کے گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ جس سے تم کو خداوند جل جلالہ نے نوازا ہے۔ وہ دولت ایمان کی دولت ہے۔ اس کی قدر کرو۔ اس کی قوت کے جو ذرائع اور نفع ہیں ان کو اختیار کرو۔ اور وہ اعمال صالح ہیں۔ پھر دیکھو چند روز میں کیا سے کیا ہوتا ہے اور اعتماد سے نہ ہی بطور امتحان ہی کے کر کے دیکھو۔

سالہا تو سنگ بودی دخراش آزموں را یک زمانے خاک پا ش

## سلطان صلاح الدین ایوبی کا حال

سلطان صلاح الدین نے جس وقت ملک شام کو فتح کیا ہے تو وزیروں نے عرض کیا کہ یہ نصرانیوں کا ملک ہے نیا فتح کیا ہوا ہے۔ اور اس ملک کے لوگ نہایت سرکش اور سخت ہیں۔ اور اسلامی سیاسیات (یعنی اسلامی قوانین) نرم ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان پر قابو رکھنے کے لئے اسلامی احکام کے علاوہ اگر اور بھی کچھ قوانین اور قواعد نافذ کر دیئے جائیں۔ تو زیادہ مناسب ہے۔

اس پر سلطان صلاح الدین نے جو جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں کہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں نے جو ملک فتح کیا ہے وہ حکومت اور سلطنت کرنے کے لئے کیا ہے؟ میں نے تو محض اللہ کو خوش کرنے کے لئے یہ سب کوشش کی ہے۔ (میں تو) اسلامی احکام کو نافذ کر دیں گا۔ اس پر چاہے ملک رہے یا جائے۔ اسلامی احکام کے

خلاف ایک حکم کا بھی نفاذ نہ کروں گا۔

ان حضرات کی کامیابی کے یہ راز تھے۔ اور یہاں یہ حالت تھی کہ ابھی نہ کوئی ملک قبضہ میں ہے نہ آئندہ ملنے کے بظاہر کوئی اسباب نظر آتے ہیں۔ مگر شریعت مقدسہ کی قطعہ برید پہلے سے شروع کر دی۔ (الافتضالات الیومیہ ص ۱۳۲ جلد ۱)

### شور و غل ہنگامہ کی ممانعت

شریعت نے اس قدر ہم کو شور و غل (ہنگامہ) کی اجازت نہیں دی بلکہ حکم یہ ہے کہ:

يَا إِنَّهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا أَصْلَدُوا وَأَصَلَدُوا وَأَرَابَطُوا

ترجمہ: اے ایمان والو تکلیف پر خود صبر کرو اور کفار سے مقابلہ ہو تو مقابلہ میں صبر کرو مقابلہ کے لئے ہر حال میں تیار ہو۔ (بیان القرآن)

اور صبر کہتے ہیں استقلال کو۔ تو ایمان کرنا چاہئے جیسا کہ آج کل لوگ ہر ہر واقعہ سے بے استقلالی (بے صبری) ظاہر کرنے لگتے ہیں مثلاً زیادہ شور و غل کرنا زیادہ پریشانی ظاہر کرنا جس سے معلوم ہو کہ ان کو بہت رنج ہے۔

نیز شور و غل خلاف احتیاط بھی ہے۔ بعض اوقات اس سے حکام کو غلط شبہات ہو جاتے ہیں تو کوئی بات خلاف احتیاط مت کرو۔

الغرض شریعت نے صبر کا حکم دیا ہے۔ تو یہ تمام جوش و خروش خلاف شرع ہے (اس سے بسا اوقات سخت نقصان ہو جاتا ہے۔ قاعدہ کے مطابق تدبیر کے ساتھ کارروائی کرنا چاہئے۔ جہاں تک میں اندازہ کرتا ہوں یہ شورش اکثر بے دینوں میں ہوتی ہے۔ جن کو دین کا علم بہت کم ہے۔ دینداروں میں امن و سکون ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی روشنی والے اس شورش کے اندر بھی یورپ کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ طریقہ یورپ ہی کا ہے کہ جو حکام کرتے ہیں۔ بڑھا چڑھا کر لوگوں کو دکھلا کر کرتے ہیں۔

ای طرح اخبار نویسون نے بھی بہت زیادہ لوگوں کو پریشان کر دیا ہے۔ ایسے ایسے مفاسد میں لکھتے ہیں جس سے خوانخواہ دیکھنے والے کو جوش آئے۔ کیونکہ ان لوگوں کو تجارت

مقصود ہے۔ ایسے مضمین سے ان کے اخبار کی اشاعت خوب ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اہل دنیا ہیں۔ اہل دین کا طریقہ تو رضا بر قضاۓ ہے وہ کتاب و سنت کو دیکھتے ہیں ان کو کوئی تجارت مقصود نہیں جو خواخوا جوش خروش ظاہر کریں۔ یہ سب باتیں صبر و قناعت کے خلاف ہیں۔

## جوش خروش ہنگامے کی ممانعت

### امن و سلامتی کی ضرورت

شرعی اجازت سے (حالات کے موافق) تدبیر کرنا جائز ہے۔ (لیکن) اپنی رائے سے تدبیر کرنا بھی شریعت کے خلاف ہے۔ آج کل بعض نوجوانوں کے اندر (جوش خروش) دلوں ہیں۔ بعض ناگوار و اقعات کی تدبیر اس کو سمجھتے ہیں۔ کہ کوئی شورش (ہنگامہ) ہو، گڑ بڑ ہو۔ خدا نخواستہ اگر کوئی شورش ہوگی بھی گوب سے پہلے ہٹنے والے بھی یہی لوگ ہوں گے۔ صاحبو! امن و عافیت کو غیبت سمجھو۔ اور امن و عافیت ہی اللہ سے مانگو۔ ہاں اگر کوئی واقعہ یا کوئی مصیبت خود بخوبی پیش آ جائے تو اس میں صبر و استقلال سے کام لو۔ یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ خود کسی حادثہ کی تمنا نہ فرماتے تھے۔ اور اگر کوئی واقعہ ہوتا تھا تو تدبیر سے کام لیتے تھے۔ یکاری ہوتی تھی۔ دو افراد تھے۔ لڑائی کا موقع ہوتا تھا جو اس (وقت کے لحاظ سے) مناسب تدبیر میں تھیں وہ کرتے تھے۔ (المرصود ۳۶۔ اصلاح اسلامیں ص ۵۲۲)

### امن و امان سلامتی قائم ہونے کا طریقہ

شرعی احکام پر عمل کرنا اور جن باتوں سے شریعت نے منع کیا ہے ان سے بچنا یہ جڑ ہے، امن و سلامتی کی۔ اور یہی فساد کو دفع کرنے والی ہے قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ احکام الہی کی پابندی کروں اسی لیعنی (نا جائز کاموں) سے بچتے رہو۔ پس یہی اصلاح کی صورت ہے۔ زمین میں امن اسی سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو صورتیں ہیں وہ فساد کی صورتیں ہیں۔

مگر افسوس لوگ خدا کی تعلیم کو چھوڑ کر اپنی طرف سے امن کی نئی صورتیں گڑھ رہے ہیں۔ (الترف بالصرف ص ۳۸۔ اصلاح اسلامیں ص ۵۲۱)

## اتباع شریعت کی ضرورت

شریعت میں انسان کی ہر حالت کے متعلق احکام ہیں اور حالات دو قسم کے ہیں۔ ایک نعمت و خوشی کی حالت دوسرے مصیبت اور رنج کی حالت ہے۔

مصطفیٰ کے احکام بہت کم لوگ جانتے ہیں مصیبت کا ایک حکم یہ ہے کہ مصیبت کی وجہ سے دوسرے احکام شرعی میں کوتاہی نہ کرے اور ان کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ دیکھو سب ہی کو معلوم ہے کہ عزیز کا مر جانا کتنی بڑی مصیبت ہے مگر حکم یہ ہے کہ صرف آنسو بہا سکتے ہو چلا نا اور شور مچانا حرام ہے۔

اس سے معلوم ہوا شرعی احکام کا لحاظ رکھنا بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی واجب ہے۔ (حقوق السراء والضراء ص ۱۹۹۔ التبلیغ ج ۸)

## ظلم و زیادتی اور حد سے تجاوز کرنے کی ممانعت

تم پر لازم ہے کہ خود ظلم نہ کرو آج کل مشکل تو یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ہوتا ہے لوگ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں پر بھی زیادتی کرنے لگتے ہیں۔ (بے قصور لوگوں کو مارنے لگتے ہیں) بھلا عورتوں اور بچوں نے کیا قصور کیا ہے۔ پھر اس غلطی کی وجہ سے معاملہ ہم پر ہی الٹ جاتا ہے اور قہر (یعنی اللہ کے عذاب) کی سی صورت بن جاتی ہے۔ تشویشناک حالات میں جھوٹ اور مبالغہ اور حدود شرع سے تجاوز بہت ہوتا ہے جس سے دین بر باد ہو جاتا ہے۔

یاد رکھو مصیبتوں میں حدود شرع سے تجاوز کرنا اعلیٰ درجہ کی بے صبری ہے۔ صابر و ہی ہے جو ایسے مواقع میں شریعت پر جمار ہے۔ اور کوئی کام حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ کرے۔ ایسے ہی صبر کرنے والوں کے لئے بشارت ہے اور ان ہی لوگوں کی فضیلت قرآن و حدیث میں بیان کی گئی ہے۔

(حدود شرع میں رہتے ہوئے) بالفرض اگر کبھی ناکامی بھی ہو تو اتباع شریعت کی برکت سے معاملہ الثانیہ ہوتا کہ قہر (عذاب) کی سی صورت ہو جائے۔

(لیکن) لوگ (ایسے حالات میں) شریعت سے بہت تجاوز کرتے ہیں کفر و معاصل میں جلتا ہوتے ہیں۔ افسوس وہ اسلامی کام ہی کہاں ہوا جس میں خدا تعالیٰ کو ناراض کیا جائے۔ (حقیقت الصبر ص ۱۳۶، ۱۳۷)

## دین کی پابندی

اصل چیز یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین پیدا ہو۔ کس طرح دل میں ڈال دوں جی چاہتا ہے کہ سب اس طرح راہ پر آ جائیں کہ ان کی ہر ادا سے اسلام کی شان ظاہر ہو۔ جیسے صحابہ کرام کو لوگ دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے۔ یہ ان کا نمونہ بن جائیں دین و دنیا کی بہبود (کامیابی) اسی میں پوشیدہ ہے۔

یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ اگر مسلمان اپنی اصلاح کر لیں اور دین ان میں رانج ہو جائے۔ تو دین تو وہ ہے ہی لیکن دنیوی مصائب کا جو کچھ آج کل ان پر ہجوم ہے انشاء اللہ تعالیٰ چند روز میں کایا پڑت ہو جائے گی۔ (الافتاثات الیومیہ ص ۵۵)

## ایمان و اعمال کی طاقت اللہ کا وعدہ

### مسلمانوں کی کوتاہی

آج کل مسلمانوں کو ارشادِ الہی پر نظر نہیں۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّلِحَاتِ لِيُسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ إِلَيْهَا

ترجمہ: تم میں جو لوگ ایمان لا میں اور نیک عمل کریں۔ ان سے اللہ وعدہ فرماتا ہے۔ کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا۔ جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی۔ اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا۔ (اور ان کو) جو دشمنوں سے طبی خوف ہے ان کے اس خوف کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں۔ (بیان القرآن ص ۲۰/۸)

مسلمان یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ان کا موس کو بھی ترقی میں کچھ دخل ہے حالانکہ اس آیت

میں استخلاف فی الارض اور حکمین (یعنی خلافت اور غلبہ دینے) کا صاف صاف وعدہ کیا ہے۔ مگر مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ نماز روزہ اور ایمان میں بھی کچھ قوت ہے اور اس سے بھی ترقی ہوتی ہے۔ ( بلکہ بہت سے مسلمان اس کو) بیکار ہی سمجھتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کو تو مسلمان بھی نہ کہنا چاہئے۔ یہ کیسے مسلمان جو نماز روزہ کو بیکار سمجھیں، مگر ایسے تو دوچار ہی نکلیں گے۔ زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو اس خزانہ کی قیمت اور اس کی طاقت سے بے خبر ہیں۔ اسی لئے ان اعمال کی بے قدری کرتے ہیں۔ کوئی مسلمان کے حالات کا جائزہ لے تو ان میں ہزاروں ایسے نکلیں گے جن کو کلمہ بھی نہیں آتا۔ اور لاکھوں ایسے ملیں گے جو نماز کو جانتے بھی نہیں کہ کس چیز کا نام ہے۔ اور بہت سے ایسے ملیں گے جو کبھی سال میں ایک دو دفعہ پڑھ لیتے ہیں کبھی جی چاہا جمعہ کو بھی مسجد میں آ جاتے ہیں۔ اور جو تھوڑے سے اللہ کے بندے پانچوں وقت کی نمازوں کے پابند ہیں۔ ان میں بھی قاعدہ کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنے والے بہت کم ہیں۔ کسی کا سجدہ، کسی کا قومہ، کسی کا جلسہ، مفقود ہے (یعنی صحیح نہیں) ایک گڑ بڑ کر کھی ہے۔ تو اب آخری کیا ہے؟ بے قدری ہے یا نہیں۔ اور بخدا یہ بے قدری اسی واسطے ہے۔ کہ نماز کو صرف ثواب کا کام سمجھ رکھا ہے۔ اس کے دنیوی منافع کی ان کو خبر نہیں۔ بلکہ بعض جاہل تو نماز روزہ کو دنیاوی ترقی کے لئے رکاوٹ سمجھتے ہیں اور اگر ان کو حقیقت معلوم ہو جاتی اور یہ خبر (یقین کامل کے درجہ) میں ہو جاتی کہ ان اعمال کو ترقی اور حکمکن یعنی قدرت و غلبہ میں دخل ہے۔ تو پھر دیکھئے مسلمان کس شوق سے ان اعمال کو بجا لاتے۔ گواں نیت سے عمل کرنا اچھا نہیں۔ خلوص کے خلاف ہے۔ طاعات (عبدات) سے دنیاوی ثمرات کا قصد نہ ہونا چاہئے وہ تو تابع ہیں۔ خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔

الغرض ترقی کے اسباب تو آپ کے گھر میں موجود ہیں۔ الصبرۃ بذنِ البقۃ ص ۵۰

### صحابہ کی کامیابی کا راز

صحابہ کرام جن کی مقبولیت اور فراست، عقل تمام دنیا کو تسلیم ہے اور بڑے بڑے عقلاء اس پر متفق ہیں۔ انہوں نے بھی ساری عمر یہ کام کئے۔ مگر اصول اور حدود کو ہاتھ سے

نہیں چھوڑا۔ یہی راز ہے ان کی کامیابی کا۔

یہ تو ہر شخص کی زبان پر ہے کہ ان کو کامیابیاں ہوئیں ان کی نصرت ہوئی۔ وہ تمام عالم پر بے سر و صافی کی حالت میں غالب آئے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی تودیکھنا چاہئے کہ ان کا طریقہ کار کیا تھا۔ ان کا اس جدوجہد سے کیا مقصود تھا ان کی نیت کیا تھی۔ ان کے اعمال کیسے تھے، وہ آپ کی میں ایک دوسرے کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے تھے، وہ اسلامی احکام پر کس درجہ عمل کرنے والے تھے۔ ان کے دلوں میں اسلام اور احکام اسلام کی کس قدر عظمت و محبت تھی؟ شرات (نتائج) پر نظر ہے۔ شرات کے اسباب پر بھی تو نظر ہونا چاہئے اور اس پر اپنی حالت کو منطبق کرنا چاہئے۔ کھوئے کھرے کا فرق بسیورت معلوم ہو جائے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم ان کامیابیوں اور نصرتوں کے مستحق ہیں یا نہیں۔ (الافتضالات الیومیہ ص ۱۲۵/۱)

**حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سبق آموز مکتوب گرامی ۔**

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصر و اسکندریہ کی فتح کے لئے حضرت عمر و بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر لشکر بنا کر بھیجا تو جس طرف یہ خدائی لشکر رخ کرتا فتح و نصرت ان کے قدموں پر گرتی تھی۔ مگر اسکندریہ کی فتح میں معمول سے کچھ زیادہ دیر ہو گئی۔ یعنی تین مہینہ تک مسلمانوں کو اس کا حاصرہ کرنا پڑا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ تاخر بار خاطر ہوئی، اور آپ نے حضرت عمر و بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

”حمد و صلوات کے بعد معلوم ہوا کہ مجھے حیرت ہے کہ آپ کو فتح اسکندریہ میں اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ آپ تو ہمیشہ سے جہاد میں رہتے ہیں۔ اور ہر کام میں تجربہ کار ہیں۔ پھر اس تاخر کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہاری نیت میں تغیر آ گیا ہے اور تم دنیا سے اسی طرح محبت کرنے لگے۔ جیسے تمہارے مخالف اس میں بدلنا ہیں۔ حق تعالیٰ خلوص نیت کے بغیر فتح نہیں دیتا اپس جس وقت میرا یہ خط پہنچے۔ فوراً لوگوں کو جمع کر کے جہاد کی ترغیب دیجئے اور مسلمانوں کو سمجھا دیجئے کہ ہر مسلمان اپنی ہر حرکت و سکون میں رب العالمین کی خوشنودی اور کلمہ حق کی تبلیغ کا ارادہ کرے۔“

حضرت عمر بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس یہ والا نامہ پہنچا تو آپ نے لشکر کو جمع کر کے خلیفۃ المسلمين کا خط پڑھ کر سنایا۔ اور سب کو حکم دیا کہ غسل و طہارت کے بعد دو رکعتیں پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے فتح و نصرت کی دعا کریں سارے لشکر نے اس حکم کی تعمیل کی اور نمازوں و دعاء کے بعد اللہ تعالیٰ کی امداد کے بھروسہ پر ایک ہلہ کیا۔ تو میدان ان کے ہاتھ تھا۔ اور دشمن کی وہ زبردست طاقت جس نے تین مہینہ کی مدافعت سے شہر کا داخلہ ناممکن کر دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایسی حالت ہوئی کہ اس کا کوئی نام و نشان باقی نہ تھا۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کو عام مورخین نے لکھا ہے۔ اس میں ہمارے لئے درس عبرت ہے کہ مسلمانوں کی ناکامی کا سبب حب دنیا اور قلت تعلق مع اللہ (یعنی دنیا کی محبت اور اللہ سے بے تعلقی) کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

پس ضروری ہے کہ مسلمان ہر حکم اللہ کی پابندی کو اپنے ذمہ لازم اور دوسروں کو نرمی سے سمجھانا اور بتانا اپنا فرض منصبی سمجھیں۔ خدا کی نافرمانی اور گناہوں کو چھوڑو۔ اپنی صورتیں ایسی بنالوکہ دور سے دیکھنے والا پہچان لے کہ یہ مسلمان ہیں۔ اور اپنے اخلاق اسلامی اخلاق بنالوکہ ہر خالف کے نزدیک بھی آپ کی اخلاقی شان متاز ہو۔ آج سے خدا کے فرمانبردار بن جاؤ۔ پھر دیکھو شیبی تائید کیسے تمہارا ساتھ دیتی ہے۔ اور دوسری قوموں پر تمہارے رعب کا سکر بیٹھتا ہے۔

اصلاح اسلامیں ارشادات حکیم الامت ص ۱۵۳۱ الافاضات الیومیہ ص ۳۵۰

## باطنی قوت باطنی طاقت

جو لوگ صرف ظاہری ساز و سامان پر نظر رکھتے ہیں اور کامیابی کا راز اسی میں پو شیدہ جانتے ہیں ان کو غور کرنا چاہئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس کون سالا و لشکر اور ساز و سامان تھا۔ اور فرعون جیسے مشرک و عظیم الشان بادشاہ کے پاس کس چیز کی کی تھی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رسانی حقيقی رب العالمین پر توکل کر کے اس کے ارشاد کے ماتحت فرعون سے مقابلہ کرنے جاتے ہیں اور اپنے ساتھ صرف اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو لیتے ہیں اور ان کو بھی اس خیال سے لیتے ہیں کہ وہ فتح العیان ہیں اچھی شستہ تقریر

کریں گے اور میری تائید و تصدیق کریں گے کیونکہ تائید سے دل بڑھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول نقل فرمایا۔

### فارسلہ معنی الایہ

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے مقابلہ کے لئے تھا تیار ہو گئے۔ صرف تائید کے لئے حضرت ہارون علیہ السلام کو ساتھ لے کر اس کے بھرے اور پر شوکت دربار میں پہنچ گئے۔ اور خوب کڑک کر بلا جھگجھے گفتگو فرمائی۔ فرعون کی ہمت نہیں ہوئی کہ ان کو قتل کرادے۔ یا گرفتار کرادے۔ یا اور کوئی مقدمہ قائم کرادے۔ صرف زبانی گفتگو میں اتنا ضرور کہا انی لاظنک یہ موسیٰ مسحوراً، یعنی اے موسیٰ میرے خیال میں تو ضرور تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ترکی بہتر کی جواب دیا وانی لا ظنک یہ فرعون مثبتاً ہے۔ یعنی اے فرعون میرے خیال میں ضرور تیری کم بختنی کے دن آگئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی فرعون کو قتل وغیرہ کی ہمت نہ ہوئی۔ اور کیسے ہوتے اللہ کا وعدہ تھا و نجع لکما سلطاناً الایہ یعنی ہم دونوں کو خاص شوکت عطا کرتے ہیں جس سے تم پر ان لوگوں کو دسترس نہ ہوگی۔ تم دونوں اور تمہارے پیروکار ہی غالب ہوں گے۔

اب غور سمجھئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں یہ قوت و شجاعت یہ ہمت و جرأت یہ سطوت و شوکت کس مادی سامان کی وجہ سے تھی۔ ان کے پاس توب و بندوق نہ تھی، ہوائی جہاز اور تباہ کن گیس مینک نہ تھے۔ یہ قوت صرف حقانیت اور تعلق مع اللہ کی تھی۔ یہ تقویٰ اور احکام خداوندی کی اطاعت کا ثمرہ تھا۔ (اسعد الابرار مفہومات حضرت تھانوی ص ۳۶۸)

### خدا تعالیٰ فوج کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نصرت

اللہ تعالیٰ کی ایک فوج ہے یعنی فرشتے جن کو نہ گھوڑوں کی حاجت ہوتی ہے نہ اسلحہ کی ضرورت، نہ رسد کی محتاج ہوتی ہے نہ ملک کی منتظر اللہ تعالیٰ جس۔ چاہتے ہیں اس کا میا ب فوج کے ذریعے مسلمانوں کی نصرت فرمائے گز فرمندی (وکامیابی) کا تاج ان کے سر پر رکھ دیتے ہیں۔ اور اس فوج کے ذریعہ سے نصرت اب بھی (آج کے دور میں بھی) ہوتی ہے اور بہت مرتبہ اس کا ظہور ہوا ہے۔

ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزر اک لامبے زیادہ تعداد میں ہندوؤں نے ضلع اعظم گڑھ میں

مشنی بھر مسلمانوں پر حملہ کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس ناگہانی معرکہ میں مسلمانوں کو خاطر خواہ کامیابی عطا فرمائی تھی۔ بعض لوگوں نے بیان کیا کہ مقابلہ کے وقت جہاں تک نظر جاتی تھی بزر پوش مسلمان ہی نظر آتے تھے یہ بزر پوش لوگ غالباً فرشتے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے فرشتوں کی جماعت کو اپنے خاص بندوں کی حفاظت کے لئے بھیجا اور ان کو صرف کفار پر ظاہر کر دیا۔ مسلمانوں سے پوشیدہ رکھاتا کہ وہ پوری ہمت سے جدوجہد کو جاری رکھیں اور ان کی شان توکل میں کمی نہ آنے پائے۔ اور پھر آخرت میں بڑا اجر حاصل کریں۔

مدد کے لئے فرشتوں کے نازل ہونے کا مدار تقویٰ پر ہے، چنانچہ ارشاد ہے۔

ان تصبروا و تقووا و ياتو کم من فورهم هذا يمددكم ربكم بخمسة

الاف من الملائكة مسومين.

”یعنی اے مسلمانو! اگر تم کفار کے مقابلہ میں استقلال سے کام لو گے اور مقتی بنے رہو گے اور وہ تم پر اک دم ٹوٹ پڑیں تو تمہارا پروردگار تمہاری امداد پانچ ہزار خاص وضع کے فرشتوں سے فرمائے گا۔ (اسعد الابرار ملغو ناظات حضرت تھانوی ماحقہ ”سفر نامہ لاہور مطبوعہ لاہور ص ۳۶۶)

## تقویٰ کی ضرورت

۱:- تقویٰ سے اللہ تعالیٰ کا فضل شامل ہو جاتا ہے۔ اور سب مادی و طاغوتی طاقتیں حق تعالیٰ کے سامنے پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ تقویٰ کی وجہ سے ہر قسم کی کامیابی بندہ کو نصیب ہوتی ہے۔ قوت کی اصل روح تعلق مع اللہ ہی ہے۔

دیکھئے اگر ضلع کا گلکشہ کسی کا حامی و مددگار ہو تو وہ کس قدر بے خوف اور جری ہو جاتا ہے۔ اور کمشنر سے بھی تعلق ہو تو قوت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ بادشاہ کے تعلقات کو اسی پر قیاس کر لیجئے۔ اور جس کا تعلق رب العالمین، احکم الٰی کمین بادشاہوں کے بادشاہ سے ہو اس کی طاقت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۲:- مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کا راز اعمال صالحہ اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں ہے۔ لہذا اس پر پابندی کیجئے اور رحمت خداوندی سے ثمرات و نتائج کے امیدوار رہئے۔ یقین کیجئے کہ مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی رضاۓ الٰی کے ساتھ وابستہ ہے بغیر رضاۓ الٰی کے ہر قسم کی ترقی تنزلی ہے۔ اور رضاۓ الٰی کا حاصل ہونا اسلامی احکام کی پابندی ہی پر موقوف ہے۔

اب صرف یہ بات رہ گئی کہ تقویٰ اور تعلق مع اللہ کیسے حاصل ہو۔ تو سنئے تعلق مع اللہ اللہ تعالیٰ کے ظاہری و باطنی احکام پر اخلاص کے ساتھ عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

ہر شخص کو چاہئے حتیٰ الامکان احکام شرعیہ کی ظاہر اور باطن پابندی کرے خداۓ عز و جل کے سامنے گریہ و زاری کرے، گڑگڑائے اس طرز عمل سے انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد مسلمانوں کی حالت درست ہونے لگے گی اور مطلوب ترقی تک پہنچنا دشوار نہ رہے گا۔ (اسعد الابرار ص ۳۵۹)

### ناقابل انکار حقیقت

آج کل لوگوں میں مادہ پرستی کا غلبہ ہے۔ مادی ترقی ہی کو ترقی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ مادی وسائل پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اور ان پر ناز کیا جاتا ہے لہائی میں بھی مادی ہتھیار اور سامان جنگ کو نصرت دکامیابی کا سبب خیال کیا جاتا ہے۔ مالک حقیقی رب العالمین پر نظر نہیں کی جاتی۔

دیکھئے ابتدائے اسلام میں جتنے جہاد ہوئے ان میں عموماً کفار کے پاس ہر قسم کے ہتھیار کافی تعداد میں موجود تھے اور مسلمان ان کے لحاظ سے بالکل بے سرو سامان اور خالی ہاتھ کہے جانے کے مستحق تھے۔ غزوہ بدر میں اسلامی لشکر کے پاس صرف آٹھ تلواریں تھیں گوئیزے وغیرہ اتنے کم نہ تھے۔ اور جنگ دست بدست ہوئی جس میں تلوار زیادہ کار آمد ہوتی ہے اس پر طرہ یہ کہ کفار تعداد میں مسلمانوں سے تین گناہ تھے اور سب کے سب ہتھیار بند تھے۔ اور اس کے باوجود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کامیاب فرمایا کامیاب وفتح مندی نے ان کے قدم چوئے۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سب غزوہات میں کامیاب تر غزوہ بدر ہی کا ہے کیونکہ اس سے کفار کے حوصلے ہمیشہ کے لئے پست ہو گئے تھے اور ان کی سطوت و شوکت (غلبہ) ٹوٹ گیا تھا۔

توا ب غور کیجئے کہ یہ نصرت مادی ترقی کا نتیجہ تھی یا ایمان و اخلاص کی برکت تھی۔

(اسعد الابرار سفر نامہ لاہور مطبوعہ لاہور ص ۳۶۵)

### مسلمانوں کے مغلوب ہونے کی اصل وجہ

ایک مرتبہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب (نور اللہ مرقدہ) نے فرمایا کہ ترمذی میں یہ حدیث لئے یغلب اثنا عشر الفاعن قلتہ ”یعنی بارہ ہزار مسلمانوں کا لشکر قلت تعداد

(یعنی اقلیت) کی وجہ سے کبھی دشمنوں کے مقابلہ میں مغلوب نہ ہوگا، اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ یہ بات یقینی طور سے ثابت ہے کہ بارہ ہزار کیا، بارہ ہزار سے کہیں زائد تعداد کے لشکر اپنے دشمنوں سے شکست کھا گئے (اور آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بارہ ہزار سے کہیں زائد مسلمانوں کا لشکر اپنے دشمنوں سے مغلوب ہے پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟) حضرت مولانا کی برکت سے میرے ذہن میں جواب آ گیا۔

میں نے عرض کیا کہ حدیث شریف کا مضمون بالکل بے غبار ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عن قلة فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قلت (یعنی تعداد کی کمی) کی وجہ سے مغلوب نہ ہوگا "عن علته" نہیں فرمایا کہ کسی اور سبب سے بھی مغلوب نہ ہوگا۔ لہذا جہاں بارہ ہزار یا بارہ ہزار سے زائد لشکر شکست کھا گئے اس کی وجہ قلت (تعداد کی کمی) نہیں بلکہ کوئی دوسری علت ہوگی۔ چنانچہ اس کی تائید کتب حدیث و تاریخ سے بھی ہوتی ہے بلکہ قرآن شریف میں بھی غزوہ حنین میں اولاً مغلوب ہونا صراحتہ مذکور ہے حالانکہ غزوہ حنین میں مسلمان بارہ ہزار تھے لیکن پھر بھی پہلے مغلوب ہو گئے اور اس کی وجہ قلت نہیں تھی بلکہ ایک قلبی مرض یعنی خود پسندی و عجب تھا جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔

ولقد نصر کم اللہ فی مواطن کثیرہ و یوم حنین اذا عجبتکم کثرتکم  
”یعنی حق تعالیٰ نے بہت سے مقامات پر تمہاری مدد فرمائی، اور غزوہ حنین میں بھی

جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے۔“

حاصل یہ کہ مسلمانوں میں غزوہ حنین میں عجب و غرور پیدا ہو گیا تھا کہ ہم اتنے زائد ہیں اسی عجب کی وجہ سے شکست ہوئی اور جب اس گناہ سے توبہ کر لی اور معافی مانگ لی تو اسی میدان میں یہ ہزیست خورده (شکست کھایا ہوا) لشکر غالب آگیا جس کا ذکر اس آیہ کریمہ میں ہے۔

ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ

## اُصول و حُدود اعظم ضبط کے ساتھ کام کرنیکی ضرورت

ہر کام اصول سے ہو سکتا ہے، بے اصول تو گھر کا انتظام بھی نہیں ہو سکتا ملک کا کیا انتظام ہوگا۔ ہماری ہمسایہ قوم کس ہوشیاری اور چالاکی سے کام کر رہی ہے۔ یہ ساری بے اصولیاں اور بد انتظامیاں مسلمانوں ہی کے حصہ میں آگئی ہیں جس طرف کو ایک چلا اسی

طرف کو سب چل دیئے۔

آج سے پہلے بھی تو اسلام اور مسلمانوں پر اس سے بڑے بڑے حوادث پیش آئے ہیں۔ اس وقت اس کا عشرہ عشیر (دواں حصہ) بھی نہیں۔ مگر انہوں نے اس حالت میں بھی اسلام اور احکام اسلام کو نہیں چھوڑا۔

سلف کے کارناموں کو پیش نظر رکھ کر کچھ تو غیرت آنا چاہئے کہ تم تو معمولی معمولی باتوں میں احکام اسلام ترک کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ وہ حضرات عین تعالیٰ کے وقت میں بھی حدود کی حفاظت اور رعایت فرماتے تھے جس پر آج ہم کو فخر ہے۔

یہاں تک نوبت آ گئی ہے کہ زبانوں پر یہ آتا ہے یہ مسائل کا وقت نہیں کام کا وقت ہے کام کرنا چاہئے۔ میں کہتا ہوں اگر دین نہ رہا اور احکام اسلام کو پامال کرنے کے بعد کوئی کام بھی کیا تو وہ کام پھر دین کا نہ ہو گا۔ کیا یہ دین کی خیرخواہی اور ہمدری کی جا سکتی ہے؟

خلاصہ یہ کہ اصول کے تحت کام کرو۔ جوش سے کام مت لوہوں سے کام لو جو شکار انجام خراب نکلے گا۔ جوش سے اول تو کام نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔

حدود شرعیہ کی حفاظت رکھو۔ احکام اسلام سے تجاوز نہ ہو اصل چیز حدود کی رعایت ہے پھر اس میں اگر کامیابی نہ ہو تو صبر کریں۔ (الافتراضات الیومیہ ص ۹۹، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳)

## افسوس کا مقام

افسوس مسلمان مصیبت کے وقت سیاست میں دوسری قوموں کی دست نگری کرتے ہیں۔ حالانکہ سیاست میں بھی شریعت کے مکمل احکام ان کے پاس موجود ہیں۔ اور اسلامی سیاست تو وہ چیز ہے جس سے دنیا بھر کے سیاست وال سبق لیتے ہیں۔ مگر مسلمان ہیں کہ دوسروں کے محتاج ہیں۔ آج کل مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اپنے گھر کے جواہرات سے بے خبر ہیں اور دوسروں کی کوڑیوں کے محتاج ہیں۔

مسلمانوں نے بڑی غلطی کی۔ کہ ان (حالات) میں شریعت کی تعلیم کو بالکل چھوڑ دیا۔ واللہ! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم شریعت کو اختیار کرلو۔ تشویش (پریشانی) تمہارے پاس بھی نہ ہوگی۔ گو تشویشناک کیسے ہی واقعات پیش آئیں۔ کیونکہ مقیم شریعت کا حال یہ ہوتا

ہے کہ..... اس کی نظر ہر واقعہ اور ہر حالت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے۔ اس کے سوا کسی پر نظر نہیں ہوتی۔ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہورہا ہے محبوب کی طرف سے ہورہا ہے۔ پھر تشویش کیسی؟ بس اس کو تو یہ فکر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ راضی رہیں۔ پھر دنیا میں جو چاہے ہوتا رہے۔ چاند سورج بھی نکلیں یا نہ نکلیں اسے اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔

اس شخص کو مصیبت کے وقت یہ فکر تو ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ مجھ سے ناراض تو نہیں ہے۔ کہیں ناراضی کی وجہ سے تو یہ سزا نہیں دی۔ پھر جب غور کر کے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ ناراض نہیں ہے تو اب اس کا دل مضبوط اور منشرح ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی تکلیف میں اس کو راحت نظر آتی ہے۔ اور ایسے حالات میں گو وعدہ نہیں مگر اکثر یہ ہے کہ ایسے لوگ ظاہری واقعات تشویش سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اور باوجود قلت جماعت و قلت سامان کے غالب اور فائز رہتے ہیں۔ (حقیقتہ الصبر ص ۱۲۰، ۱۲۳)

## ہماری انجمنوں کی ناکامی کا سبب

آج کل جو انجمنیں قائم ہوتی ہیں اور ناکام رہتی ہیں اس کا زیادہ تر سبب یہی ہے کہ یہ زمانہ مل کر کام کرنے کا نہیں ہے کیونکہ ہر شخص دوسروں سے اپنی رائے کا اتباع کر دانا چاہتا ہے۔ اسی لئے انجمنوں کا کام نہیں چلتا کیونکہ انجمن کے اراکین جو دوسروں سے اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے اخلاق کی اصلاح تک بھی نہیں ہوئی ان میں کوئی کسی سے چھوٹا بن کر رہنے کو گوار نہیں کرتا۔ اس لئے بہت جلد اس میں اختلاف ہو جاتا ہے پھر ہر ایک اپنی رائے پر ضد کرتا ہے تو چار دن ہی میں انجمنوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ (الاندیاد مجلس حکیم الامت ص ۵۰)

افسوس! ہم دین کا کام سمجھ کر بھی کوئی کام کرتے ہیں تو اس کو بھی دنیا کے طریقے پر کرتے ہیں..... اس وقت در دنداں شریعت کی حالت یہ ہے کہ وہ بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود (اور آپ کی تعلیم کو) یاد کر کے رہتے ہیں۔ کہ ہائے امت میں کیا انقلاب ہو گیا ہے۔ مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے ان کا کوئی کام بھی تو ڈھنگ کا نہیں رہا۔ (السؤال ص ۲۸، مجلس حکیم الامت ص ۵۱)

## ہماری ناکامی کے اسباب

ہمارے بھائیوں میں اتباع کا مادہ نہیں اگر دین بھی کامل نہ ہو تو یہ مادہ تو ہو کہ کسی کی اتباع کریں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ یہ برباد ہیں۔

اور ایک سبب یہ ہے کہ ان میں نظم اور اصول کی پابندی نہیں ہے اگر یہ کام کریں اور انتظامی مادہ بھی ان میں ہو تو ادھر تو انتظام ادھر دین۔ پھر تو کھلی نصرت ہو گی۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں قیصر و کسری کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کیا جمیعت تھی۔ (اور کتنی ان کی تعداد تھی) مگر اہل دین تھے اور منظم تھے۔ اگر دین کے ساتھ انتظام صحیح ہو تو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ باقی غیر منظم صورت میں اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ (الافتات الیومیہ ص ۱/۳۶)

## عوام کی بدحالی

عوام کی حالت یہ ہے کہ جس نے مرضی کے موافق فتویٰ دے دیا یا کوئی عالم یا لیڈر ان کے ساتھ ہو لیا۔ اس میں سب کمالات ہیں اس کو عرش پر پہنچا دیں گے۔ اگر کسی نے مرضی کے خلاف کوئی بات کہہ دی تو تحت الخری میں اس کو جگہ ملنا مشکل ہے۔ (الافتات الیومیہ ص ۱/۱۳)

## دوسری قوموں کی ترقی اور ہماری ناکامی کے اسباب

غیر قوموں کو جو ترقی ہوتی ہے اس کے دوسرے اسباب ہیں وہ ان کی خاص صفات ہیں جو انہوں نے آپ ہی کے گھر سے لی ہیں۔ مثلاً منظم ہونا۔ مستقل مزاج ہونا، وقت کی پابندی ہونا، متحمل (یعنی برداشت کی صلاحیت) ہونا، انجام کو سوچ کر کام کرنا، صرف جوش سے کام نہ کرنا، جوش سے کام لینا، آپس میں اتحاد و اتفاق کرنا ایک دوسرے کے راز کو چھپانا۔

یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے اور ان احکام میں یہ خاصیت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ترقی ہوتی ہے۔ خواہ کوئی بھی اختیار کرے۔

اب مسلمانوں نے تو ان احکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ نہ ان میں اتحاد و اتفاق ہے، نہ رازداری کا مادہ ہے، نہ انتظام ہے، نہ وقت کی پابندی ہے، نہ انجام بینی ہے، جو کام کرتے ہیں جوش سے کرتے ہیں، جوش سے نہیں کرتے۔ اس لئے ان کو تزلیل ہے۔ اور غیر قوموں نے

ان کے گھروں سے چڑا کر ان باتوں پر عمل شروع کر دیا تو ان احکام کی خاصیت ظاہر ہوئی کہ ان کو ترقی ہونے لگی۔ (الصریحۃ بنذع البقرۃ۔ اشرف الجواب۔ معارف حکیم الامت ص ۲۰۷)

## آپسی اختلاف کا نقصان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (آپسی اختلاف اور) ناتفاقی کا نقصان بتلایا ہے فرماتے ہیں۔

ایا کم و فساد ذات البین فانہا ہی الحالقة  
یعنی اپنے کو باہمی فساد سے بچاؤ۔ کیونکہ باہمی فساد مونڈنے والی چیز ہے آگے فرماتے ہیں۔

لا اقول تحلق الشعور بل تحلق الدين

میں یہ نہیں کہتا کہ اس کے سر کے بال منڈ جاتے ہیں بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اس سے دین  
منڈ جاتا ہے۔ اور منڈ نا کے کہتے ہیں؟

منڈ نا یہ ہے کہ خربوزہ کا سارنکل آئے بال کا نشان تک نہ رہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ آپسی فساد سے دین کا بالکل صفائیا ہو جاتا ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناتفاقی اور باہمی فساد کے نقصان کو بتلایا ہے۔ اور واقعی اس سے زیادہ کیا نقصان ہو گا کہ اس سے دین کا بالکل صفائیا ہو جاتا ہے۔ مگر قربان جائیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ آپ کے عتاب میں بھی رحمت ہے۔

گواں مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپسی فساد پر بہت بڑی وعید بیان فرمائی ہے مگر ساتھ ساتھ اس میں امید کی بھی جھلک ہے۔ بالکل نا امید نہیں کیا کیونکہ آپ نے فساد کو حلقہ فرمایا ہے کہ یہ دین کو مونڈ دیتا ہے اور مونڈ نے سے اس وقت تو اور پر سے صفائیا ہو جاتا ہے۔ مگر اندر جڑ باقی رہ جاتی ہے..... آپ نے ڈرایا دھمکایا بھی اور یہ بھی بتلایا کہ نا امید مت ہونا (آپسی اختلاف) فساد سے دین کی جڑ نہیں جاتی اگر کوشش کرو گے تو جڑ سے شاخ اور شاخ سے پھل بھی نکل آئیں گے۔ (واعظ الارتباط۔ ارشادات حکیم الامت ص ۵۰۷)

## نا جائز کام پر اتفاق نہیں

اگر کسی جماعت نے معصیت (غلط کام) پر اتفاق کیا ہو تو ان کی مخالفت اور ان سے علیحدگی شرعاً مطلوب ہے۔ یا اتفاق تو معصیت پر نہ ہوا تھا لیکن اتفاق کے بعد وہ لوگ

معاصی (غلط کام) کرنے لگے تو اس وقت دینداروں کو ان سے الگ ہونا چاہئے۔

مگر افسوس ہے کہ آج کل جہاں دیندار اور بے دین لوگ کسی کام میں اتفاق کرتے ہیں۔ وہاں بے دین تو اپنے طریقہ پر پختہ ہوتے ہیں۔ اور نہ معلوم دیندار کیوں ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ بد دین تو وہی کرتے ہیں جو ان کے مزاج کے موافق ہو اور ان کی رائے میں مفید ہو۔ اور دیندار باوجود جان لینے کے کہ یہ کام ہمارے مذہب میں ناجائز یا حرام ہے۔ یا یہ طریقہ ہمارے نزدیک نقصان دہ ہے مفید نہیں۔ یا یہ کام ہماری جماعت کے مزاج کے خلاف ہے پھر بھی یہ بے دینوں کی ہاں میں ہاں ملا جاتے ہیں۔ تاکہ اتفاق میں فتور (خرابی) نہ آئے۔

سبحان اللہ! اتفاق تو جانبین سے ہوتا ہے۔ جب دوسری جماعت آپ کے جذبات کی رعایت نہیں کرتی تو اب وہ اتفاق ہی کہاں رہا۔ بس یہ کہو کہ تم ان کی خوشامد کر رہے ہو۔ اگر اتفاق ہوتا تو دوسرے بھی تمہاری کچھ رعایت کرتے۔ مگر لوگوں نے آج کل خوشامد کا نام اتفاق رکھ لیا ہے اس لئے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مخلوق طعنہ دے گی کہ انہوں نے اتفاق میں رخنہ ڈال دیا۔

میں کہتا ہوں تم اس طعنہ سے کیوں ڈرتے ہو۔ صاف کہہ دو کہ ہم نے اتفاق کو توڑ دیا۔ اس لئے کہ اتفاق ہر حال میں مطلوب و محمود نہیں بلکہ بعض دفعہ نا اتفاقی بھی مطلوب ہے جب کہ اتفاق سے دین کو نقصان پہنچ رہا ہو۔ (وعظ الانساد، اصلاح اسلامیں ص ۵۱۳)

### اتفاق قائم کرنے کا طریقہ

آج کل جو تقریروں میں کہا جاتا ہے کہ اتفاق کرو۔ اتفاق کرو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ سب میرے ساتھ اتفاق کریں۔ ہر شخص اپنی رائے پر اتفاق کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس طرح قیامت تک اتفاق نہیں ہو سکتا بلکہ اتفاق قائم کرنے کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص اس بات کے لئے آمادہ ہو کہ اگر کوئی میری اتباع نہ کرے گا تو میں اس کی اتباع کروں گا۔

اتفاق کی جزو تواضع ہے اس کے بغیر اتفاق نہیں ہو سکتا۔ اور آج کل اتفاق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص دوسرے کو اپنے سے متفق اور اپنی رائے کا تابع بنانا چاہتا ہے۔ اگر وہ دوسرا بھی ایسا ہی چاہے تو اتفاق کیسے ہو گا۔ اتفاق تو محض تواضع سے ہو گا۔ ہر شخص دوسرے کی

موافقت اور تقلید کے لئے تیار ہو ورنہ اتفاق دشوار ہے۔ اور اگر ہوا بھی تو محض زبانی اور کاغذی ہوگا۔ (الارتباط، ارشادات حکیم الامت ص ۵۰، ۱۱۵ و عظیم الانداد)

فرمایا اتحاد و اتفاق کی بنیاد ہمیشہ دین کی حدود پر قائم کرو اور کسی عالم سے مشورہ کر کے کام کرو۔ یہ اتحاد انشاء اللہ مضبوط ہوگا۔ اور یہ اتحاد اس وقت باقی رہے گا جب تقویٰ کی رعایت ہوگی۔ کیونکہ جب تقویٰ کی رعایت ہوگی تو خدا کا خوف ہوگا۔ اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کا خیال ہوگا۔ جب دوسروں کے حقوق ادا ہوتے رہیں گے تو پھر نا اتفاقی پیدا نہیں ہوگی۔ (شریعت و سیاست ص ۲۱)

## بماہی اصلاح اور اتحاد و اتفاق

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اگر مسلمانوں میں سے دو جماعتیں لڑنے لگیں تو ان کے درمیان اصلاح کرو۔ پھر بھی اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ لوٹ آئے خدا تعالیٰ کی طرف (یعنی حق و النصف کی طرف) اس سے دو باتیں معلوم ہوں میں ایک تو یہ کہ اول لڑائی کرنے والوں میں صلح کی کوشش کرو۔ دوسری یہ کہ اگر پھر بھی ایک ظلم پر کمر باندھے تو مظلوم کو تہامت چھوڑ دو بلکہ اس کی مدد کرو اور ظالم کے ظلم کو دفع کرو۔ (فرودع الایمان ص ۸۷)

بستی کے کسی ایک با اثر دیندار کو یا با اثر دینداروں کی جماعت کو اپنا بڑا بنا لیا جائے جن کا کام یہ ہو کہ لوگوں میں اتحاد و اتفاق قائم رکھیں اور جب کسی معاملہ میں جھگڑا ہو (یا کوئی بھی اہم معاملہ و حادثہ پیش آئے) اس کا شریعت کے موافق علماء سے پوچھ کر فیصلہ کر دیں (اعلان کریں) اور سب اس فیصلہ کی تائید کریں (اور اس کے موافق کارروائی کریں) سب مسلمانوں کو باہم اتحاد و اتفاق سے رہنے کی اور گالی گلوچ، لڑائی جھگڑا بند کرنے کی تائید کی جائے۔ (تفہیم المسلمین ص ۶)

حق کا تقاضہ یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا دو شخصوں میں اختلاف ہو تو پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ حق پر کون ہے اور نا حق پر کون جب حق متعین ہو جائے تو حق والے سے کچھ نہ کہا جائے اور باطل والے کو اس کی مخالفت سے روکا جائے۔ (تفہیم المسلمین ص ۶)

صلح کرانے کا یہ طریقہ نہیں جو آج کل زانج ہے کہ دونوں فریق کو کچھ کچھ دبایا جاتا ہے

یہاں تک کہ جس کا حق ہواں کو بھی دبایا جاتا ہے بلکہ صلح کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ جو نا حق پر ہواں کو دبایا جائے..... الغرض حق کی بنیاد پر صلح کراؤ اور اگر اس پر راضی نہ ہو تو سب مل کر غلط بنیاد کو ڈھادو۔ (ملفوظات کمالات اشرفی ص ۲۷)

### نظم و اتحاد باقی رکھنے کی اہمیت

فرمایا کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا باغیوں نے محاصرہ کر لیا یعنی گھیر لیا تو آپ کے شکریوں میں سے ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا، کہ باغیوں کا سردار نماز پڑھا رہا ہے، ہم لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھیں یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ پڑھو۔ اس فتوے کی بنیاد (اور مقصد) وہی نظم کی حفاظت تھی۔

ای طرح شرعی حکم ہے کہ اگر کوئی شخص عید کا چاند دیکھے اور حاکم شرعی اس کو قبول نہ کرے تو اس کو روزہ رکھنا واجب ہے۔ اور اگر نہ رکھا تو قضاۓ واجب ہوگی۔ یہ مجال نہیں کہ کوئی شخص تفرق کلمہ کا باعث ہو سکے اگرچہ اس نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہو۔ یہ سب انتظام ہی تو ہے۔ اتحاد اور نظم کے باقی رکھنے کا اس قدر شریعت میں اہتمام کیا گیا ہے۔ (مقالات حکمت ص ۲۰۲ مطبوعہ پاکستان)

### اتحاد امت کے لئے مسلکی اختلافات کو ختم کرنے کی ترغیب

ملت بیضاۓ کی شیرازہ بندی کے لئے اپنے اختلافات کو مٹانا بہت ضروری ہے مگر اس میں کچھ تفصیل ہے وہ یہ کہ جن عقائد میں شرعاً گنجائش ہے اس میں تو دوسروں سے بالکل تعریض نہ کیا جائے۔ جیسے حنفی شافعی کا اختلاف۔ اور جن میں گنجائش نہیں جیسے شیعہ کا اختلاف اس میں سکوت (خاموش رہنا) تو جائز نہیں۔ خصوصاً جب کہ سنی ادھر ہونے لگیں یا سنی کو کوئی ادھر لے جانے لگے اس وقت تعریض ضروری ہو گا۔

لیکن شفقت و محبت اور خیر خواہی و نرمی سے جیسے اپنا کوئی جوان بیٹا ماریض بد پر ہیزی کرنے لگے۔ جس طرز سے اس کو بد پر ہیزی سے روکا جاتا ہے بس وہ طرز ہونا چاہئے۔ تاکہ آپس میں مداوت (اختلاف) ہو کر دوسری مخالف اسلام قوموں کے مقابلہ میں کمزور نہ ہو جائیں۔

میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ملت بیضاۓ کی شیرازہ بندی (اور اتحاد امت) کی خاطر اپنے

اختلافات کو مٹا کر مسلمانوں کو اس خطرہ سے بچا لیں جس کا موجودہ شکلش کی صورت میں پیش آنا ناگزیر ہو۔ (امداد القتاوی ص ۵۱/۲)

## تین غلطیاں جس کی وجہ سے مسلمان ناکام ہیں دستور العمل، نظام العمل

اس کا سبب چند غلطیاں ہیں:-

- ۱:- توکل کا غلط استعمال توکل (یعنی اللہ پر بھروسہ کرنا) تو فرض ہے ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ سے براہ راست ایسا تعلق رکھنا چاہئے کہ کسی چیز کی پرواہ نہ کرے یہی اعتقاد رکھئے کہ جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن توکل کا استعمال (مسلمان) خلاف محل کرتے ہیں۔ (یعنی ظاہری تدبیروں پر ہی ان کا پورا اعتماد ہے یہ پہلی بڑی غلطی ہے)
- ۲:- دوسری غلطی یہ ہے کہ جو کام کرتے ہیں جو شکر کے ماتحت کرتے ہیں اگر ہوش کے ماتحت کام کریں۔ تو بہت جلد کا میاب ہو جائیں۔

- ۳:- تیسرا غلطی یہ کہ ہر کام کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا واجب تھا کہ شریعت مقدسہ کا اس کے تعلق کیا حکم ہے۔ پھر اللہ رسول کی بتلائی ہوئی تدبیر پر عمل کرے۔

## نظام العمل

صحیح نظام کا حاصل یہ ہوا کہ:-

- ۱:- جو شکر کے ماتحت کوئی کام نہ کرے۔ ہوش کے ماتحت کرے۔
- ۲:- اپنی قوت کو ایک مرکز پر جمع کر لیں۔
- ۳:- تیسرا آپس میں اتحاد و اتفاق رکھیں۔
- ۴:- احکام کی پابندی کریں جن میں توکل بھی داخل ہے۔
- ۵:- نیز جو بھی کام کریں اس میں کامیابی کیلئے خدا سے دعا کریں۔ پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اگر ایسا کریں تو میں دعویٰ کے ساتھ خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے کہتا ہوں گہ چند روز میں کایا پٹ جائے گی۔ بہت جلد مسلمانوں کی مصیبتوں اور تکلیفوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ (شریعت و میاست ص ۲۷)

## کام کرنے کا طریقہ

۱:- اصل چیز یہ ہے کہ مسلمانوں میں دین پیدا ہو۔  
 ۲:- ان کی قوت ایک مرکز پر جمع ہو۔  
 ۳:- ان کا کوئی امیر ہو۔ میں بقیم عرض کرتا ہوں اور خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر مسلمان مضبوطی کے ساتھ اپنے دین کے پابند ہو جائیں۔ اور تمام آپس کے جھگڑوں کو ختم کر کے متعدد ہو جائیں۔ اور اپنی قوت کو ایک مرکز پر جمع کر لیں۔ اور جس کو اپنا خیر خواہ سمجھ کر بڑا بنا لیں اس کے کہنے اور مشوروں پر عمل کریں۔ اس کی اتباع سے اعراض نہ کریں تو پھر نہ اس کو کسی کی شرکت کی ضرورت نہ کسی سے خوف نہ ان کا کوئی کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ (الافتتاحات الیومیہ ص ۱/۱۲۲)

## کیسے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہئے

میں تو کہتا ہوں کہ جو کام تنہا ہو سکے وہ جمیع کے ساتھ مل کر ہرگز نہ کرو اکثر دیکھا ہے کہ جمیع میں کام بگڑ جاتا ہے دنیوی کامیابی بھی اکثر نہیں ہوتی۔ اور اگر کبھی کچھ دنیا میں بھی کوئی تو دین کا ستیانا س ہو جاتا ہے اور جو کام تنہا ہو سکے جمیع کے ساتھ ہی ہو سکتا ہو اور اس کے لئے اگر دینداروں کا جمیع میسر ہو جائے تو کرو۔ بشرطیکہ سب دیندار ہوں۔ یاد دینداروں کا غلبہ ہو۔ اور اگر غلبہ دنیاداروں کا ہو اور دیندار مغلوب یا تابع ہوں تو ایسے جمیع کے ساتھ کام کرنا واجب نہیں۔ اس وقت آپ اس کام کے مکلف ہی نہ رہیں گے کیونکہ یہ جمیع بظاہر جمیع ہے۔ اور حقیقت میں یہ تشتت (افتراء جدائیگی) ہے۔

وہی حال ہو گا۔ کہ تحسبہم جمیعاً و قلوبہم شتی (تم ان کو جماعت گمان کرتے ہو۔ حالانکہ ان کے قلوب متفرق ہیں۔)

تو یوں کہنا چاہئے کہ جمیع میسر ہی نہیں۔ پھر جو کام اس پر موقوف تھا وہ واجب یا فرض کیوں کر ہو گا۔ (الانساد، اصلاح اسلامیہ ص ۱۱۵)

## مقاصد کی تحریک کے لئے کیا کرنا چاہئے

حکام سے تو مقابلہ نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ وہ ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ اور اپنے مقاصد کی تحریک میں سب سے بہتر اور نافع تدبیر یہ ہے کہ مسلمانوں کو قaudہ کے موافق کارروائی کرنا چاہئے۔ اور جو واقعہ پیش آئے۔ حکام کو اس کی اطلاع کی جائے اور اس پر جو تجویز کریں۔ اس پر کار بند ہوں۔ اگر پھر کوئی واقعہ خلاف واقع ہو تو حکام بالا (اوپر کے حاکموں) کو اطلاع کریں۔ اگر وہاں سے بھی ناکامی ہو صبر کریں ایسی شورش (اور مقابلہ) نہ کریں کہ نفع سے زیادہ نقصان ہو جائے۔ (الافاضات الیومیہ ص ۲/۱۱۶)

شریعت میں دو ہی صورتیں ہیں۔ وقت کے وقت مقابلہ اور عاجزی کے وقت صبر خدا معلوم۔ یہ تیسری صورت۔ بخوبی گرفتار ہو جانے کی کہاں سے نکالی۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱/۱۹)

## حکام سے مقابلہ کرنا کوئی عقلمندی نہیں

حکام سے تو مقابلہ نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ وہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میں مسلمانوں سے کہا کرتا ہوں کہ اپنے وقت کے حکاموں کو ناراض نہ کرو یہ طریقہ بہت نقصان پہنچا سکتا ہے..... ایسا کوئی کام نہ کرنا چاہئے جس میں حاکم کی ناراضگی ہو۔ کیونکہ اس کا انجام قریب بہ ہلاکت ہے اور بھی مدت تک مسلمانوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور ایسے خطرات سے نفس کی حفاظت کرنا شرعاً مطلوب ہے۔

بعض نوجوان کہا کرتے ہیں کہ ہم تو جو کچھ کرتے ہیں قانون کے اندر کرتے ہیں خلاف قانون کچھ نہیں کرتے پھر حکام کیا کر سکتے ہیں میں نے کہا قانون ان کے ہاتھ میں ہے جس بات کو تم خلاف قانون نہیں سمجھتے ہو وہ اس کو بھی کسی ترکیب سے خلاف قانون کر دیں گے اور شریعت کا حکم ہے ولا تلقوا بایدیکم الی التہلکہ کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (بیان القرآن ص ۱۰/۱)

مقدمہ تو حاکم کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کے چاہے موافق کر دے۔ حاکم کو مقدمہ کا بدلنا کیا مشکل ہے۔ ہیر پھیر کر وہ جس طرح چاہے بنادے۔ (التبغیح ص ۱۲/۸۲، ۸۳)

اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا مومن کی شان نہیں

ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة

اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مومن کو لا تلق نہیں کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کیا مراد ہے۔ فرمایا نفس کو ذلیل کرنا یہ ہے کہ جس بلا کو برداشت نہ کر سکے اس کا سامنا کرے۔ (ترمذی)

فائدہ:- یہ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے پریشانی بڑھتی ہے۔ اگر حکام کی طرف سے کوئی ناگوار واقعہ (ظلم و استبداد) کا پیش آئے تو تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کر دو اگر پھر بھی حسبِ مرضی انتظام نہ ہو تو صبر کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ کہ تمہاری مصیبت دور ہو۔ (حیاتِ مسلمین روحِ دہم ص ۱۲۵)

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ رأيتم امراً لا تستطعون تغييره

فاصبروا حتى يكون الله هو الذي يغيره (جمع الفوائد ص ۱۹۸)

ترجمہ:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم کسی ایسے (ناگوار) معاملہ کو دیکھو جس کے بدلنے (اصلاح) کی طاقت نہ رکھتے ہو تو صبر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ ہی اس کو بدل دے۔

شریعت میں دو ہی صورتیں ہیں قوت کے وقت مقابلہ اور عاجزی کے وقت صبر۔

(الافتراضات الیومیہ ص ۱/۱۹)

ظاہری قوت کے اعتبار سے جب ہم کچھ نہ کر سکتے ہوں

حدیث میں ایک قصہ آیا ہے کہ ایک دفعہ مکہ میں ایک اونٹ ذبح ہوا تھا آپس میں کفار کا مشورہ ہوا کہ کوئی شخص اس کی آلا ایش (اوجھڑی) آپ پر رکھ دے ایک بدجنت اٹھا اس وقت آپ نماز پڑھ رہے تھے سجدہ میں تھے اس نے آپ پر وہ آلا ایش رکھ دی کیونکہ یہ جانتے تھے کہ یہ ایسے رسول ہیں کہ نماز توڑ کر تھپڑنہیں ماریں گے۔ حضرت فاطمہ کو علم ہوا آئیں اور اس کو

ہٹایا۔ اس وقت آپ پچھی تھیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد بدعکی۔

اس قصہ سے معلوم ہوا کہ (اس وقت آپ) مقابلہ میں آ کر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ آپ تو اکیلے تھے وہ جو کچھ چاہتے کر سکتے۔ کہیں یا ہوتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نکال دیں۔ مگر آپ کو خدا نے رعب اتنا دیا تھا کہ کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ (روح الجوار ۲۲۵)

(اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت ظاہری قوت کے لحاظ سے کچھ نہ کر سکتے ہوں اس وقت اللہ سے دعا اور صبر کرنا چاہئے)

### ہنگامی حالات میں کیا کرنا چاہئے

اور اگر کوئی بات حکام وقت سے کہنے کی ہو تو اپنے بڑوں سے مشورہ کر کے حکام کو اطلاع کر دو۔ اب جو حکام ان کے کرنے کا ہے وہ خود کریں۔

اگر پھر بھی تم پر کوئی ناگہانی آفت آجائے (ظلم زیادتی ہو) تو وقت پر صبر کرو۔ اور اگر کوئی ہنگامہ ہو جائے تو تم کو لازم ہے کہ خود ظلم نہ کرو۔ اور اپنی حفاظت کرو۔ اس صورت میں غالب توجیہ ہے کہ دوسرا بھی ظلم سے باز آجائے گا اور اگر وہ ظلم ہی کرے تو تم شہید ہی ہو جاؤ گے۔ اس میں بھی مسلمان ہی کا نفع ہے۔ (حقیقتہ الصحر ص ۱۳۸)

### حکومت کے ظلم کا علاج

اگر حکام ظلم کرنے لگیں ان کو برامت کہو۔ سمجھ جاؤ کہ ہم سے حاکم حقیقی (یعنی پروردگار عالم) کی نافرمانی ہوئی ہے یہ اس کی سزا ہے۔ یعنی اپنی حالت درست کرو۔ اللہ تعالیٰ حکام کے قلوب کو نرم کر دیں گے۔ (تکمیل الدین ج ۲ ص ۳۱)

اگر حاکم سے کوئی امر خلاف طبع پیش آئے..... اس کی نرم مزاجی کے لئے دعا کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اہتمام کرے تاکہ اللہ تعالیٰ حکام کے دل کو نرم کریں۔ ایک حدیث میں یہ مضمون آیا ہے۔ (حقوق الاسلام ص ۱۰)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اللہ ہوں، بادشاہوں کا مالک ہوں۔ ان کا دل میرے ہاتھ میں ہے۔ پس جو شخص میری اطاعت کرتا ہے میں ان بادشاہوں کا دل اس پر مہربان

کر دیتا ہوں۔ اور جو میری نافرمانی کرتا ہے میں انہیں بادشاہوں کو اس شخص پر عقوبت (سزا کے لئے) مقرر کرتا ہوں۔ تم بادشاہوں کو برا کہنے میں مشغول مت ہو۔ میری طرف رجوع کرو میں ان کو تم پر زرم کر دوں گا۔ (جزء الاعمال ص ۹)

### اپنی حفاظت کا سامان اور انتظام رکھنا

ابوالسائب حضرت ابوسعید خدری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک اجازت لینے والے سے) فرمایا کہ اپنا ہتھیار ساتھ لے لو مجھ کو بنی قریظہ سے (جو کہ یہودی اور دشمن تھے) اندیشہ ہے چنانچہ اس شخص نے ہتھیار لے لیا اور گھر چلا گیا۔ (مسلم) فائدہ:- جس موقع پر دشمنوں سے ایسا اندیشہ ہو اپنی حفاظت کے لئے جائز ہتھیار اپنے ساتھ رکھنے کا اس سے ثبوت ہوتا ہے۔ (حیات المسلمين ص ۱۲۲)

انبیاء علیہم السلام کا مسنون طریقہ تھا کہ ہاتھ میں لانھی رکھتے تھے اس واسطے مسلمانوں کو اس سنت پر کار بند رہنا چاہئے۔ (تجدید تعلیم و تبلیغ ص ۱۹۵)

جن اسلوکی قانون سے اجازت ہے یا ہو سکتی ہے (ان کو ضرور رکھنا چاہئے)۔

عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک سوار ایک شیطان ہے اور دوسوار دو شیطان ہیں۔ اور تین سوار قافلہ ہے۔ (ترمذی)

فائدہ:- یہ اس وقت تھا جب کہ اے کے دے کے کو دشمن کا خطرہ تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی ضرورت کا سامان ضروری ہے۔ (حیات المسلمين ص ۱۲۳)

### اگر طالم قوم مسلمانوں کی جان لینے اور حملہ کرنے پر

### آمادہ ہوں تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے

اگر کسی مخالف قوم کی طرف سے کوئی شورش ظاہر ہو تو حکام کے ذریعے اس کی مدافعت کرو۔ خواہ وہ خود انتظام کر دیں۔ خواہ تم کو انتظام کی اجازت دیں۔ اور اگر حکام ہی کی طرف سے کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کر دو۔ اگر پھر بھی

انظام نہ ہو تو صبر کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ تمہاری مصیبت دور ہو۔  
لیکن اگر کہیں ظالم لوگ چھوڑ دینے پر نہ مانیں اور جان ہی لینے پر آمادہ ہوں تو  
مسلمانوں کو مقابلہ پر مضبوط ہو جانا ہر حال میں فرض ہے۔ گوکمزور ہی ہوں۔

وَهَذَا مِنْ بَابِ الْقَتْالِ حِيثُ تَفْرُضُ عِيْنَا اذَا هَجَمَ الْعَدُوُّ لِمَنْ بَابَ  
الْاَكْرَاهِ خَلَاصَهُ يَكْهُتِ الْاَمْكَانِ فَتَنَزَّلُ فَسَادُ الْوَامِنَ كَمَا تَحْدُدُ فَعَنْ كُرَيْسِ۔ اور جو کوئی اس پر بھی  
سر ہی ہو جائے تو پھر مرتا کیا نہ کرتا بقول سعدی۔

چوں دست از ہمہ حیلتے درگست      حلال است بردن بشمشیر دست  
اگر صلح خواهد عدو سر پیچ      وگر جنگ جوید عنان پر پیچ  
(حیات اُسلمین ص ۱۷۹)

ترجمہ:- (جب تم حیلوں سے ہاتھ خالی ہو جائے تو اب ہاتھ میں تلوار اٹھالینا جائز ہے)  
اگر دشمن صلح چاہے تو سرمت موزو۔ اور اگر جنگ ڈھونڈے تو لگام مت پھیرو (بلکہ تیار ہو جاؤ۔)

### دفاعی تدبیر اختیار کرنا

جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے مقابلہ کرنا  
اپنی جان و مال و دین و آبرو کی حفاظت کے لئے لڑنا درست ہے اگر مارا گیا شہید  
ہوگا۔ اگر مقابلہ مارا گیا اس شخص پر کوئی الزام (گناہ) نہیں۔ (تعلیم الدین ص ۳۹)

حدیث میں ہے من قتل دون عرضہ و مالہ فهو شہید۔

یعنی جو شخص اپنی عزت اور مال کی (حفاظت میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے)

(اس حدیث میں) قتل سے مراد خود کشی نہیں بلکہ مراد قتال ہے یعنی لڑ و اور جنگ کرو۔  
اس نیت سے کہ جان اور ایمان اور مال نجی جائے۔ پھر اس قتال میں اگر جان چلی جائے تو چلی  
جائے وہ شہادت ہے۔ خود قتل مقصود نہیں بلکہ قتال سے اگر لازم آجائے (یعنی مقابلہ میں اگر  
مقتول ہو جائے) تو اس کا جواز نکلتا ہے۔ غرض اس سے مقصود (قتال ہے قتل نہیں اور وہ بھی  
جب کہ اس قتل کی سب شرطیں پائی جائیں اور موافع مرتفع ہوں جس کی تفصیل کتب فقہ میں

ہے۔ ("حاصل یہ کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کا اور زیادہ جانی و مالی نقصان نہ ہو۔ ورنہ بڑے نقصان سے بچنے کے واسطے چھوٹا نقصان برداشت کرنا آسان ہے،") (افتراضات الیومیہ ص ۱۱۲)

## اگر حکومت ظلم کرے تو تم ظالم نہ بنو

اگر کوئی ہنگامہ ہو جائے (اور حکومت ہی تم پر ظلم کرے) تو تم پر لازم ہے کہ تم خود ظلم نہ کرو اور اپنی حفاظت کرو۔ اس صورت میں غالب تو یہ ہے کہ دوسرا بھی ظلم سے باز آئے گا۔ اور اگر وہ ظلم ہی کرے تو تم شہید ہو جاؤ گے۔ اس میں بھی مسلمان کا نفع ہے۔

شہادت وہ چیز ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے لئے ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔

"اللهم ارزقنى شهادة في سبيلك" اے اللہ مجھے اپنی راہ میں شہادت نصیب فرما۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تمنا کیا کرتے تھے۔ وددت ان اقتل في سبيل

الله ثم احيي ثم اقتل ثم احيي ثم اقتل ثم احيي۔

ترجمہ:- میں تمنا کرتا ہوں کہ اللہ کے راستے میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں۔ پھر قتل کیا جاؤں۔ مگر اتنی بات پھر کہے دیتا ہوں کہ جان دینا اسی وقت شہادت ہے جب شریعت کے موافق ہو ورنہ خوکشی ہے (جو کہ حرام ہے) (حقیقتہ الصبر ص ۱۳۸)

## ظالم سے بدلہ لینے کے حدود

وجزاء سیئة سیئة مثلها فمن عفا واصلح فاجره على الله انه لا

يحب الظالمين۔ (شوری)

ترجمہ و تشریح:- برائی کا بدلہ لینے کے لئے ہم نے یہ اجازت دے رکھی ہے کہ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ بشرطیکہ وہ فعل فی نفسہ معصیت (یعنی گناہ) نہ ہو پھر انقام کی اجازت کے بعد جو شخص معاف کر دے اور اصلاح کر لے جس سے عداوت جاتی رہے۔ اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے اور جو بدلہ لینے میں زیادتی کرنے لگے تو یہ سن لے کہ واقعی اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اور جو زیادتی نہ کرے بلکہ اپنے اپنے پر ظلم ہوچنے کے بعد برابر کا بدلہ لے سوائے

لوگوں پر کوئی الزام نہیں۔ الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، خواہ ابتدا میں یا انتقام کے وقت۔ اور نا حق دنیا میں سرکشی کرتے ہیں۔ ایسوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (بیان القرآن شوری)

(خلافہ یہ کہ آیت سے بدلہ لینے کا جواز معلوم ہوتا ہے لیکن) اس عموم سے غیر مشرع (یعنی ناجائز طریقے) مستثنی ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی کسی کے ساتھ بد فعلی (بدکاری زنا وغیرہ) کرے تو بدلہ میں (بد فعلی کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں، اسی طرح ایسی بد قوی بھی مستثنی ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص/۳۶۵)

## مقابلہ کے لئے قدرت کی شرط اور شرعی قدرت کی تعریف

قدرت کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں اس پر تو ہم کو قدرت ہے لیکن اس کے کرنے کے بعد جب خطرات کا سامنا ہو گا ان کے دفع کرنے پر قدرت نہیں۔ دوسرے یہ کہ فعل پر بھی قدرت ہے اور اس کے کر لینے کے بعد جو خطرات پیش آئیں گے ان کی مدافعت پر بھی بظن غالب عادتاً قدرت ہو۔

پہلی صورت استطاعت لغویہ ہے، اور دوسری صورت استطاعت شرعیہ ہے، جس کو اس حدیث نے صاف کر دیا ہے من رای منکم منکرا الی اخر الحدیث ظاہر ہے کہ استطاعت بالسان (یعنی زبان سے منع کرنے کی قدرت) ہر وقت حاصل ہے، پھر اس کے انتقام (نہ پائے جانے) کی تقدیر کب محقق ہوگی یعنی اگر کسی فعل کی فرضیت کے لئے م Hispan فعل (یعنی اس کام کو کر لینے) پر قادر ہونا کافی ہو اور اس سے جو خطرات پیش آنے والے ہوں ان کی مدافعت پر قادر ہونا شرط نہ ہو تو زبان سے انکار کرنا ہر حالت میں فرض ہونا چاہئے کیونکہ زبان کا چلانا ہر وقت ہماری قدرت میں ہے۔ پھر وہ کون سی صورت ہوگی جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر زبان سے مٹانے کی قدرت نہ ہو تو دل سے مٹادے (یعنی برا سمجھے)۔

اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت (قدرت) سے مراد یہ ہے کہ اس فعل (کام) پر قدرت ہونے کے ساتھ اس میں ایسا خطرہ بھی نہ ہو جس کی مدافعت (دفع کرنا) مقابلہ کرنا

بظن غالب عادتاً ناممکن ہوا ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں بتلانہ ہو جائیں۔ مدافعت (مقابلہ) کی فرضیت کے لئے پہلی استطاعت کافی نہیں بلکہ دوسری استطاعت شرعیہ شرط ہے۔ (آفادات اشرفیہ و رسائل سیاسیہ ص ۱۰)

اگر کامیابی کی توقع غالب نہ ہو تو ایسے افعال (یعنی مقابلہ کرنا) جائز نہیں نہ ان میں اجر ہے۔ (لتبلیغ ص ۶/۱۲۹)

## بہادری دکھانا ہر موقع پر کمال نہیں

بہادری ہر موقع میں کمال نہیں، اور جان دینا ہر وقت دین کا کام نہیں بلکہ جس وقت خدا کا حکم ہوا س وقت جان دینا دین ہے ورنہ اتباع نفس ہے اگر کسی موقع میں خدا تعالیٰ جان دینے سے منع کر دیں، اس وقت جان کی حفاظت فرض ہے۔

دیکھو شریعت نے ایک وقت میں نماز کو حرام کیا اور پاخانہ میں جانا فرض کیا ہے۔ اس وقت نماز پڑھنے سے گناہ ہو گا۔ اور پاخانہ میں جانے سے ثواب ہو گا۔ فقہاء نے صاف تصریح کی ہے کہ پیشاب پاخانہ کے تقاضہ کے وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریکی ہے اور پیشاب پاخانہ سے فارغ ہونا واجب ہے۔

اب جو سچے مسلمان ہیں وہ ہر وقت حکم کا اتباع کرتے ہیں خواہش نفس کا اتباع نہیں کرتے ایک وقت ان کا جی چاہتا ہے کہ نماز پڑھیں مگر شریعت حکم دیتی ہے کہ پاخانہ جاؤ تو وہ شریعت کے حکم کو نفس کی خواہش پر مقدم کریں گے اس میں ان کی جماعت فوت ہو جائے اور لوگ ملامت کریں مگر ان کو ملامت و بدنامی کی پرواہ نہیں ہوتی۔

اسی طرح اگر کسی وقت بہادری کا جوش ہو اور دین کے لئے جان دینے کا تقاضا ہو مگر شریعت اجازت نہ دے تو وہ اپنے تقاضے کو روک لیں گے اور شریعت کے حکم کا اتباع کر کے جان کی حفاظت کریں گے۔ گواں میں ان پر چاروں طرف سے ملامت (بدنامی) ہو کہ بڑا بزدل ہے جان دینے سے ڈرتا ہے جیل خانہ جانے سے گھبرا تا ہے مگر سچے مسلمان اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ (ان کی شان یہ ہوتی ہے کہ) ”وَلَا يَخافُونَ لِوْمَةَ لَا تَمَ“ (وہ کسی کی ملامت سے ڈرتے نہیں) سچے مسلمان کو اللہ کی رضا کے سامنے بدنامی اور رسوانی کی پرواہ کبھی نہیں ہوتی۔

## موت سے نہ ڈرنا کب قابل تعریف ہے

موت سے نہ گھبرانا (نہ ڈرنا) اسی وقت محمود ہے۔ جب حق تعالیٰ کی محبت (اور اتباع دین و شریعت کے تابع) ہو ورنہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو گناہوں میں مبتلا ہونے کے باوجود یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایسے بہادر ہیں ویسے بہادر ہیں ہم جیل خانے سے نہیں ڈرتے، ہم کو موت کا ڈر نہیں، سو چونکہ اس کا نشانہ محض اتباع نفس اور دعویٰ ہے اس لئے کوئی کمال نہیں بلکہ مذموم جرأت مندی ہے مخلص ڈینگیں نہیں مارا کرتا، دعوے کرنا اور ڈینگیں مارنا اتباع نفس کی علامت ہے۔ اور یہ کوئی کمال نہیں ایسے مشہور لوگ تو کفار میں بھی ہوتے ہیں ان کو بھی جیل خانے کا خوف نہیں ہوتا، نہ موت کا اندریش، اگر یہ کچھ کمال ہے تو ان کافروں کو بھی صاحب کمال کہنا چاہئے جو کہ موت سے نہیں ڈرتے، پھانسی کے وقت بعض کفاروں نے بھی جرأت ظاہر کی ہے، مگر ظاہر ہے کہ کفر کے ساتھ کوئی دینی کمال جمع نہیں ہو سکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ تھواڑ (لا پرواہی سے، بہادری دکھانا) دینی کمال نہیں۔ دینی کمال بس یہ ہے کہ جہاں خدا کہے وہاں خوشی سے جان دو ورنہ اپنی جان کو آرام دو، خدا کی مرضی کے موافق جب آدمی جان دیتا ہے تو اس کو عین موت کے وقت بھی راحت نصیب ہوتی ہے۔ (تقلیل الاختلاطص ۳۱۰)

## محض جان دے دینا کوئی کمال نہیں

جان دینا تو کوئی مشکل نہیں مگر یہ تو اطمینان ہو کہ اپنے مصرف پر گئی جان بھی دی اور خلیجان مول لیا کہ جس کام کے لئے جان دی ہے وہ دین ہے یا نہیں۔ یوں ہی بیٹھے بٹھائے جا کر جان دے دینا کون سی انسانیت ہے۔ (الافتادت الیومیہ ص ۱/۱۲۲)

جان خدا کی امانت ہے اگر ہماری ہوتی لا تقتلوا نفسکم (خود کشی نہ کرو) کا حکم نہ ہوتا۔ مال جو کہ کمایا ہوا ہے وہ بھی ہمارا نہیں جان ہماری کیوں ہوتی۔ خدا کے لئے جان کیا چیز ہے۔ مگر یہ تو اطمینان ہو کہ یہ یقیناً خدا کے واسطے صرف ہوتی، تذبذب (شک) کی حالت میں جان دینا کیوں جائز ہوگا، ہم کو تو حکم ہے کہ تذبذب کی حالت میں جب کہ کفار کی اباحت دم (یعنی ان کی جان لینے کے جواز) میں تردہ ہو کفار کی بھی جان نہ لیں۔ (الافتادت الیومیہ ص ۱/۳۶)

## جان ہماری ملک نہیں کہ جس طرح چاہیں تصرف کریں

مسلمانو! یہ جان خود اپنی نہیں ہے کہ جس طرح چاہیں آپ اس میں تصرف کریں، بلکہ خدا تعالیٰ کی امانت ہے اس کو خدا کے حکم کے بغیر صرف کرنا جائز نہیں اور اسی بناء پر خودکشی سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ **وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ** (کہ اپنے آپ کو قتل نہ کرو)۔ اللہ والوں کو یہ مسئلکہ پوری طرح منکشf ہو گیا ہے کہ یہ جان ہماری نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی چیز ہے اس لئے وہ اپنی جان کی بہت حفاظت کرتے ہیں۔ اور کوئی کام خدا کی رضا کی نیت کے بغیر نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں اللہ تعالیٰ جان دینا پسند کرتے ہیں۔ تو وہ سب سے زیادہ جان دینے میں دلیر ہوتے ہیں۔ اور جب یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں جان دینا خدا کو پسند نہیں تو وہ سب سے زیادہ اپنی جان کی حفاظت کرتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو اپنے جسم اور روح سے بہت محبت ہے حالانکہ حقیقت میں ان کو خدا سے محبت ہے اور اس وجہ سے خدا کی ہر چیز سے محبت ہے۔۔۔۔۔ ان کو اپنے اعضاء سے محض اس لئے محبت ہے کہ یہ خدا کی امانتیں ہیں اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کی تعمیل ہوتی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں۔ (الحمد لله رب العالمين ۱۵۶/۱۵)

## دشمن سے مقابلہ کی تیاری کا حکم

وَاعْدُو اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور ان (دشمنوں) کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے قوت تیار کرو۔

(انفال آیت ۶۰)

فائدہ:۔ اس میں قوت کی حفاظت کا صاف حکم ہے۔

مسلم شریف میں عقبہ بن عامر کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفسیر تیر اندازی کے ساتھ منقول ہے۔ اور اس کو قوت اس لئے فرمایا کہ اس سے دین اور دل میں بھی مضبوطی ہوتی ہے اور اس میں جو دوڑنا بھاگنا پڑتا ہے تو بدن میں بھی مضبوطی ہوتی ہے۔ اور یہ اس زمانہ کا ہتھیار تھا اس زمانہ میں جو ہتھیار ہیں وہ تیر کے حکم میں ہیں۔

عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ تیر اندازی بھی کیا کرو۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

فائدہ:- سواری سیکھنا بھی ایک ورزش ہے جس سے قوت بڑھتی ہے۔ انہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ جس نے تیر اندازی سیکھی پھر چھوڑ دی وہ ہم میں سے نہیں۔ یا یہ فرمایا کہ اس نے نافرمانی کی۔

فائدہ:- اس سے کس قدر قوت کی حفاظت کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔ جب قوت اللہ کے نزدیک ایسی پیاری چیز ہے تو اس کو باقی رکھنا اور جو چیزیں قوت کم کرنے والی ہیں ان سے احتیاط رکھنا یہ سب مطلوب ہوگا۔

قوت بڑھانے میں ورزش کرنا، دوڑنا، پیادہ چلنے کی عادت ڈالنا، جن اسلو (ہتھیار) کی قانون سے اجازت ہے یا اجازت حاصل ہو سکتی ہے ان کی مشق کرنا یہ سب داخل ہیں۔ مگر حد شرع و حد قانون سے باہر نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس سے جمعیت (یکسوئی) اور راحت جو کہ شرعاً مطلوب ہے۔ بر باد ہوتی ہے۔

حضرت فضالہ بن عبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو زیادہ آرام ٹھی سے منع فرماتے تھے اور ہم کو حکم دیتے تھے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کریں۔ (ابوداؤد) اس سے ثابت ہوا کہ پیدل چلنے کی عادت رکھے زیادہ آرام طلب نہ ہو۔ مضبوطی، جفا کشی کی عادت ڈالے۔ (حیات المسلمين روح دہم ص ۱۲۳)

ایمان درست کرنے میں قوت کی تیاری بھی داخل ہے

سوال:- قرون اولی میں غیر قوموں پر مسلمانوں کا غالبہ اس لئے تھا کہ..... دنوں کے آلات حرب (یعنی مقابلہ اور جنگ کے ہتھیار) ایک ہی قسم کے تھے مگر ہمارے زمانہ میں اگر روحانی قوت حاصل ہو جائے تو بغیر روپ کے وہ آلات و اسباب کہاں سے مہیا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہم محض اپنا ایمان درست کر کے غلبہ پالیں گے کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ترقی چاہئے والوں کا کیا جواب ہوگا جو آلات و اسباب کو ایمان پر بھی مقدم سمجھتے ہیں۔

الجواب:- ایمان کے درست کرنے میں اعداد قوت بقدر استطاعت (یعنی اپنی کوشش کی حد تک بقدر ممکن قوت کی تیاری کرنا یہ) بھی داخل ہے اور اس اعداد (تیاری) کے لئے جتنے مال کی ضرورت ہے اس کا جمع کرنا بھی اسی میں داخل ہے کہ امیر المؤمنین سے بقدر تحلیل وصول کرے۔ اور اللہ کی عادت یہی ہے کہ اتنی بڑی جماعت میں ایسے لوگ ضرور ہوں گے۔ اگر بالفرض نہ ہوں تو جتنا مال ہو سکے اس سے زراعت تجارت کا انتظام واجب ہو گا اور یہ سب ایمان کے درست کرنے میں داخل ہے۔ (امداد الفتاویٰ صفحہ ۲۱۷)

### مسلمانوں کی فلاج و کامیابی کا دستور العمل

اب میں ان احکام کو بیان کرتا ہوں جن پر فلاج و کامیابی کو موقوف کیا گیا ہے اور وہ چار چیزیں ہیں۔ (جن کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔)

یا يهَا الَّذِينَ امْنَوْا صَبَرُوا وَصَابَرُوا وَرَابطُوا وَاتَّقُوا اللَّهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ۔

ترجمہ و تشریح:- اے ایمان والوں تکلیف پر خوب صبر کرو۔ اور جب کفار سے مقابلہ ہو تو مقابلہ میں صبر کرو۔ اور مقابلہ کے احتمال کے وقت مقابلہ کے لئے مستعد رہو۔ اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اور حدود شرع سے نہ نکلوتا کہ تم پورے کامیاب ہو۔

۱:- تفصیل اس کی یہ ہے کہ اعمال و قسم کے ہیں ایک تو وہ جن کا وقت آ گیا۔

۲:- ایک وہ جن کا وقت نہیں آ یا۔

سو یہاں ایک حکم پہلی قسم کے متعلق ہے اور ایک حکم دوسری قسم کے متعلق ہے۔

پہلی قسم کے متعلق تو اصبروا ہے یعنی جس عمل کا وقت آ جائے اس وقت صبر سے کام لو، یعنی پابندی اور استقلال سے رہو۔ حق تعالیٰ نے اس میں اعمال حاضرہ میں مستقل رہنے کا حکم فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دینداری کے بھی معنی ہیں کہ ہر کام کو پابندی اور استقلال سے کیا جائے۔

آج کل لوگ لو لے اور جوش میں بہت سا کام شروع کر دیتے ہیں پھر نباه نہیں ہوتا۔ تو یہ دینداری کامل نہیں ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے اتنا ہی کام بتایا۔ جس پر نباه ہو سکے۔ واجبات، فرائض و سنن موکدہ پر نباه دشوار نہیں۔ اس سے زیادہ کام کرنے میں البتہ بعض لوگوں سے نباه

نہیں ہوتا۔ تو ان کو اپنے ذمہ اتنا ہی کام بڑھانا چاہئے جس پر نباہ اور دوام (پابندی) ہو سکے۔ تو ”اصبروا“ کا حکم ان اعمال کے متعلق ہے جن کا وقت آ گیا ہے۔ (بیبل النجاح دین و دنیا ص ۶۳۳) پھر ان کی دو فرمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہے دوسرے وہ جن کا تعلق دوسروں سے بھی ہے ان کے متعلق ”صابروا“ فرمایا ہے کہ دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو۔ بعض لوگ اپنے ذاتی کام تو کر لیتے ہیں۔ مثلاً نماز وغیرہ مگر دوسروں کے متعلق باہم تہیں ہوتے۔ اور کچھ لوگ ہمت بھی کرتے ہیں۔ تو وہ اسی وقت رہتی ہے جب تک کوئی دوسرا مقابلہ ہو اور اگر کوئی مقابلہ ہو تو پھر مستقل نہیں رہتے۔ اس کے متعلق ”صابروا“ میں یہ حکم ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں بھی ثابت قدم رہو۔ اسی طرح اگر کبھی اعداء اللہ (اللہ کے دشمن) دین میں مزاحمت کرنے لگیں تو ان کے مقابلہ میں بھی مستقل رہنے کا ”صابروا“ میں حکم ہے۔

غرض ایک وہ افعال ہیں جن میں کسی سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا۔ ان پر استقلال پابندی کرنے کا حکم تو اصبروا میں ہے۔ اور جن میں دوسروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور ان میں ثابت قدم رہنے کا حکم صابردا میں ہے۔ یہ تو وہ افعال تھے جن کا وقت آ گیا ہے۔ اور ایک وہ افعال ہیں جن کا ابھی وقت نہیں آیا ان کے متعلق حکم رابطوا میں ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کاموں کے لئے تیار و مستعد رہنا چاہئے۔ کیونکہ لغت میں رباط کے معنی دشمن کے مقابلہ میں سرحد پر گھوڑے باندھنا ہے یعنی سورچہ بندی اور ظاہر ہے کہ سورچہ بندی حفظ مالقدم (یعنی پیشگی حفاظت) کے لئے اور پہلے سے مقابلہ کو تیار و مستعد رہنے کے لئے کی جاتی ہے۔ عام لغت کے موافق ایک تفسیر تور باط کی یہ ہے

دوسری ایک تفسیر حدیث میں آئی ہے۔ انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ یعنی ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے مفترض رہنا۔ حضور نے اس کے متعلق بھی فرمایا فذالکم الرباط فذالکم الرباط یہی رباط ہے۔

اس تفسیر اور پہلی تفسیر میں کچھ منافات نہیں بلکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ ”رباط“ (یعنی پیشگی حفاظت) ظاہری دشمن کے ساتھ خاص نہیں بلکہ

جیسے ظاہر دشمن کے مقابلہ میں رباط (حفاظت کا بندوبست) ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی باطنی دشمن یعنی نفس و شیطان کے مقابلہ میں بھی رباط ہوتا ہے۔ وہ ظاہری مجاہدہ کا رباط ہے۔ اور یہ مجاہدہ باطنی کا ”رباط“ ہے اسی کو ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

الْمُجَاهِدُ مِنْ جَاهِدَ نَفْسَهُ وَالْمُهَاجِرُ مِنْ هَجْرِ الْخَطَايَا وَالذُّنُوبِ  
یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے مقابلہ میں مجاہدہ کرے۔

بس دین کا خلاصہ یہ ہے کہ جن کاموں کا وقت آگیا ہے ان کو استقلال یا پابندی سے ادا کیا جائے۔ اور جن کا وقت نہیں آیا ان کے لئے تیار ہے کسی وقت بے فکر ہو کرنے بیٹھے۔ اب ایک قسم رہ گئی یعنی اعمال باطنہ اس کے متعلق فرماتے ہیں وَا تَقُوا اللَّهُ خَدَاسِ ڈرتے رہو یہ تمام اعمال کی جڑ ہے۔

اس بیان سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ لوگ اس وقت کا میابی کی طلب میں کدھر اٹھے جا رہے ہیں۔ اور فلاح کا میابی کا جواہلی طریقہ ہے۔ اس پر توجہ نہیں۔

آج کل لوگ کفار کا طریقہ اختیار کر کے فلاح حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا انجام فلاح نہیں کفر سے نزدیک ہونا ہے فلاح کا طریقہ اگر ہے تو یہی ہے (جو قرآن سے بیان کیا گیا) جس سے معلوم ہوا کہ دین ہی فلاح کا طریقہ ہے اور اگر دین نہیں تو خدا کی قسم ساری دنیا کی بھی سلطنت حاصل ہو جائے تو بھی فلاح نہ ہو گی یعنی راحت و اطمینان حاصل ہے فلاح کی۔ (سبیل النجاح، دین و دنیا ص ۲۳۱)

## جہاد کی ضرورت

فرمایا جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخل ہے اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ نماز روزہ کا میابی کے لئے کافی ہے بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے۔ اور وہ چیز قتال و جہاد ہے۔

کیا مکہ مکرمہ میں نماز روزہ نہ تھا۔ بھلا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بڑھ کر کس کا نماز روزہ ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ مکہ مکرمہ کے اندر مسلمان اتنے

دنوں تک رہے لیکن یہ غلبہ نہ ہوا جب ہجرت ہوئی قتال ہوا اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اسلامی اٹھا کر دیکھ لو کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز روزہ سے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا ہو۔ البتہ ضروری نماز روزہ بھی ہے۔

غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ نماز روزہ تو غلبہ کی شرط ہے اگر نماز روزہ اور اطاعت ہوگی تو غلبہ ہو گا اور جہاد غلبہ کی علت ہے۔ گو نماز روزہ فرض عین ہے اور جہاد فرض کفایہ ہے مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے۔

پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ دنوں ہی چیزوں پر موقوف ہے اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے۔ کہ جب تک طاعت کے ساتھ قتال و جہاد نہ ہو گا اس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میر نہیں ہو سکتی۔ (از حکیم الامت آثار رحمت ص ۲۰۰۰ اطیع لا ہور)

### مکی زندگی میں جہاد کیوں نہیں فرض ہوا

حضرت حکیم الامت<sup>ؒ</sup> نے احقر مؤلف سے ارشاد فرمایا کہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ باوجود یہ کہ (جہاد) قتال کے بغیر صحابہ کو نہ غلبہ ہو سکتا تھا نہ ہوا۔ مگر تیرہ برس مکہ معظمہ میں گزر گئے اور مسلمانوں کو سخت سے سخت ایذا میں پہنچیں لیکن قتال کی اجازت نہ ہوئی اور نہ اس کا حکم آیا۔ یہاں تک کہ جب مسلمانوں کو ہجرت کی اور قتال کی اجازت ہو گئی تو اس کی وجہ کیا ہے کہ قتال کی اس قدر تو ضرورت تھی مگر جب تک کہ ہجرت نہ ہوئی اس وقت تک قتال کی اجازت نہ ہوئی۔

احقر نے عرض کیا کہ حضور کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ہجرت کے قبل مسلمانوں کے پاس ہتھیار اور سامان نہ تھا؟ فرمایا ابھی ہتھیار تو خود مقابل ہی سے لے لیجاتے ہیں، اس زمانہ کے قریب ہی کا قصہ ہے کہ مہدی سوڈانی کو دیکھو کہ وہ لوگ بھی کہ باوجود یہ کہ ان کے مقابل کے پاس ہر قسم کا سامان تھا اور ان کے پاس نہ تھا مگر وہ مقابل کے پاس پہنچ کر ان کے ہتھیار چھین کر ان ہی سے لڑتے ہیں اور جب اس زمانہ کے لوگوں کا یہ حال ہے تو صحابہ کا تو کہنا ہی کیا۔ قلت سامان تو (مکہ میں جہاد کا حکم نہ ہونے کی) وجہ تھی نہیں۔ محققین نے اس کی تصریح کی ہے۔

احقر نے عرض کیا کہ پھر کیا وجہ تھی؟ ارشاد فرمایا کہ۔

گو قلت سامان کے علاوہ وہ دوسرے بھی مصالح ہوں گے مگر میرے نزدیک اس کی

وجہ یہ تھی کہ مکہ میں مسلمانوں کا کوئی مرکز نہ تھا۔ اور جہاد کے لئے مرکز ضروری ہے اور بھرت کے بعد مسلمانوں کو مدینہ پہنچ کر مرکز حاصل ہو گیا بس یہ وجہ تھی کہ بھرت سے قبل مکہ میں قال کی اجازت نہ ہوئی۔ اور مدینہ پہنچ کر اجازت ہو گئی۔ (شریعت و سیاست ص ۲۲)

## جہاد کی بنیادی شرائط

- ۱:- جہاد کے لئے مرکز ضروری ہے۔ لہذا خاتم ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔
- ۲:- دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیر المؤمنین ہو خواہ وقت ہی ہو، اور جس کو امیر المؤمنین بنایا جائے اس کے اندر تین صفات ہوں۔

۳:- تدین (یعنی دینداری)

- ۴:- دوسرے سیاست سے واقف ہو۔
- ۵:- تیسرا یہ کہ اس کے اندر رہمت ہو۔

اب مشکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدین تو ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر رہمت نہیں۔ امیر کے اندر ان تینوں صفات کا ہونا ضروری ہے۔ اس کام میں ضرورت ہے اتفاق کی..... اس کے لئے ارادت کافی نہیں، قہر و قوت کی ضرورت ہے اور وہ قوت امیر المؤمنین ہے اور اس وقت مسلمانوں کا کوئی امیر یا سردار نہیں جو ان کی قوت کو ایک مرکز پر جمع رکھ سکے جو روح ہے اس کام کو کرنے کی سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہ ہے۔ (الافتراضات ص ۱۱۹)

☆ نصب خلیفہ (یعنی امیر المؤمنین مقرر کرنا) واجب ہے لیکن واجب کے لئے قدرت شرط ہے۔ اور قدرت اس وقت مفقود ہے اس واسطے گو عالم اس وقت خلیفہ سے خالی ہے لیکن باس حالات خلیفہ کے نہ ہونے سے کوئی گناہ نہیں۔ (الکلام الحسن ص ۱۵)

اگر کامیابی کی توقع غالب نہ ہو تو ایسے افعال جائز نہیں۔ نہ ان میں اجر ہے۔ (داعظ انسیر ص ۲۹)

☆ (اس کام میں) ضرورت ہے اتفاق کی حدوث بھی، بقاء بھی (یعنی ابتدأ بھی اور دوآ بھی) اول تو بمحض کو حدوث اتفاق ہی میں کلام ہے۔ لیکن علی سبیل التزل اگر مان بھی لیا جائے تو بقاء کا کون ذمہ دار ہے اسی لئے کہ بقاء کے لئے ارادت کافی نہیں۔ قہر و قوت کی ضرورت ہے اور وہ قوت امیر المؤمنین ہے اور اس وقت مسلمانوں کا کوئی امیر یا سردار نہیں جو

ان کی قوت کو ایک مرکز پر جمع رکھ کے، جو روح ہے اس کام کے کرنے کی۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کا کوئی امیر المؤمنین ہو سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہ ہے۔

(الافتراضات الیومیہ ص ۱۱۹)

## شعاَرِ اسلام، مقامات مقدسہ، مساجد، مقابر کی حفاظت

### مسلمانوں کے ذمہ ضروری ہے

کفار کی مدافعت مطلقاً اہل اسلام سے اور خصوصاً سلطنت اسلامیہ اور پھر خصوصاً شعاَرِ اسلام سے جن میں مقامات مقدسہ خصوصاً حرمین شریفین اور دیگر مساجد بھی داخل ہیں (ان سب کی حفاظت) سب مسلمانوں پر فرض ہے کبھی علی الیعین (یعنی ہر فرد پر) کبھی علی الکفایہ جیسے حالات ہوں۔

مگر اس کی فرضیت کے کچھ شرائط بھی ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں ان شرائط میں سے ایک شرط استطاعت بھی ہے (یعنی قدرت و طاقت) اور استطاعت سے مراد استطاعت لغو نہیں استطاعت شرعیہ ہے جس کو اس حدیث نے صاف کر دیا۔

من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ (جو کسی منکر کو دیکھے اسے چاہئے کہ وہ اس کی اصلاح کر دے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اصلاح کر دے، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا سمجھے۔

ظاہر ہے کہ زبان سے طاقت ہر وقت حاصل ہے پھر اس کے نہ پائے جانے کی صورت کب ہوگی۔ اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اس میں ایسا خطرہ نہ ہو جس کی مقاومت (یعنی مقابلہ کرنا بظن غالب عادۃ ناممکن ہو۔

اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور اگر ایسا خطرہ ہو تو پھر و جوب تو ساقط ہو جائے گا۔ باقی جواز میں تفصیل ہے۔ یعنی واجب تونہ ہوگا اور بعض صورتوں میں جائز بھی نہیں ہوگا۔ اور بعض صورتوں میں جائز بلکہ مستحب ہوگا۔ اور جواز و عدم جواز یا مستحب کی بندی اجتہاد و رائے پر ہے۔ پس اس میں

اختلاف کی گنجائش ہے اور جواز یا استحباب پر متفق ہونے کے باوجود ایک نے رخصت پر عمل کیا دوسرے نے عزیمت پر تو کسی کو اس پر ملامت کرنے کا حق نہیں۔ ان سب کے شرعی دلائل کتب فقہ کے حوالہ جات اصل کتاب ص ۱۵۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

### سرکاری عہدے اور ملازمتیں حاصل کرنے کی ضرورت

اس وقت مسلمانوں کے لئے مناسب ہے کہ وہ ایسی حکومتیں (اور عہدے) قبول کر لیا کریں اور یہ اس قاعدہ میں داخل ہے کہ اشد المفسدین کو دفع کرنے کے لئے اخف المفسدین (یعنی بڑے مفسدہ اور نقصان سے بچنے کے لئے چھوٹے مفسدہ اور چھوٹے نقصان کو) اختیار کر لیا جاتا ہے۔ اور ہے تو یہ بھی برا اور غلط لیکن دوسرے مفسدہ کے بہت پھر بھی اخف (ہلکا) ہے اور وہ بڑا مفسدہ یہ ہے کہ ہماری قوم (مسلمان) بالکل یہ دوسروں سے مغلوب نہ ہو جائے۔ کیونکہ اگر ہم بھی حاکم ہوں گے تو ہم پر ظلم کم ہو گا۔ پس اس نیت سے اگر عہدہ لے لے تو اس میں بڑی مصلحت (حسن العزیز ص ۱۵۸ ج ۳)

(الغرض اس قسم کے عہدوں کو) اگر مضرت (نقصان) کو دفع کرنے کی غرض سے اختیار کیا جائے تاکہ امت مسلمہ پر کفار کی طرف سے جو مظالم اور مضرتیں (مصیبیں و دشواریاں) پہنچتی ہیں اہل مناصب (یعنی یہ عہدیدار) بقدر امکان اگر ان کو دفع نہ کر سکیں تو کم از کم تقلیل و تخفیف (یعنی کمی تو) کر سکیں تو اس صورت میں جواز کی گنجائش ہے۔

سوال:- خفیہ پولیس کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اس نیت سے جائز ہے کہ میں لوگوں کو نقصان سے بچاؤں گا اس نیت سے کہ دوسرا جو نقصان پہنچاتا ہے اس سے کم پہنچ گا (یعنی اس کے مقابلے میں مجھ سے نقصان کم پہنچ گا۔ دوسروں سے زیادہ پہنچ گا۔ (حسن العزیز ص ۱۶۰ ج ۲)

### ناجائز ملازمتوں کے حاصل کرنے کے مسئلہ میں تفصیل

اس مسئلہ میں تفصیل ہے جو لوگ ان حکومتوں (ناجائز منصب اور عہدوں) کو اختیار کرتے ہیں۔ دیکھنا چاہئے کہ ان کے قبول کرنے سے خود ان کو یا عام مسلمانوں کو کوئی شدید

## نقسان لائق ہونا غالب ہے یا نہیں؟

دوسری صورت میں (یعنی جب کہ نقسان غالب نہ ہوا) ان حکومتوں (عہدوں) کا قبول کرنا جائز نہیں۔ اور اول صورت میں دیکھنا چاہئے کہ آیا اس شخص کی نیت اس نقسان کے دفع کرنے کی ہے (جس کا مسلمانوں کو خطرہ ہوتا رہتا ہے) یا محض مال و جاہ کے نفع حاصل کرنے کی نیت ہے پہلی نیت ہو تو جواز کی گنجائش ہے اور دوسری نیت ہو تو ناجائز۔

پس کل تین صورتوں میں سے صرف ایک صورت میں (یعنی جب کہ ضرر دفع کرنے کی نیت سے منصب حاصل کیا جائے۔ اس میں) جواز کی گنجائش ہوئی (باقی دو صورتوں میں نہیں) اور آیت کا مجمل (ومن لم یحکم بما انزل فاولشک هم الظالمون (اس آیت کا مصدق) بقیہ دو صورتیں ہوں گی (نہ کہ پہلی) خصوصاً اگر جائز و مستحسن سمجھے تو کفر ہے۔ البتہ اگر دونا جائز صورتوں میں بھی سلطنت کی طرف سے مجبور کیا جائے اور عذر قبول نہ کیا جائے تو پھر ان میں بھی گنجائش ہے لیکن ہر حال میں جہاں تک ممکن ہو خلاف شریعت سے بچنے کی کوشش کرے۔ (امداد الفتاویٰ سوم)

## غیر مسلموں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک

بعض حقوق محض مشارکت نوعی کی وجہ سے ثابت ہو جاتے ہیں یعنی صرف آدمی ہونے کی وجہ سے ان کی رعایت واجب ہوتی ہے۔ گوسلمان نہ ہوں وہ یہ ہیں۔

۱:- بے گناہ کسی کو جانی یا مالی تکلیف نہ دیں۔

۲:- شرعی وجہ کے بغیر کسی کے ساتھ بدزبانی نہ کرے۔

۳:- اگر کسی کو مصیبت فاقہ مرض میں بنتا دیکھے اس کی مدد کرے کھانا پانی دے دے اور علاج معالج کر دے۔

۴:- جس صورت میں شریعت نے سزا کی اجازت دی ہے اس میں بھی ظلم و زیادتی نہ کرے، اس کو ترسائے نہیں۔

## کفار کے ساتھ تعلق رکھنے کی تین صورتیں

کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے ہوتے ہیں، موالات یعنی دوستی مدارا، یعنی

ظاہری خوش خلقی، مواسات یعنی احسان اور نفع رسانی ان کی تفصیل یہ ہے کہ:  
۱:- موالات (یعنی قلبی دوستی) تو کسی حال میں جائز نہیں۔

۲۔ اور مدارات تین حالتوں میں درست ہے۔ ایک دفع ضرر (یعنی نقصان سے بچنے) کے واسطے، دوسرے اس کافر کی مصلحت دینی یعنی ہدایت کی توقع کے واسطے، تیسرا اکرام ضیف (یعنی مہمان کے احترام) کے لئے۔

۳:- مواساة (یعنی کفار کے ساتھ حسن سلوک) اور ان کو نفع پہنچانے کا حکم یہ ہے کہ اہل حرب (یعنی جن سے لڑائی ہے جوڑنے مرنے والے ہیں ان) کے ساتھ ناجائز ہے اور غیر اہل حرب کے ساتھ جائز ہے۔

### کافروں کی مدد کرنے کے متفرق احکام

موالات بمعنی نصرت یعنی کفار کی مدد کرنا اگر اسلام کے حق میں مضر (یعنی نقصان دہ) ہو تو مطلقاً ناجائز ہے خواہ نقصان کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ اور جس مدد سے اسلام کو نقصان نہ ہو مگر وہ خود ناجائز ہو (جیسے شراب جوئے وغیرہ میں کافر کی مدد کرنا) اس میں بھی نصرت ناجائز ہے۔ اور اگر اس مدد سے اسلام کا نقصان بھی نہ ہو اور اور وہ فعل مباح (یعنی جائز) بھی ہو اگر بلا اجرت کے ہے تو اس کا حکم مواساة کا ہے جس کا حکم ابھی گز رچکا۔

### موالات اور کفار سے تعلقات رکھنے کے متفرق احکام

۱:- ”حقیقی موالات“، یعنی قلبی دوستی ہر کافر سے مطلقاً حرام ہے اس میں ذمی (جو اسلامی حکومت کی ماتحتی میں رہتے ہوں) حربی معارض مسلم (یعنی لڑنے والے کفار اور صلح دامن کے ساتھ رہنے والے کفار، اس حکم میں سب برابر ہیں۔

۲:- ”صوری موالات“، بمعنی ظاہری دوستی یعنی ایسا برتاؤ جیسا دوستوں سے ہوتا ہے جس کو ”مدارات“ کہتے ہیں، اپنی مالی مصلحت و نفع کے لئے تو درست نہیں خصوصاً جب کہ دینی نقصان کا بھی خطرہ ہو تو بدرجہ اولیٰ یہ اختلاط حرام ہو گا۔

البته یہی مدارات رفع مضر (یعنی نقصان سے بچنے اور دور کرنے کے لئے)

درست ہے۔ اسی طرح ہدایت کی توقع کے لئے بھی مدارات کرنا درست ہے۔

۳:- مواسات یعنی احسان و نفع رسانی (یعنی کفار کو نفع پہنچانا) اہل حرب کے ساتھ (یعنی لڑنے مرنے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے کافروں کے ساتھ) ناجائز ہے اور غیر اہل حرب (یعنی جو ایسے نہ ہوں) ان کے ساتھ جائز ہے۔

۲:- حربیوں (یعنی لڑنے والے کفار کے ساتھ) کسی خاص موقع پر احسان کرنے میں اسلام کی مصلحت ہو، یا اس کے اسلام کی توقع ہو تو یہ صورت اس سے مستثنی ہے (یعنی ایسے وقت حربیوں کے ساتھ احسان کرنا بھی درست ہے)۔

اسی طرح کسی حربی کی اضطراری حالت ہو مثلاً بھوک پیاس یا اگر جانے سے ہلاکت کے قریب ہو تو یہ صورت بھی مستثنی ہے (یعنی عام حالات میں ایسے حربی کافر کی جان بچانی جائے گی۔ البتہ خاص حالات یعنی لڑنے کی حالت میں نہیں)

نوت:- دلائل فقہی عبارات اصل کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

افادات اشرفیہ ص ۱۱۱ اشرف السوانح ص (۱/۳۷۱)

## کافروں کے ساتھ ہمدردی حسن سلوک کی ترغیب

سوال:- خیر خیرات کے ذریعہ غیر قوموں کے ساتھ (یعنی کافروں کے ساتھ) سلوک کرنا درست ہے یا نہیں؟

فرمایا اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ صدقات واجبہ (مثلاً زکوٰۃ) میں اہل اسلام کی تعین ہے وہ تو غیر مسلم کو دینے سے ادا ہی نہیں ہوتے۔

اور صدقات نافلہ میں حاجت پر مدار ہے۔ مسلم اور غیر مسلم میں اول وجہ ترجیح حاجت ہے (یعنی جو زیادہ حاجت مند ہو گا وہ مقدم ہو گا) مثلاً ایک کافر مراجاتا ہے اور ایک مسلمان بھی موجود ہے جس کو اتنی حاجت نہیں تو ایسے موقع پر یہ چاہئے کہ مسلمان کو چھوڑ کر اس کا فر کو کھلایا جائے۔

حاجت و ضرورت کے وقت ترجیح اہل حاجت کو ہے خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ یہ اسلام کے صدق اور غیر متعصب ہونے کی دلیل ہے کہ کافر جو مسلمانوں کا دشمن ہے اس کو کھلائیں

مجاہدہ اسی کو کہتے ہیں۔ (حسن العزیز ص ۲۷۳/۳)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ صدقات مطلقاً (یعنی نافلہ بھی) غیر مسلم کو نہ دیئے جائیں بہت سے صحابہ کفار کو اس مصلحت سے خیرات نہ دیتے تھے کہ شاید اسی تدبیر سے کچھ لوگ مسلمان ہو جائیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی رائے دی تھی۔ اس پر آیت اتری لیس علیک هداہم ولكن اللہ یهدی من یشاء

اس آیت میں دونوں طرح کے خطاب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کافروں کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ فرض واجب نہیں، یہ تو خدا تعالیٰ کا کام ہے جس کو چاہیں ہدایت پر لے آئیں..... اور اے مسلمانو! جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو۔ حق تعالیٰ کی رضامندی کے سوا کسی اور غرض سے خرچ نہیں کرتے۔ اور یہ غرض ہر حاجت مند، ضرورت مند، کی حاجت پوری کرنے سے حاصل ہوتی ہے پھر مسلمان فقیر کی تخصیص کیوں کی جائے، تم کو اپنے عوض (یعنی اللہ کی رضامندی اور آخرت کے ثواب) سے مطلب رکھنا چاہئے اور یہ عوض ہر حال میں ملے گا۔ پھر تم کو اس سے کیا بحث کہ ہمارا صدقہ مسلمان ہی کو ملے، کافر کو نہ ملے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ ملتوی فرمادیا۔

مسئلہ: حرbi کافر کو کسی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ: کافر، ذمی یعنی غیر حرbi (جو لڑنے والا، مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والا نہ ہو) اس کو صرف زکوٰۃ عشر دینا جائز نہیں اور دوسرے صدقات واجبہ و نفل سب جائز ہیں۔ اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں۔ (بیان القرآن بقرہ ص ۱۶۳..... حسن العزیز ص ۲۷۳)

غیر مسلموں کے ساتھ بر تاؤ کی تین صورتیں

کفار کے ساتھ مسلمانوں کے بر تاؤ تین قسم کے ہو سکتے ہیں۔

محبانہ (یعنی قلبی دوستی) محسانہ (یعنی حسن سلوک اور رواداری) منصفانہ (یعنی عدل و انصاف)

پہلی قسم مطلقاً (ہر حال میں) کسی کافر کے ساتھ جائز نہیں۔ خواہ ذمی ہو یا حرbi، اہل

کتاب ہو یا مشرک، اس کی ممانعت سورۃ ممتحنہ کی شروع کی آیات میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اس کے علاوہ اور بھی دوسری آیات میں مذکور ہے۔

اور تیسرا قسم کا بر تاؤ (یعنی عدل و انصاف) ہر قسم کے کفار کے ساتھ جائز بلکہ واجب ہے اور اس کے خلاف کرنا جائز نہیں اور یہ امر وہی دونوں اس آیت میں ہیں۔

لایجر منکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ہو اقرب للتفوی۔  
ترجمہ:- اور کسی خاص گروہ کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل (النصاف) نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

اور دوسری قسم کے تعلقات بعض کفار کے ساتھ جائز نہیں (اور بعض کے ساتھ جائز ہیں) سورۃ ممتحنہ کی آیات میں اس کی تفصیل مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ محسنا نہ بر تاؤ ذمی کفار، یا معاہد و مصالح (یعنی صلح و معاہدہ کر کے ساتھ رہنے والوں) کے ساتھ جائز ہے۔ حرbi (لڑنے مرنے والے دشمن اسلام) کے ساتھ جائز نہیں۔ (البدائع ص ۷ ابدیعہ ۶)

## غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک و رواداری

لَا ينہکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین.....الی قوله تعالیٰ  
فَاوَلَنک هم الظالموں.

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا بر تاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے، اور تم کو تمہارے گروں سے نہیں نکالا۔ اس سے مراد وہ کافر ہیں جو ذمی یا مصالح (یعنی صلح کرنے والے صلح پسند) ہوں، یعنی حسن سلوک کا بر تاؤ ان سے جائز ہے۔ مصالحت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے ساتھ احسان سے دریغ نہ کیا جائے اور مطلق انصاف تو ہر کافر بلکہ جانور کے ساتھ بھی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ انصاف کا بر تاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

ابتدہ صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی یعنی احسان کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں اور تم کو تمہارے گروں سے نکالا ہو اور اگر نکالا بھی نہ ہو

لیکن تمہارے نکالنے میں نکالنے والوں کی مدد کی ہو یعنی ان کے ساتھ شریک ہوں اور جو شخص ایسوں سے دوستی کا برداشت کرے گا سو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔ (بیان القرآن ملخصاً ص ۱۳۳/۱۳۳)

## کافر کے ساتھ ہمدردی

کفار کو زکوٰۃ کے علاوہ اور صدقہ دینا بھی جائز کر دیا گیا ہے، موت کے وقت کافر کو پانی پلانا درست ہے۔ کفار سے ملنے میں بھی رحمت کی رعایت کی گئی ہے۔ کتنی بڑی رحمت ہے کہ نافرمانوں پر بھی رحم کرنے کا حکم ہے۔ ہاں جس کافر نے ضرر (نقضان) پہنچایا ہوا س کے لئے دوسرا حکم ہے۔

واخر جو هم من حیث اخیر جو کم (التبیخ شب مبارک ص ۳۵/۸)

ترجمہ:- اور ان کو نکال باہر کو۔ جہاں سے انہوں نے تم کو نکلنے پر مجبور کیا ہے۔

## سنچل کر دوستی کرو

بعض بد فہم اور کم سمجھ مسلمان غیر مسلموں کو اپنادوست سمجھ کر ان کے بغلوں میں جا کر گھتتے ہیں (ان سے اپنے راز بیان کرتے ہیں) ان نا عاقبت اندیشوں کو معلوم بھی ہے کہ بزرگوں کا مقولہ ہے۔ ”کہ نادان دوست سے دانا دوست اچھا ہوتا ہے“ اور جو نادان بھی ہو اور دشمن بھی تب کیا کہنا۔ (ملفوظات ص ۱۸۷)

جو شخص حکومت یا سلطنت کے باغیوں سے میل جوں رکھتا ہے۔ یا ان کو امداد پہنچاتا ہے، وہ شخص بھی باغیوں ہی میں شمار کیا جاتا ہے، ہم جس کے وفادار ہیں وفاداری اسی وقت تک ہے کہ ہم اس کے دشمنوں سے نہ ملیں۔ (ص ۳۹، ۵۱۹)

دوست سے سنچل کر دوستی کرو، زیادہ میل جوں نہ کرو، شاید کسی دن دشمن ہو جائے، تو گھر کے بھیدی (رازدار) کی دشمنی بہت نقضان دہ ہوتی ہے۔ اور اگر کسی کو اپنے دوست کے متعلق دشمنی کا احتمال نہ ہو تو وہ اپنے ہی متعلق یہ احتمال رکھے کہ شاید کہ کسی دن میں ہی بدل جاؤ۔ اس لئے اتفاق میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اسی طرح اگر کسی سے عداوت کرو، وہاں بھی حد کے اندر عداوت کرنا چاہئے، حد سے نہ بڑھے کیونکہ کیا خبر ہے کسی وقت پھر دوستی کرنے کی ضرورت ہو تو اس وقت آنکھیں سامنے کرنے سے شرم آئے۔ (الانسداد ص ۵۱۲)

## الکفر ملة واحده

کافر جتنے ہیں سب اسلام کے دشمن ہیں، کوئی گورا ہو یا کالا، دونوں سانپ ہی ہیں بلکہ گورے سانپ سے کالا سانپ زیادہ زہریلا ہوتا ہے اگر گورے سانپ کو گھر سے نکال بھی دیا، کالا ڈسے کو موجود ہے۔ جس کا ڈسہ اہواز ندہ رہنا ہی مشکل ہے۔ (الافتراضات ص ۶/۱۹۷)

جب تک ہم کلمہ پڑھتے ہیں، تمام غیر مسلم ہمارے دشمن ہیں۔ اس میں کالے گوروں کی کچھ قید نہیں۔ مسلمانوں میں جو بڑے بڑے خوشامدی ہیں وہ (غیر مسلم) ان کو بھی اپنا دوست نہیں سمجھتے۔ (الافتراضات ص ۵/۷۷، مفہوم ص ۲۸۸)

گوکفار اپنی کسی مصلحت سے مسلمانوں کی کچھ رعایت کریں مگر یہ یقینی بات ہے کہ وہ اسلام کو اپنے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ اور اس واسطے اس کے مٹانے کی فکر میں ہیں۔

بعض لوگ کفار کی ایک جماعت کو برابر کہتے ہیں اور بعض دوسری جماعت کو۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں برے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک نجاست مریہ اور ایک نجاست غیر مریہ (یعنی ایک گندگی، ناپاکی ظاہر ہے ایک کی پوشیدہ ہے مگر) ہیں دونوں نجاست۔ (الافتراضات ص ۲/۳۰۲)

## کفار مشرکین کے ہدایہ تھارف خصوصاً دیوالی وغیرہ کے موقع پر لین دین کا حکم

سوال:۔ ہندو اپنے تہواروں میں اگر مسلمانوں کو بطور ہدیہ کے کچھ دیں مثلاً دیوالی کے موقع پر اکثر ہندو مسلمانوں کے یہاں مٹھائی وغیرہ لایا کرتے ہیں ان کا قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی شخص قبول کر کے کسی دوسرے کو کھلانا چاہے تو اس شخص کو اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر کفار خاص اپنے تہوار کے لئے کوئی خاص مٹھائی بنائیں، مثلاً کھلو نے وغیرہ تو اس کا دوکان سے خریدنا جائز ہے یا نہیں۔ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان مطلقاً ہدیہ کا لین دین جائز ہے یا نہیں۔

الجواب:۔ ان روایات کا فقیہہ سے مہادات مسؤول عنہا (یعنی ہدیہ سے متعلقہ سوالات) کے احکام کی تفصیل معلوم ہو گئی۔ کہ اگر کوئی دینی ضرر (نقسان) نہ ہو تو کفار

مصالحین سے (یعنی غیر حربی کافروں سے) ہدایا کا لین دین جائز ہے۔ اور اس سے اکثر سوال کا جواب ہو گیا (یعنی یہ کہ ہر صورت میں جواز ہے بشرطیکہ دینی نقصان نہ ہو) صرف دو جزو خاص قابل تعریض باقی رہ گئے۔ ایک یہ کہ دیوالی کا ہدیہ شاید اس تھوار کی تعظیم کے لئے ہو جس کو فقهاء نے سخت منوع لکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس میں تصویریں بھی ہوتی ہیں ان کا احترام و استعمال لازم آتا ہے تو اس میں بھی شرعی حکم کا معارضہ ہے۔ اول کا جواب یہ ہے کہ یہ عادت سے معلوم ہے کہ اس ہدیہ کا سبب مہدی لہ (یعنی جس کو ہدیہ دیا جاتا ہے) اس کی تعظیم ہے نہ کہ تھوار کی تعظیم۔

اور ثانی کا جواب یہ ہے کہ مقصود اہداء (یعنی ہدیہ دینے میں مقصود) صورت نہیں بلکہ مادہ ہے۔ البتہ یہ واجب ہے کہ مہدی لہ فوراً تصادر کو توڑا لے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۲۸۲)

### غیر مسلموں کی بھیجی ہوئی افطاری کا حکم

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ ہندو اگر افطاری میں مٹھائی بھیجے تو اس کا کھانا کیسا ہے؟ فرمایا فتویٰ کی رو سے تو جائز ہے مگر مجھ کو غیرت آتی ہے کہ آئندہ یوں کہنے لگیں کہ اگر ہم مدد کرتے تو کیسے بھار ہوتی۔

مسجد میں ایسے موقع پر ان کے شریک کرنے سے دو خرابیاں ہیں۔ ایک تو اتنا (یعنی کافر کا احسان) دوسرے مسلمانوں میں کرم (و سخاوت کا مزاج) غالب ہے۔ اور سوچتے سمجھتے ہیں۔ نہیں پھر ان کے تھواروں میں مدد دینے لگتے ہیں۔ اور ہندوؤں کا طریقہ یہ ہے کہ اول تو احسان کرتے ہیں پھر اپنا کام بناتے ہیں۔ (ملفوظات اشرفی ص ۳۰ مطبوعہ پاکستان)

### کافروں سے معاملات یعنی خرید و فروخت

### اور ملازمت کرنے کا حکم

جن معاملات میں کوئی ناجائز کام نہ کرنا پڑے کفار کے ساتھ درست ہیں خواہ کافر ذمی ہو یا حربی، مسلم ہوں یا غیر مسلم البتہ وہ معاملات اس سے مستثنی ہیں جن کی ممانعت صراحتاً ہے جیسے غیر کتابی سے نکاح کرنا، باقی دوسرے معاملات درست ہیں مثلاً ان کی نوکری کرنا،

ان کو نوکر کرنا، ان سے قرض لینا، ان کے پاس رہن (گروی) رکھنا، ہدیہ دینا، ان سے کچھ خریدنا، ان کے ہاتھ کوئی چیز بیچنا اور ان معاملات کو غیر کی مناصرت و معاونت کہنا بلا دلیل ہے ورنہ فقہاں کو جائز نہ فرماتے۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان معاملات سے مقصود اپنی مصلحت ہے نہ کہ کفار کی یا اگر ان کی بھی مصلحت ہو تو وہ اسلام کے حق میں مضر نہیں۔ (الروضۃ الناصرۃ ص ۱۲)

**کافروں سے خدمت لینے اور ان کی خدمت کرنے کا شرعی حکم**  
کافروں سے خدمت لینا اگر وہ اس طور پر ہو کہ وہ مسلمانوں کا بالکل تابع ہو اور عذر (ہوکر) کا بھی احتمال نہ ہو تو جائز ہے۔ اور اگر برابری یا متبوعیت کے طور پر ہو (اس طرح کہ مسلمان کافر کے تابع ہو) یا ہو کہ کا احتمال ہو تو اسلام کا نقصان پہنچنے کے احتمال کی وجہ سے ناجائز ہے۔

البته مجبوری کے حالات اس سے مستثنی ہیں یعنی جہاں مسلمان مکوم (اور کافر حاکم) ہوں۔ (الروضۃ الناصرۃ ص ۱۲، اشرف السوانی ص ۱۷)

**ہندوؤں کی دکان سے مٹھائی وغیرہ سامان خریدنا**

سوال:۔ ہندوؤں کی دکان سے مٹھائی وغیرہ خریدنا اور ان کے یہاں کا کھانا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر ظاہر میں کوئی نجاست نہ ہو تو جائز ہے لیکن اس پر بھی اگر اپنے مسلمان بھائی کو نفع پہنچائے تو زیادہ بہتر ہے۔ (امداد الفتاوی ص ۱۳۱)

**کافروں کے گھر کا ان کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھانا**

کافروں کی نجاست بالطینی ہوتی ہے جو ظاہری طہارت کے منافی نہیں پس جو احکام ظاہری طہارت کے متعلق ہیں وہ سب ثابت ہوں گے۔ وہ پانی پلاۓ یا احتیاط سے کوئی حلال کھانا پکا کر کھلائے وہ کھانا پینا جائز اور حلال ہو گا۔

ہاں اگر کوئی یوں سمجھے کہ ہندو باوجود یہ کہ اہل باطل ہیں اور ہم سے جو کہ اہل حق ہیں ذلیل و ناپاک سمجھ کر پرہیز کرتے ہیں تو اس کی پاداش میں ہم بھی ان سے احتراز رکھیں اس

احتیاط کا کچھ مضاف نہیں۔ الحق یعلو ولا یعلی (امداد الفتاوی ص ۱۱۵)

سوال:۔ جو ہندو مسلمان کو برا اور ذلیل سمجھتے ہیں ان کے گھر کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گناہ تو نہیں مگر بے غیرتی ہے۔ (امداد الفتاوی ص ۲۷)

## غیر مسلم کے ساتھ ایک برتن میں کھانا کھانا

سوال:۔ کسی عیسائی کے ساتھ کھانا کھا سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر ایک پیالہ اور ایک ہی رکابی میں کھایا جائے تو ایسی حالت میں کیا حکم ہے۔ کیا ساتھ کھانے سے اتحاد ہوتا ہے اور کیا ان لوگوں سے اتحاد منع ہے؟

الجواب:۔ کافروں سے بلا ضرورت اخلاق و ارتباط منوع ہے اور (ساتھ) کھانا کھانا بے ضرورت اخلاق و ارتباط ہے (اس لئے منع ہے) (البته ضرورت کے وقت گنجائش ہے)۔ (امداد الفتاوی ص ۲۲۱/۲)

## مدرسہ و مسجد میں غیر مسلم کا چندہ لینا

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ اگر کوئی ہندو مسجد میں کوئی امداد رقم دے دے تو لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس رقم کو مسجد کی تعمیر میں صرف کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:۔ فرمایا جائز ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر لیا جائے تو دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ دینے والے ایسے نہ ہوں کہ دے کر احسان جتلادیں دوسرے یہ کہ اس سے مسلمان متاثر ہوان کے مذہبی چندہ میں شریک نہ ہونے لگیں۔ اس خیال سے کہ انہوں نے ہمارے یہاں چندہ دیا تھا۔ ہم کو بھی دینا چاہئے ممکن ہے کہ وہ مندر بنانے لگیں تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے مسجد میں دیا تھا تم مندر میں دو تو ایسی جگہ چندہ لینا بھی جائز نہیں۔ اور اگر ان باتوں کا اندر یہ نہ ہو تو لیا جائے کوئی ہرچ نہیں اور یہ قرآن سے معلوم ہو سکتا ہے عرض کیا گیا کہ اس کا تواحتمال ہے کہ شاید ایسا ہو کہ وہ اپنے مذہبی چندہ میں شریک کریں۔ فرمایا تو ایسی صورت میں لینا جائز نہیں۔ (الافتراضات الیومیہ ص ۹۸/۲)

## شريعت و سياست

از افادات حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قال له موسیٰ انک لغوی مبین (القصص: ۱۸) موسیٰ علیہ السلام اس سے فرمانے لگے بے شک تو صریح بدرہ ہے۔

## کالمین کی سیاست میں عدو کامل ہوتا ہے

اس پرداز ہے کہ کالمین جس طرح عدو پر سیاست کرتے ہیں دوست پر بھی کرتے ہیں جیسا کہ دونوں کے حال کا مقتضنا ہوتا ہے سو آپ کا قول ”انک لغوی مبین“ بسطی پر سیاست تھی اور ارادہ بطریق بسطی پر سیاست ہے غرض ان میں عصیت قومی نہیں ہوتی عدل کامل ہوتا ہے۔ (مسائل السلوك) فلن اکون ظہیر اللھ عجور میں سوچھی میں مجرموں کی مدد نہ کروں گا (القصص آیت نمبر ۱۷)

## اہل اللہ ظالم کے لئے کبھی عہدہ حکومت کی دعائیں کرتے

اس سے معلوم ہوا کہ ظالمین کی معونت جائز نہیں اور چونکہ عہدہ حکومت کی دعا کرنایہ بھی ایک معونت ہے اس لئے اہل اللہ ظالم کے لئے ایسی دعائیں کرتے اور اگر شدید ضرورت ہو تو اس میں یہ قید لگا دیتے ہیں اگر خیر ہو جیسے استخارہ میں اسی قید سے دعا ہوتی ہے۔ (مسائل السلوك)

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الناس تبع لقریش فی هذا

الشان مسلمهم تبع لمسلمهم و کافرهم تبع لکافرهم

ترجمہ:- فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی تابع ہیں قریش کے اس شان ان کا مسلمان ان کے مسلمان کے تابع ہے اور ان کا کافران کے کافر کے۔

## حکومت کا استحقاق قریش کو ہے

یعنی حکومت کا استحقاق قریش کو ہے جاہلیت میں بھی یہ لوگ حاکم و رئیس رہے اور اسلام

میں بھی حق خلافت ان ہی کے لئے مقرر ہوا مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھ جائے کہ حاکم اسلام اگر قریشی نہ ہو تو اس کی اطاعت واجب نہ ہوگی۔ غاییہ مانی الباب یہ کہ اصطلاح شرع میں اس کو امام و خلیفہ نہ کہیں گے مگر و جو ب اطاعت کا مستحق ہونا امام و خلیفہ ہی کے ساتھ کسی دلیل سے ثابت نہیں بلکہ احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ و جو ب اطاعت کے لئے امارت و سلطنت بھی کافی ہے یعنی مسلمان حاکم و سلطان کی بھی اطاعت واجب ہے اور اس کی بغاوت اور مخالفت جائز نہیں اگرچہ وہ فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہو۔ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مردی ہے ”من يطع الامير فقد اطاعني ومن يعص الامير فقد عصاني“ اور مسلم میں ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ ان خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم اوصانی ان اسمع و اطیع و ان کان عبدا جدعا لاطراف اور مسلم میں عبادہ بن الصامت سے روایت ہے ”ولانتازع الامر اهلہ قال الا ان ترو کفراً بواحًا عندکم من الله فيه برهان“ اس اخیر حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفر سے وہ واجب الاطاعت نہیں رہتا۔ سلف کی مخالفت بعض امراء سے اسی بنابر تھی کہ ان کی رائے میں کفر ان کا محقق ہو گیا تھا اور جن کو ثابت نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے سکوت کیا البتہ اگر یہ امیر کوئی خلاف شرع بات کرانا چاہے تو اس خاص مقدمہ میں اطاعت واجب نہیں۔ مسلم میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ ”لا طاعه في معصية الله.“ اور اگر وہ شخص صاحب حکومت ہوں تو ان میں اگر ایک دوسرے کا تابع ہوتا یہ تعدد ہی نہیں اس متبوع کی اطاعت چاہئے۔ اور اگر دونوں مستقل ہوں تو اگر ان میں ایک کامل الشوکت ہے دوسراناقص الشوکت اس کے سامنے کا عدم ہے کیونکہ مدار اطاعت کا وصف امارت پر ہے اور امارت کا مدار شوکت پر تو یہ ناقص گویا امیر ہی نہیں۔ اور اگر دونوں شوکت میں کامل ہوں تو جس کا تقرر اول ہو چکا ہو وہ واجب الاطاعت ہے۔ فہرالامیر الاول ۱۲۔ (چهل حدیث ص ۲۲، ۲۵)

## حاکم اور مکوم کے حقوق

حاکم و مکوم کے حقوق میں حاکم میں بادشاہ و نائب بادشاہ اور آقا وغیرہ اور مکوم رعیت اور نوکرو وغیرہ

سب داخل ہیں اور جہاں مالک مملوک ہوں وہ بھی داخل ہو جائیں گے۔ حاکم کے ذمہ یہ حقوق ہیں۔

۱:۔ ملکوں پر دشوار احکام نہ جاری کرے۔

۲:۔ اگر باہم ملکوں میں کوئی منازعہ ہو جائے عدل کی رعایت کرے کسی جانب میلان نہ کرے۔

۳:۔ ہر طرح ان کی حفاظت و آرام رسانی کی فکر میں رہے۔ دادخواہوں کو اپنے پاس پہنچنے کے لئے آسان طریقہ مقرر کرے۔

۴:۔ اگر اپنی شان میں اس سے کوئی کوتاہی یا خطہ ہو جائے کثرت سے معاف کر دیا کرے اور ملکوں کے ذمہ یہ حقوق ہیں۔

۱:۔ حاکم کی خیرخواہی و اطاعت کرے۔ البتہ خلاف شرع امر میں اطاعت نہیں۔

۲:۔ اگر حاکم سے کوئی امر خلاف طبع پیش آئے صبر کرے، شکایت و بد دعا نہ کرے البتہ اس کی نرم مزاجی کے لئے دعا کرے۔ اور خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اہتمام کرے کہ اللہ تعالیٰ دکام کے دل کو زم کر دیں۔ ایک حدیث میں یہ مضمون آیا ہے۔

۳:۔ اگر حاکم سے آرام پہنچے اس کے ساتھ احسان کی شکر گزاری کرے۔

۴:۔ براہ نفاسیت اس سے سرگشی نہ کرے اور جہاں غلام پائے جاتے ہوں غلاموں کا نان نفقہ بھی واجب ہے اور غلام کو اس کی خدمت چھوڑ کر بھاگنا حرام ہے باقی ملکوں میں آزاد ہیں دارہ حکومت میں رہنے تک حقوق ہوں گے اور خارج ہونے کے بعد ہر وقت مختار ہیں۔ (حقوق الاسلام)

## معاملہ سیاست

۱:۔ اگر کوئی کافر تم کو زخمی کر کے یا کوئی عضو قطع کر کے جب تم بدله لینے لگو فوراً کلمہ پڑھ لے تو یہ سمجھ کر کہ اس نے جان بچانے کو کلمہ پڑھ لیا ہے ہرگز مت قتل کرو اس سے اسلام کے حلم رحم اور حق پرستی کا اندازہ کرنا چاہئے۔

۲:۔ کافر رعایا سے بلا قصور کسی کو قتل کرنا سخت گناہ ہے، بہشت سے دور کر دیتا ہے۔

۳:۔ خود کشی کرنے کی سخت ممانعت ہے کسی طرح۔

۲:- مساجد میں کوئی سزا جاری نہ کی جائے شاید بول بر از خطا ہو۔

۵:- مسلمان کسی کا فرزد می کو قتل کر ڈالے وہ اس کے مقابلہ میں قتل کیا جاوے گا۔

۶:- اگر لشکر اسلام میں سے ادنیٰ درجہ کا آدمی بھی لشکر کفار کو امان دے دے، تمام اعلیٰ ادنیٰ مسلمانوں پر لازم ہو جاوے گا اس کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتے البتہ اگر لڑنا ہی مصلحت ہو تو کفار کو جدید اطلاع دی جاوے کہ ہم اپنے معابرے کو واپس لیتے ہیں۔

۷:- اگر کئی آدمی مل کر ایک آدمی کو قتل کریں، سب قتل کئے جاویں گے اور سب گناہ گار ہوں گے۔

۸:- جو شخص فن طب میں مہارت نہ رکھتا ہو اور اس کی عملی بد تدیری سے کوئی مر جاوے تو اس سے خون بہا لیا جائے گا۔

۹:- اپنی جان و مال و دین و آبرو کی حفاظت کے لئے لڑنا درست ہے۔ اگر خود مارا گیا، شہید ہو گا، اگر مقابل مارا گیا، اس شخص پر کوئی الزام نہیں۔

۱۰:- لہو و لعب کے طور پر کنکریاں اچھا لانا، غلہ چلانا منوع ہے۔ مبادا کسی کا دانٹ آنکھ ٹوٹ پھوٹ جائے۔

۱۱:- اگر مجمع میں کوئی دھاروالي چیز لے کر گزرنے کا اتفاق ہو تو دھار کی جانب چھپا لینا چاہئے، کسی کے لگ نہ جاوے۔

۱۲:- دھاروالي چیز سے کسی کی طرف اشارہ کرنا گوہنی ہی میں ہو منوع ہے۔ شاید ہاتھ سے چھوٹ کر لگ جاوے۔

۱۳:- ایسی وحشیانہ سزا جس کی برداشت نہ ہو سکے، جیسے دھوپ میں کھڑا کر کے تیل چھوڑنا، ہنڑوں سے بے درد ہو کر بے حد مارنا نہایت گناہ ہے۔

۱۴:- تکوار، چاقو کھلا ہوا کسی کے ہاتھ میں مت دویا تو بند کر کے دویاز میں پر رکھ دو، دوسرا شخص اپنے ہاتھ سے اٹھا لے۔

۱۵:- کسی آدمی یا جانور کو آگ سے جلانا جائز نہیں۔

۱۶:- واجب لقتل کو ہاتھ پاؤں کاٹ کر چھوڑنا کہ تڑپ تڑپ کر مر جاوے، درست نہیں۔

۱۷:- پرندوں کے بچوں کو گھونسلوں سے نکال لانا کہ ان کے ماں باپ بے قرار ہوں درست

نہیں جس کے جادو سے لوگوں کو ضرر پہنچتا ہے اور وہ بازنہیں آتا وہ گردن زنی کے لائق ہے۔

۱۸:- جو مجرم زنا اقراری ہو حتی الامکان اس کو نال دینا چاہئے جب وہ برابر اپنے اقرار پر جمار ہے اور چار بار اقرار کر لے اس وقت سزا جاری کی جاوے۔

۱۹:- اگر ایسا اقراری مجرم اثنائے سزا میں اپنے اقرار کو داپس لے تو چھوڑ دینا چاہئے۔

۲۰:- اگر حاملہ عورت پر جرم زنا ثابت ہو، جب تک بچہ نہ جن لے اور اگر کوئی دوسری دو دھپلانے والی نہ ہو تو جب تک دو دھنے چھوٹ جاوے اس وقت سنگسار نہ ہوگی۔

۲۱:- سزا پانے کے بعد مجرم کو طعن و تشنیع و تحریر کرنا بہت برا ہے۔

۲۲:- جوزانی مستحق تازیانہ ہوا اور بوجہ مرض کے سزادی نے میں مر جانے کا احتمال ہو تو صحت تک سزا موقوف رکھی جاوے۔

۲۳:- سزا میں دو قسم کی ہیں، ایک معین دوسری مفوض برائے حاکم، اول کو حد دوسری کو تعزیر کہتے ہیں۔ حدود میں شریف رذیل وجیہہ ذیل سب برابر ہیں اس میں کسی کی رعایت نہیں تعزیر میں شریف وجیہہ آدمی سے چشم پوشی مناسب ہے اور صرف فہمائش کافی ہے۔

۲۴:- جھوٹے مقدمے کی یا جس کا سچا جھوٹا ہونا معلوم نہ ہو اس مقدمے کی پیروی یا کسی قسم کی اعانت کرنا منوع ہے۔

۲۵:- شراب کا استعمال دو ایں بھی منوع ہے۔

۲۶:- چونکہ نشد والی چیزوں کی خاصیت ہے کہ تھوڑی سے زیادہ ہو جاتی ہے اس لئے اس کے تھوڑے استعمال سے بھی ممانعت کی گئی۔

## حکومت و انتظام ملکی

۲۷:- جو شخص خود حکومت کی درخواست کرے وہ قابل حکومت نہیں ہے، وہ خود غرض ہے جو اس سے بھاگتا ہو وہ زیادہ عدل کرے گا، اس کو حکومت دینا سزاوار ہے۔

۲۸:- سلطان کی اہانت کی اجازت نہیں۔

۲۹:- حکام کو بھی حکم ہے کہ رعایا سے زم برتاؤ کریں، سختی نہ کریں۔

۳۰:- حکام کے پاس جا کر ان کی خوشامد سے ان کی ہاں میں ہاں ملانا، ان کو ظلم کے

طریقے بتانا اس میں اعانت کرنا سخت نہ موم ہے۔

۳۱: حق بات کہہ دینے میں حکام سے مت دبو۔

۳۲: حکام کو مناسب نہیں کہ رعایا کے عیوب و جرائم کا بلا ضرورت تجسس کرے کہ یقین نفس بشرخانی از خطاب نبود۔

۳۳: بلا قصور کسی کو گھور کر دیکھنا، جس سے ڈرجاوے جائز نہیں۔

۳۴: اگر حکام ظلم کرنے لگیں ان کو برامت کہو، سمجھ جاؤ کہ ہم سے حاکم حقیقی کی نافرمانی ہوئی ہے۔ یہ اس کی سزا ہے۔ اپنی حالت درست کرو۔ اللہ تعالیٰ حکام کے قلوب کو نرم کر دیں گے۔

۳۵: حاکم کا ایسی جگہ بیٹھنا جہاں نہ حاجت مند جاسکے، نہ کسی ذریعہ سے اپنی فریاد وہاں پہنچا سکے، جائز نہیں۔

۳۶: غصے کی حالت میں حواس درست نہیں رہتے اس وقت مقدمہ فیصل کرنا نہ چاہئے۔

۳۷: رشوت لینے کی سخت ممانعت ہے گوہدیہ کے طور پر ہو۔

۳۸: جھوٹا دعویٰ، جھوٹی گواہی، جھوٹی قسم، جھوٹا انکار کسی کے حق کا یہ سب گناہ ہے۔

۳۹: اپنا حق ثابت کرنے کے لئے کوشش کرنا کوئی بری بات نہیں بلکہ اس میں کامی کی راہ سے بیٹھ رہنا کم ہمتی قرار دی گئی ہے اور باوجود کوشش کرنے کے ناکامی ہو اس کا زیادہ غم کرنا بھی برآہے سمجھ لے کہ حاکم حقیقی کو یہی منظور تھا۔

۴۰: قومی شبے میں حوالات کر دینے کی اجازت ہے۔

۴۱: سواری اور نشانہ بازی کی مشق کا حکم ہے۔

۴۲: گھوڑے کی دم کے بال اور ایال اور پیشانی کے بال مت کا ثوہم کی بال سے مکھی اڑاتا ہے، ایال سے اس کو گرمی پہنچتی ہے۔ پیشانی کے بالوں میں برکت ہے۔ (تعلیم الدین)

## صلاح و فساد کے ذمہ دار حکماء و علماء

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کی دو جماعتیں ایسی ہیں کہ جب وہ درست ہوں گی تو سب

آدمی درست ہو جائیں گے اور جب وہ فاسد ہوں گی تو سب آدمی فاسد ہو جائیں گے۔ ایک جماعت امراء و ملوک، دوسری علماء اور حضرت قادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ علماء کی مثال ایسی ہے جیسے نمک کی جب کوئی چیز خراب ہونے لگے تو نمک اس کی اصلاح کر دیتا ہے لیکن اگر نمک خود ہی خراب ہو جائے (مثلاً زیادہ ہو جائے) تو اس کی اصلاح کسی چیز سے نہیں ہوتی (جامع اعلم ابن عبد البر ص ۸۷)

### حکومت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے

فرمایا کہ حضرت ابن عباس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وفات سے دو برس بعد خواب میں دیکھا..... کہ پیشانی کا پیسہ صاف کر رہے ہیں پوچھا یا امیر المؤمنین آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کی ابھی حساب سے فارغ ہوا ہوں قریب تھا کہ عمر کا تخت لوٹ جائے مگر میں نے اللہ کو بڑا رحیم کریم پایا حضرت نے فرمایا کہ دیکھ لیجئے یہ حکومت ایسی چیز ہے جس کی بوگ کرتے ہیں کیا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا انصاف کی میں ہو سکتا ہے اور پھر بھی ان کا یہ واقعہ ہوا۔

### ہر ذمہ دار کو اپنے ماتحت لوگوں کے

### اعمال کی نگہداشت کرنا چاہئے

چنانچہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ میں جب معتبر اہل شخص کو کوئی عہدہ دیتا ہوں تو یہ کافی ہے کہ عہدہ دینے سے پہلے اس کی الہیت لیاقت، دیانت و امانت کی تحقیق کر لوں پھر یہ سکدوش ہوں یا مجھے عہدہ دینے کے بعد اس کے کام کی بھی تحقیق بھی کرنا چاہئے کہ جیسا کہ میراً گمان تھا ویسا ہی ثابت ہوا یا میراً گمان غلط نکلا سب نے جواب دیا کہ عہدہ دینے سے پہلے پوری طرح تحقیق کر لینا کافی ہے اس کے بعد آپ سکدوش ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ جواب صحیح نہیں ہے بلکہ مجھے اس کے کام کی بھی تحقیق کرنا چاہئے کہ جب میراً گمان تھا اس نے اسی طرح کام کا حق ادا کیا یا میراً گمان اس کے متعلق غلط ثابت ہوا۔ بدلوں اس کے میں سکدوش نہ ہوں گا

محققین صوفیہ کا بھی یہی خیال ہے کہ جس کو کوئی خدمت سپرد کی جائے اس کے اعمال کی بھی جانچ کرنا چاہئے کہ جو خدمت اس کے سپرد کی گئی ہے وہ اس کا اہل ثابت ہوا یا نہیں۔

**زوال سلطنت ظلم سے ہوتا ہے**  
فرمایا کفر سے سلطنت کو زوال نہیں ہوتا، ظلم سے زوال ہوتا ہے۔

**مزاج حاکم کے وقار کے خلاف ہے**

فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں مزاج نہ ہوتا تو میں اپنی حیات ہی میں ان کو خلیفہ بنادیتا مزاج سے وقار جاتا رہتا ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خوش مزاج بہت تھے اکثر ہنستے بولتے رہتے تھے اور یوں سب ہی حضرات صحابہ خوش مزاج تھے میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دو شعر بھی دیکھے ہیں۔

ابوبکر حبا فی اللہ مالہ واعتق من ذخائرہ بلا  
وقد واسی السی بکل فضل واسرع فی اجابہ اللہ

**حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رعب**

ایک مرتبہ آپ بہت سے صحابیوں کے ہمراہ جا رہے تھے اتفاقاً پاشت کی طرف جو آپ نے نظر کی تو جس جس پر نظر پڑی سب گھنٹوں کے بل گر پڑے چ ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس سے سب ڈرتے ہیں اور اگر کسی کے رعب اور ہیبت میں کمی ہے تو تقویٰ اور دینداری کی کمی کی وجہ سے ہے ورنہ ضرور ہیبت ہوتی ہے وحشت اور نفرت نہیں ہوتی۔

**پہلے سلاطین میں بھی دین کی وقعت تھی**

پہلے سلاطین میں بھی دین کی وقعت اور دین کی پابندی تھی والی کابل کے عدل کی حکایت کے بیان میں فرمایا کہ میرے پیر بھائی محمد خان صاحب خورجہ والے ایک واقعہ امیر عبدالرحمن خان والی کابل کا بیان کرتے ہیں کہ ان کی بیوی کے ہاتھ سے ایک قتل ہو گیا۔ ایک ماما کو پستول سے مارڈا۔ امیر عبدالرحمن خان سے ماما کے ورثے نے فریاد کی حکم فرمایا کہ قاضی شرع کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا جاوے اور بعد تحقیق شرعی کے جو حکم ہوا اس پر عمل

کیا جاوے۔ چنانچہ وہاں دعویٰ دائر ہوا۔ قاضی نے کہلا کر بھیجا کہ مجرم کی حراست کی ضرورت ہے مگر شاہی محل کا معاملہ ہے وہاں تک رسائی کیسے ہو سکتی ہے فوراً فوج کو حکم دیا کہ قاضی صاحب کے ماتحت کام کریں باضابطہ محل سے گرفتاری ہوئی۔ اور بیانات لئے گئے مقدمہ شروع ہو گیا۔ امیر صاحب کے صاحبزادے امیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا کہ والدہ کے متعلق کیا ہو گا فرمایا کہ بیٹا میں مجبور ہوں جو حکم شرعی ہو گا وہ ہو گا اور یہ بھی فرمایا کہ تمہاری توہاں ہے اس لئے تمہیں اس کا خیال ہے اور میری بیوی اس لئے مجھ کو بھی خیال ہے مگر حکم شرعی کے آگے چوں و چرا کی کیا گنجائش ہے اور تعجب ہے کہ تم کو اپنی بڑھیاں کا تو خیال ہے اور بوڑھے باپ کا خیال نہیں کہ رعایت کرنے سے میدانِ حشر میں خدا کے سامنے گھستا گھستا پھرے گا۔ غرض مقدمہ ہوا اور قاتلہ کے اقرار سے قتل ثابت ہو گیا قاضی شرع نے قصاص کا حکم صادر کر دیا۔ صاحبزادوں نے امیر صاحب سے عرض کیا کہ اگر مقتول کے درثاناء کو کچھ دے کر راضی کر لیں اور وہ اپنا حق معاف کر دیں تو اس میں تو کوئی ہرج نہیں۔ فرمایا کہ کوئی ہرج نہیں شریعت میں اس کو دیت کہتے ہیں۔

### خلافت قریشی کے لئے ہے

فرمایا۔ خلافت قریشی کے لئے ہے غیر قریشی بادشاہ کو سلطان کہا جائے گا لیکن اطاعت اس کی بھی واجب ہو گی اور گونصب خلیفہ واجب ہے لیکن واجب کے لئے قدرت شرط ہے اور قدرت اس وقت مفقود ہے اس واسطے گو عالم اس وقت خلیفہ سے خالی ہے لیکن بائیں حالات خلیفہ کے نہ ہونے سے کوئی گناہ نہیں۔ اور بعض نے جو کہا ہے کہ غیر قریشی بھی خلیفہ ہو سکتا ہے تو یہ نص کے خلاف ہے یعنی الائمه من قریش۔ نیز حضرات انصار پر جب یہ نص پیش کی گئی تو انہوں نے بھی اس کو تسلیم فرمایا پس گویا اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا البتہ جن لوگوں کے قبضہ میں سلطنتیں ہیں وہ اگر قریشی کو جب کہ اس میں اہلیت ہو خلیفہ نہ بنادیں تو مجرم ہوں گے۔

### حکمران نہ ڈھیلا ہو اور نہ ڈھیلا کی طرح سخت

فرمایا میں کب کہتا ہوں کہ بادشاہ کو ڈھیلا یعنی حد سے زیادہ نرم ہونا چاہئے میں تو یہ کہتا ہوں کہ ڈھیلا (بمعنی کلوخ) یعنی زیادہ سخت نہ ہونا چاہئے بادشاہ کو حضرت عمر فاروق رضی

اللہ تعالیٰ عنہ بن کر رہنا چاہئے۔ حق تعالیٰ سے ہیبت کرنے میں خاص اثر ہے کہ اس کی ہیبت دوسروں کے قلب میں ہوتی ہے۔ (الافتراضات الیومیہ ج ۲ ص ۸۱)

ہر کہ ترسید از حق و تقوی گزید ترسید از حق و تقوی گزید جن و انس و ہر کہ دید

## حکمران کا عاقل ہونا ضروری ہے

فرمایا یہ جو مشہور ہے کہ وزیر عاقل ہونا چاہئے گو با دشہ بے وقوف، ہی ہو محض غلط ہے۔ با دشہ ہی کا عاقل ہونا ضروری ہے۔ ورنہ با دشہ کو وزیر کا تابع ہو کر رہنا پڑے گا۔ تو اس صورت میں وزیر با دشہ اور با دشہ وزیر ہو گا (الافتراضات الیومیہ ج ۲ ص ۸۶)

## جمہوری سلطنت بچوں کا کھیل ہے

فرمایا کہ جمہوری سلطنت بھی کوئی سلطنت ہے محض بچوں کا کھیل ہے حکومت تو شخصی ہی کی ہے اسی کی ہیبت اور رعیب بھی ہوتا ہے۔ (الافتراضات الیومیہ ج ۳ ص ۱۱۲، ۱۱۳)

## قرآن میں سلطنت شخصی کا ثبوت ملتا ہے

فرمایا بعض لوگ آیت و شاورہم فی الامر سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ سلطنت شخصی ہونا خلاف قرآن ہے شاورہم سے کثرت رائے مفہوم ہوتی ہے جو حاصل ہے سلطنت جمہوری کا مگر اس استدلال کی غلطی خود اس آیت کے اگلے جزو سے ظاہر ہے۔ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ گو مشورہ مطلوب ہے مگر بعد مشورہ مدار محض آپ کے عزم اور رائے پر ہے اس سے تو بالکل سلطنت کا شخصی ہونا ثابت ہوا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شخص واحد پر مشورہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن مدار کثرت رائے پر نہیں رکھا گیا بلکہ اس مستشیر (مشورہ لینے والے کو) اطلاق آیت سے بھی اس کی اجازت ہے کہ وہ بمقابلہ جماعت کے ایک کے مشورہ کو قبول کر کے اس کے موافق عزم کرے (الافتراضات الیومیہ ج ۳ ص ۳۱۹)

## ایک خاص حالت میں ہر چیز کو زوال ہے

فرمایا کہ حکومت ہی کی کیا تخصیص ہے ایک خاص حالت میں ہر چیز کو زوال ہے چاہے وہ حکومت ہو یا قوت اور شجاعت ہو۔ مال ہو، عزت ہو، جاہ و علم ہو، کمال ہو۔ اور وہ خاص

حالت یہ ہے کہ یہ شخص اس کو اپنا کمال سمجھنے لگے عطیہ خداوندی نہ سمجھے اور راز اس کا یہ ہے کہ اس کو اپنا کمال سمجھ کر اس میں حقوق کی ادائیگی کی طرف نظر نہیں رہتی اس لئے امانت سے بُر طرف کر دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ کل ہمارے پاس کچھ تھا آج کچھ بھی نہیں۔

### نئی قسم کی بہادری میں کیا مزہ ملک و حکومت کا ملے گا

فرمایا کہ آج کل بہادری کی نئی قسم نکلی ہے مار کھانا، ذلیل ہونا، بھوک ہڑتاں کر کے مرجانا۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ حکومت مل جائے۔ ایسے ذلیل کم حوصلہ لوگوں کو تو حکومت کا نام بھی نہ لینا چاہئے پئتے تو خود ہی پھرتے ہیں کیا بد نصیبوں کو حکومت اور ملک کا مزہ ملے گا۔

### مسلم اور غیر مسلم سے مشترک سلطنت اسلامی سلطنت نہیں

فرمایا کہ قاعدہ عقلی ہے کہ مرکب کامل اور ناقص کا ناقص ہی ہوتا ہے۔ تو کفار اور مسلم سے جو سلطنت مرکب ہوگی وہ غیر اسلامی ہوگی پس جبکہ ترکی میں (یورپ کی تقلید میں جمہوریت) قائم ہو گئی ہے جو مسلم اور غیر مسلم سے مشترک ہے تو وہ اسلامی سلطنت نہ ہوگی لیکن مسلمانوں پر اس کی نصرت واجب ہے کیونکہ دوسری غیر مسلم سلطنتیں اس کا مقابلہ اسلامی سلطنت سمجھ کر کرتی ہیں۔

### رعایا کی مطیع بنانے کی تدبیر

فرمایا کہ جب تک شفقت نہ ہو پرورش کا خیال نہ ہو کوئی اور طریقہ اور کوئی تدبیر رعایا کے مطیع بنانے کی نہیں۔

### مسلمانوں کو ترقی حق تعالیٰ شانہ کو راضی کرنے سے ہوتی ہے

فرمایا کہ مسلمانوں تم ترقی کے لئے ہمیشہ یہ دیکھو کہ مسلمانوں کیونکر ترقی ہوئی اور یہ ہرگز نہ دیکھو کہ کفار کی ترقی کیونکر ہوئی۔ کیونکہ ہر قوم کا مزاج باطنی الگ ہے یہ ضروری نہیں کہ جو طریقہ ایک قوم کو مفید ہو وہ سب کو مفید ہے۔ بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ جو صورت ایک قوم کے کسی فرد کو مفید ہو وہ سب افراد کو مفید ہو۔ لطیف المزاج کو وہ چیزیں نافع نہیں ہوتیں جو ایک گنوار کو نافع ہیں۔ تم اسلام کے بعد لطیف المزاج ہو گئے ہو تمہارا مزاج شاہانہ ہو گیا ہے تم کو وہ

صورت مفید نہ ہو گی جو کفار کو مفید ہے نیز تم ایسے ہو جیسے سر کی ٹوپی کہ جہاں اس سے ذرا سی ناپاکی لگی فوراً اتار کر پھینک دی جاتی ہے اور جو تے میں اگر ناپاکی لگ جائے تو اس کو نہیں پھینکتے۔ اسی طرح حق تعالیٰ تم کو ناپاکی اور گندگی میں ملوث نہیں دیکھنا چاہتے۔ اگر تم ملوث ہو گئے تو فوراً پڑے پر کوئے پیٹے جاؤ گے اور کفار چاہے جتنا ملوث ہو جائیں گوا را کیا جائے گا پس اگر تم ترقی کرنا چاہو تو یہ دیکھو کہ پہلے مسلمانوں کو ترقی کیونکر ہوئی تھی چنانچہ جن لوگوں نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی ترقی کا حال تاریخ میں دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ان حضرات کو محض دین کی اتباع کی وجہ سے ترقی ہوئی۔ وہ دین میں پختہ تھے ان کے معاملات و معاشرت و اخلاق بالکل اسلامی تاریخ کے مطابق تھے اس لئے دوسری قوموں کو خود بخود اسلام کی طرف کشش ہوتی تھی اور کسی نے مقابلہ کیا تو چونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو راضی کر رکھا تھا اس لئے خدا تعالیٰ ان کی مدد کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ باوجود بے سر و سامانی اور قلت عدد کے بڑی سلطنتوں کے ان سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

### شریعت پر عمل کرنے میں مسلمانوں کا وقار ہے

فرمایا تم شریعت پر عمل کر کے دیکھو انشاء اللہ سب تمہاری عزت کریں گے جس کی میں دلیل یہ ہے کہ جو کچھ مسلمان ہیں۔ انگریز، ہندو، پارسی وغیرہ سب ان کی عزت کرتے ہیں تم دین پر قائم رہو ساری قومیں تمہاری مسخر ہو جائیں گی۔

### اتفاق و اتحاد کی بنیاد

فرمایا کہ اتفاق و اتحاد کی بنیاد ہمیشہ دین کی حدود پر قائم کرو اور کسی عالم سے مشورہ کر کے کام کرو یہ اتحاد انشاء اللہ مضمبوط ہو گا۔ اور یہ اتحاد باقی جب رہے گا جب تقویٰ کی رعایت ہو گی کیونکہ جب تقویٰ کی رعایت ہو گی تو خدا کا خوف ہو گا اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کا خیال ہو گا۔ دین کی حدود پر قائم رہو۔ اور جب دوسروں کے حقوق ادا ہوتے رہیں گے تو پھرنا اتفاقی پیدا نہیں ہوتی۔

نیست مع المخالف راست ہونے کے بعد رعایا کے حقوق ادا ہو سکتے ہیں۔

حضرت والا کے صاحب اجازت کو لوگوں نے زبردستی میوپیٹی کا ممبر بنادیا بالآخر حضرت کی خدمت میں لکھا تاکہ گلو خلاصی ہو تحریر فرمایا جب تک نسبت مع الخالق رائخ نہ ہو تعلق مع المخلوق بلا ضرورت سراسر مضرت ہے اور جو منفعت سوچی جاتی ہے کہ اداۓ حق خلق ہے وہ حق خلق بھی جب ہی ادا ہوتا ہے کہ نسبت مع الخالق ہو جاوے ورنہ حق خلق ادا ہوتا ہے نہ حق خالق یہ تجربہ ہے اور ایک کا نہیں بلکہ ہزاروں اہل بصیرت کا اسی لئے ہم سے اور آپ سے زیادہ اہل تمکین نے ایسے تعلقات کو چھوڑ دیا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم بخی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات معلوم ہیں اور حضرت خلفاء راشدین پر اپنے کو قیاس نہ کیا جاوے۔

کارپاں را قیاس از خود بگیر

## سلطنت کی ہوس کا انجام

فرمایا کہ رعایا کے سلطنت کی ہوس ہونے کا نتیجہ سوائے پریشانی کے کچھ نہیں۔ بس ان کی وہ حالت ہے جیسے چیزوں کے مرنے کے دن قریب آتے ہیں تو اس کے پر لگتے ہیں اس وقت تو وہ خوش ہوتی کہ آہا میں بھی ہوا میں ارنے لگی چنانچہ اس کی یہ حالت ہوتی ہے۔ چیزوں کے لگے پر تو وہ کہنے لگی اذکر میں مثل سلیمان ہوں ہوا میں کئی دن سے مگر اس کو یہ خبر نہیں کہ اس کی ہلاکت کے دن قریب آگئے ہیں اس کا مشاء محض حرص ہے اور کچھ نہیں مگر یہ لوگ اس کو دین سمجھتے ہیں اور اس کا نام ترقی اسلام رکھا ہے۔ صاحبو خام کے بد لئے سے کچھ نہیں ہوتا نتائج و آثار کو دیکھنا چاہئے کہ اس ہوس خام کے آثار و نتائج کیا ہیں۔ کیا اس سے اسلام کو کچھ ترقی ہوئی ہے یا کفر کو۔ صوفیہ بڑے محقق ہیں اور ان سے زیادہ کون دیندار ہوگا ان کی تعلیم یہ ہے۔

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ      برنتا بدکوہ رائیک برک کاہ  
چنانچہ نص قرآنی ہے لاتلقوا بایدیکم الی التهلکہ جس سے معلوم ہوا کہ جس ہوس کا نتیجہ ہلاکت ہو وہ منوع ہے وہ دین نہیں خلاف دین ہے اور حدیث میں ہے لا ینبغی لله مون ان یدل نفسہ جس سے معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو ذلیل کرنا بھی جائز نہیں۔ اگر ہلاکت نہ ہو یہ سب تو شریعت کی تعلیم متعلق مصائب اختیاریہ کے ہے اور مصائب غیر اختیاریہ کے متعلق یہ تعلیم ہے۔

## سلطنت کی قیمت

ایک بزرگ نے ایک بادشاہ سے پوچھا کہ اگر اتفاقاً تم شکار میں نکل جاؤ اور اسکیلے رہ جاؤ اور اس وقت اگر کوئی شخص تمہارے پاس ایک پیالہ پانی لائے اور آدمی سلطنت اس کی قیمت بتلائے تو تم اس کو خرید لو گے کہ نہیں؟ اس نے کہا کہ میں ضرور خرید لوں گا پھر ان بزرگ نے کہا کہ اگر اتفاق سے تمہارا پیشاب بند ہو جائے اور کسی طرح نہ کھلے اور ایک شخص اس شرط پر پیشاب اتار دینے کا وعدہ کرتا ہے کہ باقی آدمی سلطنت اس کو دے دو تو تم کیا کرو گے۔ اس نے کہا باقی آدمی سلطنت بھی اس کو دے دوں گا تو ان بزرگ نے کہا کہ بس آپ کی سلطنت کی یہ قیمت ہے کہ ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ پیشاب جس میں آپ اس قدر مست ہو رہے ہیں۔ تو اللہ والوں کو دنیا کا نزدیک معلوم ہے اس لئے صحابہ نے بڑی سلطنت ہونے پر بھی دنیا کی ہوں نہیں کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ وقت تھے مگر کھانا کپڑا جو تھا معمولی سے بھی کم تھا کیونکہ وہ حضرات جانتے تھے کہ اصل چیز دوسری ہے ہمارے بعضے بھولے بھالے بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے لڑتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلاف لے لی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ دی۔ میں کہتا ہوں کہ ان دونوں حضرات کو دعا دیجئے اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اول ہی سے خلافت دے دی جاتی اور اتنی مدت تک یہ خلیفہ رہتے تو ان کو کتنی مدت تک تکلیف ہوتی جو اٹھائے نہ اٹھتی کیونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان حضرات کو دنیا سے کس قدر نفرت تھی۔ پس ان حضرات نے بڑا سلوک کیا کہ اس مصیبت کو خود بانٹ لیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تکلیف نہ پہنچنے دی۔

## آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفوں کا رب

دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفوں کا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر تھے کس قدر رب رعایا پر تھا لیکن اس کے ساتھ ہی دیکھئے اس کی تواضع کی کیا حالت تھی۔

## حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تواضع کا قصہ

حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا اسمعوا

و اطیعوا لیعنی سنوا اور اطاعت کرو۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ لانسمع ولا نطیع لیعنی ہم نہ آپ کا حکم سنیں اور نہ اطاعت کریں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی وجہ پوچھی تو اس شخص نے کہا کہ غنیمت کے چادرے جو آج تقسیم ہوئے ہیں سب کو تو ایک ایک چادر ملا ہے اور آپ کے بدن پر دو ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تقسیم میں عدل اور انصاف نہیں کیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ بھائی تو نے اعتراض کرنے میں بہت جلدی کی، بات یہ ہے کہ میرے پاس کرتا نہیں تھا تو میں نے اپنے چادرے کو تہبند کی جگہ باندھا اور اپنے بیٹے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کا چادرہ مانگ کر اس کو کرتے کی جگہ اڈھا ہے اس واقعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان حضرات میں بڑے چھوٹے سب برابر حصے کے حقدار سمجھے جاتے تھے۔ آج بڑوں کا دوہرہ حصہ ہونا گویا لازمی بات ہے البتہ اگر مالک ہی دوہرہ حصہ دے دے تو کچھ مضاائقہ نہیں غرض کے تواضع اور نرمی کی یہ کیفیت تھی اور باوجود اس نرمی کے رعب کی یہ حالت تھی کہ

### فتح و نصرت کا مدارقلت و کثرت نہیں

ہر امر میں مسلمانوں کا مطیع نظر خدا تعالیٰ کی رضا ہونا چاہئے۔ فرمایا کہ فتح و نصرت کا مدارقلت اور کثرت پر نہیں وہ چیز ہی اور ہے۔ مسلمانوں کو صرف اسی ایک چیز کا خیال رکھنا چاہئے، لیعنی خدا تعالیٰ کی رضا پھر کام میں لگ جانا چاہئے۔ اگر کامیاب ہوں شکر کریں۔ ناکامیاب ہوں صبر کریں۔ اور مومن تو حقیقتاً ناکامیاب کبھی ہوتا ہی نہیں۔ گو صورۃ ناکام ہو جاوے اس لئے کہ اجر آخرت تو ہر وقت حاصل ہے جو ہر مسلمان کا مقصود ہے حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سانحہ ہزار کے مقابلہ میں تیس آدمی تجویز کئے تھے حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ امت محمدیہ کو ہلاک کراؤ گے تب سانحہ آدمی تجویز کئے لیعنی ایک ہزار کے مقابلہ میں ایک آدمی قلت و کثرت کی طرف ان حضرات کا خیال ہی نہ تھا۔

### دولت اور سلطنت کا ایک خاصہ

فرمایا کہ تنعم اور تعیش کا اکثری خاصہ ہے کہ حدود محفوظ نہیں رہتے ہاں اگر تنعم کے ساتھ دین ہو اور کسی کامل کی صحبت میرا آگئی ہے تب تو حدود کا خیال رہتا ہے اس لئے کہ اس سے

ہر چیز کو اعتدال کے ساتھ قلب میں رسوخ ہو جاتا ہے۔

### حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک فراست

فرمایا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم فرمایا تھا کہ ہمارے بازار میں صرف وہ لوگ خرید و فروخت کریں جو فقیہ ہوں اس سے تمام ملک کو درسگاہ بنادیا تھا اس لئے کہ سب خریداروں کو انہی کے ساتھ سابقہ پڑتا تھا عجیب فراست تھی۔

### امارت میں خاصہ ہے تبعید مساکین کا

فرمایا کہ جس قوم کے مذہبی رہبر امیر ہوں گے وہ مذہب اور قوم گمراہ ہو جائے گی اس لئے کہ ان کو تو ضرورت قوم سے واسطہ رکھنے کی رہے گی نہیں۔ اور جب واسطہ رہا وہ گمراہ ہونا قریب ہے ہی اس کا یہ سبب نہیں کہ اب واسط قوم سے مال کے سبب ہے بلکہ امارت میں خاصہ ہے تبعید مساکین کا۔

### نظام صحیح فلاح دارین برائے مسلمانان

فرمایا کہ مسلمانوں کی غفلت شعاری کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ حالانکہ آخرت کے لئے اپنے اعمال کی اصلاح دنیا کے لئے اپنے قوت کا اجتماع اور آپس میں اتحاد و اتفاق سب ان کا فرض تھا۔ اور یہ جو مسلمان کو اپنی فلاح سے استغفار ہے اس کا مشاء چند غلطیاں ہیں (۱) ایک غلط استعمال توکل کا۔ سو توکل تو فرض ہے ہر مسلمان کو خداۓ تعالیٰ سے براہ راست ایسا تعلق رکھنا چاہئے کہ کسی چیز کی پرواہ نہ کرے یہی اعتقاد رکھے کہ جو خدا کو منظور ہو گا وہی ہو گا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن توکل کا استعمال خلاف محل کرتے ہیں دوسری غلطی یہ کہ جو کام کرتے ہیں جوش کے ماتحت کرتے ہیں اگر ہوش کے ماتحت کام کریں تو بہت جلد کامیاب ہوں۔

تیری غلطی یہ ہے کہ ہر کام کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا واجب تھا شریعت مقدسہ کا اس کے متعلق کیا حکم ہے پھر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی مذاہیر پر عمل کرے۔ حاصل نظام صحیح کا یہ ہوا کہ جوش کے ماتحت کوئی کام نہ کرے ہوش کے ماتحت کیا کرے۔ اپنی قوت کو ایک مرکز پر جمع کر لیں۔ تیرے آپس میں اتحاد و اتفاق رکھے۔ احکام کی پابندی کریں۔ جن میں توکل بھی داخل ہے۔ اگر ایسا کریں تو میں دعویٰ کے ساتھ خدا کی ذات پر

بھروسہ کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ چند روز میں کایا پلٹ ہو جائے۔ بہت جلد مسلمانوں کے مصائب اور آلام کا خاتمہ ہو جاوے۔ نیز جو بھی کام کریں اس میں کامیابی کے لئے خدا سے دعا کریں پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ مگر اس وقت کام کی ایک بات نہیں محض ہڑ بونگ ہے۔

## سلطنت کا زوال چھوٹی چھوٹی باتوں کی غفلت سے ہوتا ہے

فرمایا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بہت اہتمام چاہئے۔ سلطنت جو گئی ہے میرے نزدیک چھوٹی چھوٹی چیزوں کے اہتمام کی غفلت ہی سے گئی ہے کیونکہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کی طرف سے جو غفلتیں ہوتی رہتی ہیں وہ سب مل کر ایک بہت بڑا مجموعہ غفلتوں کا ہو جاتا ہے جو آخر میں رنگ لاتا ہے اور زوال سلطنت کا موجب ہو جاتا ہے۔ نیز جب چھوٹی چھوٹی باتوں کا اہتمام نہیں ہوتا تو غفلت کی عادت پڑ جاتی ہے پھر بڑے بڑے امور میں بھی غفلت ہونے لگتی ہے اور وہ براہ راست مخل ہیں سلطنت کی۔ اس لئے چھوٹی چیزوں کا اہتمام ویسے بھی ضروری ہے۔ جب چھوٹی چیزوں کا اہتمام ہوگا تو بر بنا عادت بڑی چیزوں کا تو اہتمام ویسے بھی ضروری ہے۔ جب چھوٹی چیزوں کا اہتمام ہوگا تو بر بنا عادت بڑی چیزوں کا تو اہتمام ضروری ہی ہو گا اس میں ایک بڑا راز یہ بھی ہے کہ چھوٹے امور میں کوتا ہی کرنے سے باہمی معاملات میں بھی یہی عمل ہوتا ہے۔ جس سے باہم کدورت ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں باہم الفت نہیں رہتی اور مدار سلطنت کا باہمی اتفاق پر ہے اس اہتمام کی تائید میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ بیان فرمایا کہ ایک بار شب کے وقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ کر باتیں کرنے لگے تو آپ نے فوراً چراغ گل کر دیا۔ کیونکہ اس وقت آپ بیت المال کا کام کر رہے تھے اور چراغ میں تیل بھی بیت المال ہی کا تھا۔ لمحے یہ بھی کوئی بڑی بات تھی لیکن جو شخص ایسی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا اہتمام کرے گا وہ بڑے بڑے امور کو تو کیوں نظر انداز کرے گا۔ (افاضات الیومیہ ج ۱۰ جز اول ص ۱۰۲)

جس سلطنت میں رضاۓ حق نہ ہو وہ وہاں جان ہے۔ یاد رکھو سلطنت مقصود بالذات نہیں بلکہ اصل مقصود رضاۓ حق ہے اگر ہم سے خدار ارضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو فرعون وہاں وہ شداد بڑے مقرب ہونے چاہیں حالانکہ وہ مردود ہیں

معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضاۓ حق بھی ساتھ ساتھ ہوا اور جس سلطنت میں رضاۓ حق نہ ہو وہ وہاں جان ہے۔ (اشرف الجواب حصہ سوم مجلد ص ۲۲۵)

## انتظامی کام حکومت سرانجام دے سکتی ہے

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ بہت سے انتظامی کام حکومت ہی کر سکتی ہے ایسے کام اسی ہی کے کرنے کے ہیں مثلاً باجے گا جے اگر حکومت چاہے بند کر سکتی ہے رہا کتوں کے متعلق اول تو پالنے کی ممانعت ہو سکتی ہے اور اگر ضرورت کے موقع استثناء بھی ہو تو قیود کے ساتھ ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہ باندھ کر رکھوں لئے کہ اندر ہرے میں ستاتے ہیں کسی کا دامن پکڑ لیا پیر پکڑ لیا۔ ایک ضروری انتظام یہ کرنے کے قابل ہے کہ جانوروں کے بڑے بڑے گھنٹے بند ہوادیئے چاہیں۔ ایک مرتبہ میں بعد نماز مغرب پکھ دیرے سے مکان کی طرف جا رہا تھا ایک سانڈ سامنے سے آگیا اندر ہر انیز میں نیچی نظر کئے ہوئے جا رہا تھا بالکل تصادم ہونے کو تھا مگر خدا تعالیٰ کی قدرت کہ وہ خود ایک طرف کو نیچ گیا تو ایسے یہ سب انتظامات حکومت کر سکتی ہے اور عامہ خلائق کو راحت پہنچا سکتی ہے مگر یہ بھی جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ راحت پہنچانا مقصود بھی ہو لیکن اس وقت اہل حق اقتدار کو راحت ہی پہنچانا مقصود نہیں مخصوص پیسہ کمانا مقصود ہے۔ مگر پھر بھی اور گورنمنٹوں سے غیمت ہے خود غرض سہی مگر ساتھ ہی ہماری بعضی غرض بھی پوری ہو جاتی ہے۔ ایک شخص نے خوب کہا ہے کہ بعضی گورنمنٹ کی مثال تو دق کی سی ہے جس میں گھل کر مر جاتا ہے اور بعضی گورنمنٹ کی مثال ہیضہ کی سی ہے کہ چٹ پٹ کام تمام ہو جاتا ہے اور دق میں چار برس دس برس تک الجھا رہتا ہے۔ (افاضات الیومین ج ۲۳ ص ۱۱۲)

## حکومت کا مقصد اقتامت دین ہے

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اگر اختیار ایسا ہی ستا ہے کہ ہر مقصود کے لئے اس کا استعمال جائز ہو اس میں کوئی قید ہی نہ ہو تو اس درجہ میں تو حکومت بھی اختیاری ہے آزادی حاصل کریں یا بعنوان دیگر آج کل کی اصطلاح میں قربانی کریں اور یہ قربانی ایسی ہے کہ ذی الحجہ سے پہلے ذی قعده میں بھی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ دیکھ لیں کہ یہ حکومت دین کی ہوگی یا بد دینی کی جس کا معیار حق تعالیٰ کے فرمان سے معلوم ہو سکتا ہے۔

الذين ان مكّنهم في الارض اقاموا الصلوة واتوا الزكوة وامروا بالمعروف ونهوا عن المنكر و الله عاقبہ الامور.

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور بُرے کاموں سے منع کریں۔ اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اگر ایسی نیت ہے تو کوشش کریں یعنی حدود شریعت کا تحفظ شرط ہے مگر اب تو ایسا اطلاق ہو رہا ہے کہ شریعت کے خلاف ہو یا موافق (اس کی پرواہ ہی نہیں) تو ایسی حکومت تو فرعون اور شادا کو بھی حاصل تھی حکومت سے اصل مقصود اقامت دین ہے اور تدایر اس کے اسباب ہیں اگر دین مقصود نہیں جیسا آج کل حالت ظاہر ہے تو لعنت ہے ایسی حکومت پر۔ (الافتراضات الیومیہ ج ۲ ص ۱۸۹)

### بغیر مذہب حنفی کے سلطنت نہیں چل سکتی

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ میں نے ایک انگریز کا قول دیکھا ہے وہ کہتا ہے کہ بغیر حنفی مذہب کے سلطنت چل نہیں سکتی کیونکہ اس قدر توسع اور مراعات مصالح مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ (الافتراضات الیومیہ ج ۲ ص ۲۹۰)

### سلاطین کا اہل اللہ سے مشورہ

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ پہلے سلاطین حضرات اہل اللہ سے مشورہ لیتے تھے کیونکہ ان حضرات کے قلوب نورانی ہوتے ہیں اس لئے ان کو زیادہ تجربوں کی ضرورت نہیں۔ اسی نورانیت سیاست اور ملکی امور میں ان کا مشورہ مفید ہوتا تھا۔ (الافتراضات الیومیہ ج ۲ ص ۲۸۳)

### حکمران کو سادہ لباس پہننا ہی زیب ہے

فرمایا کہ سلاطین کہیں لکھا ہوانہ ملے گا کہ فلاں بادشاہ پچاس گز کپڑا پہنتا تھا ہاں یہ تو ملے گا کہ فلاں بادشاہ ایسا زادہ تھا اس قدر کم قیمت اور سادہ معمولی لباس پہنتا تھا۔ (حسن العزیز ج ۲ ص ۸۲)

### رعایا پر ہیبت جمہوری سلطنت کی نہیں ہوتی

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل جمہوریت کا زور ہے اس کی ترجیح میں کہتے ہیں

کے شخصیت اس لئے مضر ہے کہ ایک شخص کا کچھ اعتبار نہیں دین فروشی کر دے ملت فروشی کر دے قوم فروشی کر دے اسی خیال سے جمہوریت قائم کرنے کی چیز ہے لیکن غور کرنے سے اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ تمہارے تمن میں نالائق بھی حاکم ہو سکتا ہے جس میں یہ احتمال ہو سکتے ہیں اور ہمارا مسلک یہ ہے کہ بادشاہ لائق ہوا یہ شخص کا انتخاب کرو جس پر یہ احتمالات ہی نہ ہوں اور جیسے شہباد تم نے شخصیت میں نکالے ہیں ایسے شہباد جمہوریت میں بھی ہو سکتے ہیں جن کے انسداد کے لئے تم نے جماعت کا انتخاب کیا ہے چنانچہ ایسے واقعات بھی کثرت سے ہیں اب اس کے بعد دیکھ لو کہ کوئی بات عقل کے موافق ہے اور کون نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ رعایا پر جو ہبہت ہوتی ہے وہ شخصیت ہی سے ہوتی ہے جمہوریت اور جماعت کی ایسی ہبہت نہیں ہوتی اور نہ اس درجہ کی ترغیب کام کی ہو سکتی ہے اس لئے کہ طبعاً اس کا بھی خاص اثر ہوتا ہے کام کرنے والوں پر کہ ہمارے اس کام سے امیریا سردار خوش ہو اس سے ان کا دل بڑھتا ہے اور جمہوریت میں کوئی خوش ہونے والا معین نہیں اس لئے کسی کی خوشی کا اثر ہی کیا ہو گا آج ایک جماعت انتخاب میں ہے کل دوسری ہے۔ بس اور شخصیت میں رعایا اور حاکم میں خاص تعلقات ہوتے ہیں جس کو اہل ذوق اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ (اضافات الیومیہ ج ۵ ص ۱۳۳)

## جمہوریت کے کر شے

ایک صاحب نے ایک طبی کالج کے طلباء کا ذکر کیا کہ بڑے ہی آزاد ہیں چھوٹے بڑے کی وہاں پر کوئی پر شش ہی نہیں استادوں کے ساتھ مساوات کا بر تاؤ ہے۔ فرمایا کہ اب تو چھوٹے بھی بڑوں کا اتنا ادب نہیں کرتے جتنا پہلے بڑے چھوٹوں کا ادب کرتے تھے اور آج کل نہ استاد کی پرواہ ہے۔ نہ باپ کی نہ پیر کی عجیب گڑ بڑ پھیل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا سے خیر و برکت انھی چلی جا رہی ہے جمہوریت جمہوریت گاتے پھرتے ہیں یہ سب اسی کی نبوست ہے کہ نہ چھوٹے چھوٹے رہے نہ بڑے بڑے رہے اور علاوہ ان آثار کے خود مقصود کے اعتبار سے بھی یہ جمہوریت ایک کھیل ہے جو قوت شوکت ہبہت شخصیت میں ہے جمہوریت میں خاک بھی نہیں اور ہو بھی کیسے مخلوکیں سمجھتے ہیں کہا آج ایک پر یزید نہ ہے کل کو بدل دیا جائے گا یہ انتخاب کی

برکات اور جمہوریت کے کرشے ہیں اس میں مستحکم انتظام ہو سکتا ہے نہ وزنی کام ہو سکتا ہے بخلاف شخصیت کے کہ وہ بڑی برکت کی چیز ہے مگر عجیب عقلیں ہیں تجربہ کر رہے ہیں کھلی آنکھوں مشاہدہ ہو رہا ہے مگر بازنیں آتے اس بے حسی کا کسی کے پاس کیا علاج اور پھر اس پر بھی بس نہیں شخصیت کو خلاف حکمت بتلاتے ہیں عجیب تماشا ہے۔ (اقاضات الیومینج ۵ ص ۱۳۲)

## حجاج بن یوسف کی عبادت اور امید مغفرت کا حال

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ کسی کو کوئی کیا کہہ سکتا ہے اور کیا سمجھ سکتا ہے۔ حجاج بن یوسف جس کا ظلم مشہور ہے مگر باوجود اس کے (اس وقت ظالموں کی یہ حالت تھی کہ) ایک شب میں تین سورکعات نفل پڑھنا اس کا معمول تھا یہ جس وقت مر نے لگا ہے تو کہتا ہے کہ اے اللہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ حجاج بن یوسف نہیں بخشا جائے گا۔ ہم تو جب جانیں جب ہم کو بخش و متقیوں کا بخش دینا کوئی عجیب بات نہیں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یا کسی دوسرے تابعی سے کسی نے جا کر کہا کہ وہ یہ کہہ کر مرا ہے فرمایا بڑا چالاک ہے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں سے جنت بھی لے مرے گا۔ ایک شخص نے بعد مرجانے کے اس کو خواب میں دیکھا دریافت کیا کہ کیا حال ہے کہا کہ جس قدر مظلوم میں نے قتل کئے ہیں سب کے بد لے ایک ایک مرتبہ مجھ کو قتل کیا گیا اور سعید بن جبیر کے بد لے ستر مرتبہ قتل کیا گیا اور سخت تکلیف میں ہوں پوچھا کہ اب کیا خیال ہے کہا کہ وہی خیال ہے جو سب مسلمانوں کا خدا کے ساتھ ہے۔ یعنی مغفرت کا امیدوار ہوں اور ضرور مغفرت ہوگی یہ خیال اس شخص کا ہے جو دنیا بھر کے نزدیک مبغوض اور مردود ہے وہ بھی خدا کی ذات سے نامید نہیں ہوا اور یہ خیال تو آج کل کے بعضے لمبے وظیفوں کے پڑھنے والوں کا بھی خدا کے ساتھ اتنا قوی نہیں اب بتلائے کوئی کسی کو کیا نظر تحریر سے دیکھے بس جی آدمی کو چاہئے کہ اپنی خیر منائے کیوں کسی کے درپے ہوا پنی ہی کیا خبر ہے کہ کیا معاملہ ہوگا۔ (اقاضات الیومینج ۵ ص ۱۳۳)

## کافر سیاست دان کی اقتداء کی مثال

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اگر ایک شخص سیاست کا ماہر ہے مگر ہے کافر اگر اس میں اس کی اقتداء کر لی جائے تو کیا حرج ہے۔ فرمایا اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ اگر کافر نماز

خوب جانتا ہوا اور مسلمان نہ جانتا ہو تو کیا اس کا فرکی اقتداء جائز ہے شہبہ کا نشاء یہ ہے کہ سیاست کو لوگ دین نہیں سمجھتے خود یہی سخت غلطی اور جہل اعظم ہے سیاست بھی تو دین ہی ہے اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اسلام نے سیاست کی تعلیم نہیں کی سو یہ کتنی بڑی تحریف ہے پھر دین میں کافر کی اقتداء کرنا کیا معنی نیز کیا اس میں اسلام اور مسلمانوں کی اہانت نہیں ہے اور کیا کوئی شخص کہیں یہ بات دکھلا سکتا ہے کہ اس طرح سے اسلام اور مسلمانوں کی اہانت کرانا اور ان کو ذلیل کرانا جائز ہے اور کیا مسلمانوں میں ایسا کوئی نہیں کہ وہ سیاست جانتا ہے البتہ اس طریق سے ان کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں کہ کافر تابع ہوں اور مسلمان متبوع اور یہاں بالکل عکس ہے کہ مسلمان تابع اور کافر متبوع اور مجھ کو عوام کی اور لیڈروں کی شکایت نہیں وہ تو جہل میں بتلا ہیں ہی شکایت تو علماء کی ہے کہ وہ اس غلطی میں پھنس گئے حق تعالیٰ ہدایت فرمائیں اور جہل سے محفوظ مجھ کو ایسی باتیں سن کر بے حد قلق اور صدمہ ہوتا ہے جب لکھے پڑھوں کی نسبت سنتا ہوں کہ وہ ایسی خرافات کے حامی اور دلدادہ ہیں۔ ان اللہ وانا الیہ راجعون۔ عجیب بات ہے کہ خر ان کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ ہو رہا ہے۔ (الافتضات الیومیہ ج ۳ ص ۱۶۹)

### خاص مذہبی سیاست

مذہب اسلام میں جو ایک حصہ سیاسیات کا ہے وہ مدون ہے اس مذین کے موافق اس کو اختیار کرو۔ وہ بہت کافی ہے اور وہ خالص مذہبی سیاست ہے اس میں گڑ بڑ اور کتر پیونت کرنا جائز نہیں جیسا کہ آج کل کے طبائع میں یہ مرض ہو گیا ہے کہ ہر جگہ اپنی رائے کو دخل دینا چاہتے ہیں۔ (اصلاح اسلامین ص ۵۳۳)

### سب کفار مسلمانوں کے دشمن ہیں

بعض لوگ کفار کی ایک جماعت کو برا کہتے ہیں اور بعض دوسری جماعت کو میں کہتا ہوں دونوں برے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک نجاست مریئہ ہے ایک نجاست غیر مریئہ اور ہیں دونوں نجاست کا فرجتنے ہیں سب اسلام کے دشمن ہیں کوئی گورا ہو یا کالا دونوں ہی سانپ ہیں بلکہ گورے سانپ سے کالا سانپ زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔ (اصلاح اسلامین ص ۱۶۵)

## کفار بھی مسلمانوں کو اپنا اصلی مخالف سمجھتے ہیں

گوکفار کسی اپنی مصلحت سے مسلمانوں کی کچھ رعایت کریں مگر یہ یقینی بات ہے کہ وہ اسلام کو اپنے لئے مضر سمجھتے ہیں اور اس واسطے اس کے مٹانے کی فکر میں ہیں۔ (اصلاح اسلامین ص ۷۵)

## مسلمانوں کے دوست

یہ مسلمانوں کی انتہائی بد نہی ہے کہ غیر قوموں کے بغلوں میں جا کر گھتے ہیں ان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین امنوا حصر کے ساتھ فرماتے ہیں کہ تمہارا کوئی دوست نہیں سوائے اللہ کے اور رسول اور مونین کے۔ (اصلاح اسلامین ص ۵۱۶)

## حکام وقت کو برا کہنا بے صبری کی علامت ہے

بعض لوگ مصائب سے تنگ آ کر حکام وقت کو برا بھلا کہتے ہیں یہ بھی علامت ہے بے صبری کی اور پسندیدہ تدبیر نہیں اور حدیث شریف میں اس سے ممانعت بھی آئی ہے چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ”بادشاہوں کو برا ملت کہوان کے قلوب میرے قبضے میں ہیں میری اطاعت کرو میں ان کے دلوں کو تم پر زم کر دوں گا۔“

یاد رکھو جو مصیبت آتی ہے منجانب اللہ ہوتی ہے فرماتے ہیں ما اصحاب من مصیبة الا باذن اللہ یعنی کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ کے حکم سے ”اور جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اس کا علاج یہی ہے کہ ادھر رجوع کرے اور پھر جو پیش آئے خبر سمجھے اس لئے کہ

ہر چہ آں خرد کند شیرین بود  
اور شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

از خداداں خلاف دشمن و دوست  
(ص ۵۲۳)

کہ دل ہر دو در تصرف اوست  
(ص ۵۲۲)

## کامیابی کی اصل تدبیر

مسلمانوں کا سوائے خدا کی ذات کے کوئی حامی نہیں اور مددگار نہیں اور ان کو اور کسی کی

ضرورت بھی نہیں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں نظم ہو اور دین ہو تو تمام دنیا کی غیر مسلم اقوام اس کی حالت میں بھی ان کا کچھ بگاڑنے سکتیں۔ لیکن مسلمان دیے تو بہت کچھ گز بڑ کرتے ہیں مگر جو اصل تدبیر ہے اور کام کی تدبیر ہے جس سے پہلوں کو کامیابی میسر ہو چکی ہے وہ نہیں کرتے وہ تدبیر یہ ہے کہ اپنے خدا کو راضی کرنے کی فکر کریں۔ اب تو بڑی تدبیر ان کی مشرکوں کی تعلیم پر عمل کرنا ہے ان کو لوگ عاقل سمجھتے ہیں بھلا ایسا شخص کیا عاقل ہو گا جس کو انجام کی خبر نہیں اگر ایسے لوگ عاقل ہوتے تو آخرت کی فکر کرتے۔ (اصلاح اسلامیں ص ۵۲۸ مص ۵۲۹)

### اسلام کی قوت کا مدار شخصیتوں پر نہیں

اسلام کی قوت کا مدار حق پر ہے اور حق میں وہ قوت ہے کہ اگر ایک شخص حق پر ہو اور سارا عالم اس کا مخالف ہو تو وہ ضعیف نہیں اور اگر یہ شخص حق پر نہیں سارا عالم اس کا معتقد ہو وہ شخص ضعیف ہے اس میں کچھ قوت نہیں۔ (اصلاح اسلامیں ص ۵۲۵)

### سلاطین اسلام کا احترام لازم ہے

سلاطین اسلام کی علی الاعلان ابانت میں ضرر ہے جمہور کا ہبیت نکلنے سے فتن پھیلتے ہیں اس لئے سلاطین اسلام کا احترام کرنا چاہئے۔ (اصلاح اسلامیں ص ۵۲۲)

### قانون شریعت مصلحت عامہ کے خلاف نہیں

کوئی قانون مصالح خاصہ کا ذمہ دار نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ مصالح خاصہ آپس میں تناقض ہوتے ہیں جن کا جمع ہو سکنا بھی محال ہے بلکہ قانون مصالح عامہ کی حفاظت کرتا ہے سو بحمد اللہ قانون شریعت مصلحت عامہ کے خلاف نہیں۔ (اصلاح اسلامیں ص ۵۲۵ مص ۵۲۶)

### آج کل کی سیاست میں غیر شرعی اموری نشاندہی

آج کل کی سیاست میں گرفتاری پیش کرنا جیل جانا، مار کھانا، ہڑتا لیں کرنا اور جلوس وغیرہ نکالنا مطالبات منوانے کے لئے موثر تدبیر کبھی جاتی ہے شریعت میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔ تفصیل کیلئے اشرف الاحکام مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ہارون آباد ضلع بہاولنگر کا مطالعہ کریں۔

## خلاف شرع امور میں حاکم اطاعت جائز نہیں

امیر اگر عدل پر قائم ہے تو اس کی اطاعت واجب ہے اور اگر وہ عدل و انصاف کو چھوڑ کر خلاف شرع احکام صادر کرے تو ان میں امیر کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لَا طَاعَةَ الْمُخْلوقَ فِي مُعْصِيَةِ الْخَالقِ یعنی مخلوق کی ایسی اطاعت جائز نہیں۔ جس سے خالق کی نافرمانی لازم آتی ہے۔ (سائل معارف القرآن ص ۱۹۰)

### حاکم کو اپنی رعیت کی گیری رکھنا ضروری ہے

حاکم کو اپنی رعیت اور مشائخ کو اپنے شاگردوں اور مریدوں کی خبر گیری رکھنا ضروری ہے۔ (معارف القرآن ج ۲ ص ۵۷۰)

## اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے

اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے، امیر کا انتخاب مشورہ سے ہوتا ہے۔ خاندانی وراثت سے نہیں۔ آج تو اسلامی تعلیمات کی برکت سے پوری دنیا میں اس اصول کا مانا جا چکا ہے۔ شخصی بادشاہیں بھی طوعاً و کرہاً۔

لیکن موجودہ طرز کی جمہوریتیں چونکہ بادشاہی ظلم و ستم کے طور پر وجود میں آئیں تو وہ بھی اس بے اعتدالی کے ساتھ آئیں کہ عوام کو مطلق انسان بنانا کر پورے آئیں حکومت اور قانون مملکت کا ایسا آزاد مالک بنایا کہ ان کے قلب و دماغ زمین و آسمان اور تمام انسانوں کے پیدا کرنے والے خدا اور اس کی اصلی مالکیت و حکومت کے تصور سے بھی بے گانہ ہو گئے اب ان کی جمہوریت خدا تعالیٰ کے بخشنے ہوئے عوامی اختیار خدا تعالیٰ کی عائد کردہ پابندیوں کو بھی بار خاطر خلاف انصاف تصور کرنے لگے۔

(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ معارف القرآن ج ۲ ص ۲۲۳ تا ۲۲۶)

## اسلام میں جمہوریت کا تصور

از افادات: حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی

نظام عالم تابعیت و متبوعیت کو چاہتا ہے۔ اس لئے متبوع کو تابع کی مساوات گوارا نہیں اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے۔ تاکہ ایک تابع ہو، ایک متبوع ہو سب کے سب آزاد ہوں بلکہ متبوع کے سامنے تابع کی آزادی سلب ہو جائے یہ حقیقت ہے سلطنت کی۔ اگر سلطنت نہ ہو تو ہر شخص آزاد ہو گا اور آزادی مطلق انتظام کے لئے ہرگز کافی نہیں اور نہ کسی نے آج تک اس کو گوارا کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جو سلطنت کا مخالف ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدوس سلطنت کے انتظام نزاعات کا فیصلہ کیونکر ہو گا۔ اگر کہو کہ کثرت رائے سے فیصلہ ہو گا تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہو گا۔ وہی سلطنت کے مصدقہ ہو گئے۔ کیونکہ ان کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہو گئی اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی۔ کہ بعض کی آزادی بعض کی رائے کے سامنے سلب ہو جائے۔ کثرت رائے پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی آزادی مطلق کہاں رہی اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہو گی۔ تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا بلکہ ایک کو تابع ایک کو متبوع بنایا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطے سے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے۔ تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جائے۔ ورنہ بہت سہل تھا کہ انبیاء کو نہ بھیجتے بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آگرا کرتے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر کام کرتا نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا نہ خلیفہ کا نہ علماء و مجتہدین کا۔۔۔۔۔ شاید کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پر یہیں کہاں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب تم نے پر یہیں ایجاد کرنے ہیں تو خدا تعالیٰ کو پر یہیں بنالینا کیا مشکل ہے۔ بلکہ جو کچھ تم ایجاد کرتے ہو یہ عقل سے ایجاد کرتے ہو اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے۔ تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ

کی ایجاد ہے تمہارا تو محض نام ہی نام ہے۔ اس لئے یہ شبہ محض لغو ہے۔ دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس وقت بھی پر لیں موجود ہے کیونکہ کتابین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا۔ ایسی سیاہی اور ایسا کاغذ تو کسی پر لیں کو بھی نصیب نہیں جو قیامت تک باقی رہے۔ تو پھر کتابین اعمال آپ کے کاموں کو ایسی سیاہی سے روزانہ لکھتے ہیں۔ وہی اگر احکام کو لکھ کر ہر شخص کے پاس ڈال دیا کریں تو کیا مشکل ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ احکام کو نبی پر نازل کیا۔ اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا تاکہ آزادی سلب ہو جائے۔ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں۔ اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں۔ وہ بھی آزادی کا عام ہونا گوارا نہیں کرتے کیونکہ جمہوری سلطنت کے بعد بھی وہ کوئی قانون ہو گا جس کی پابندی عام رعایا پر لازم ہو گی۔ تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہو جائے گی ہم تو آزادی کا دعویٰ جب مانیں گے جبکہ کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جاوے بلکہ جس کے جو جی میں آوے کرنے دیا جائے۔ کسی سے کچھ مزاحمت نہ کی جاوے کیونکہ تم تو آزادی کے حامی ہو تو اسی کا نام ہے کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔ پھر تم لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو اور ان کی آزادی کو قانون کا تابع کیوں بناتے ہو یا کم از کم یہی کرو کہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے لے لیا کرو۔ قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں۔ مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے کبھی حکمی۔ فلسفہ کا مسئلہ یہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں۔ تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں اس میں گو بطاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں مگر مجموعہ مل کر پھر شخص واحد ہے کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو شخص جو رائے دے دے وہی پاس ہو جایا کرے۔ اگر ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی قدر آزادی کا دعویٰ صحیح ہوتا۔ مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ کرو واحد حکمی ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں اور تم شخص واحد حکمی

کے حامی ہو۔ جمہوریت کے حامی تو تم بھی نہ رہے۔ جمہوریت اور آزادی کامل توجہ بھوتی جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا۔ کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا۔ نہ ایک بادشاہ کا نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنادیا ہم تو ایک ہی کاغلام بناتے تھے تم نے دس کا غلام بنادیا۔ تمہیں فیصلہ کر لو کہ ایک کاغلام ہونا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو وہ اس سے بہتر ہے جس پر دس کی حکومت ہو۔ یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کر رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔ شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعوے کہیں نہیں ٹوٹتے۔ شریعت نے آزادی کا ایسے زور سے دعویٰ ہی نہیں کیا۔ جو اس پر نقص وارد ہو۔ اور جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں کسی وقت ان کو اپنے دعویٰ سے ہٹنا پڑتا ہے آخر کیوں ہٹتے ہو۔

اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلہ کو نہ مانے تو اس کو مجبور کیوں کرتے ہو اسے پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے مگر کیونکر آزاد رہنے دیں۔ نظام عالم بدلوں اس کے قائم نہیں ہو سکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں۔ بعض متبع ہوں۔ آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں آ کر ان کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے اور شریعت کو بھی اپنے دعویٰ سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے تابعیت و متبعیت کی حامی ہے۔ وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں اول، ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے۔ جس نے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا۔ بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانے میں دونبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے۔ دوسرے متبع تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دونبی تھے۔ جو بنی اسرائیل و قوم قبط کی طرف مبعوث ہوئے تھے مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبع تھے۔ حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے۔ دونوں برابر درجہ میں نہ تھے۔ اور نیہ تابعیت حضن ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے۔ وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک واقعہ ایسا پیا کر دیا جس سے اس حقیقت کا

ظہور ہو گیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ با کر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا اور ان کی اصلاح کرتے رہنا۔ یہاں پیچھے یہ قصہ ہوا کہ سامری نے ایک سونے کا چھڑا بنا�ا اور اس میں دم جبرائیل کی مٹی ڈال دی جس سے اس میں حیات پیدا ہو گئی۔ ”فقالوا هذا الہکم والہ موسیٰ فنسی“ جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا تو یہ ہے۔ وہ بھول کر نامعلوم کہاں چلے گئے بس بے وقوف لگے اس کی عبادت کرنے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع دی۔ وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے اور قوم کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ اسی وقت انہوں نے ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب یہ کم بخت گمراہ ہو گئے تھے تو تم یہاں کیوں رہے۔ میرے پاس باقی ماندہ جماعت کو لے کر کیوں نہ چلے آئے اور غصہ میں ان کا سر اور ڈاڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے۔

قال يا ابن ام لا تأخذ بلحیتی ولا براصی“ ہارون علیہ السلام نے کہا کہ ارے بھائی میری ڈاڑھی اور سر کونہ پکڑو۔ میری بات سنو! مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں ان کو چھوڑ کر چل دوں گا تو آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے وہاں رہ کر ان کو سمجھایا کیوں نہیں۔ ان کی اصلاح کیوں نہ کی۔ اس لئے میں یہیں رہ کر ان کو سمجھا تارہا۔ حالانکہ ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر نبوت میں ان کے تالع تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے بے تکلف اپنی متبوعیت اور ان کی تابعیت کے مقتضی پر عمل کیا اور وہ بر تاؤ کیا جو حاکم ملک کے ساتھ کرتا ہے۔ آج ایک سب انسپکٹر باوجود یہ کہ ان سپکٹر کا تالع اور ماتحت ہوتا ہے مگر ان سپکٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کر کے تو دیکھیں۔ معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعیت مخفی ضابطہ کی نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی جس کا اس واقعہ سے ظہور ہو گیا اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ دونوں رسولوں میں ایک تالع ہیں۔ ایک متبوع ہیں اور دونوں یکساں مرتبے میں نہیں ہیں۔ اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہو گا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ لیجئے ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آگئی کہ حق تعالیٰ کی متبوعیت اور تابعیت کا ظاہر کرنا تھا۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ نے ایسا بیتاب کر دیا۔ جس سے انہوں نے اپنی

حکومت و مبوعیت کے مقضا پر بے تکلف عمل کیا اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی۔

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے..... اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوری میں متفقین ہیں۔ شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں بیان کی جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو۔ اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہئے بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے۔ کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا۔ ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں۔ کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تاریخی کو ایجاد کیا ایک نے ریل کو ایجاد کیا تو موجود اکثر شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صد ہزار ہائی مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا علوم میں بھی یہ امر مشاہدہ ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شرایح و حکیمین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہے تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے۔ تو اب بتلائیے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا۔ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تو بادشاہ اپنی رائے پر عمل نہیں کر سکتا۔ بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ سب مجبور ہیں۔ غلط رائے کی موافقت پر۔ اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے اس لئے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جاوے۔ خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی نے سید احمد خان سے کہا

تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ جماعت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو۔ کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بے وقوف زیادہ تو اس قاعده کی بنا پر کثرت رائے کا فیصلہ بے وقوفی کا فیصلہ ہو گا۔ سید احمد خان نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاء کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے یہ اس صورت میں ہے جبکہ بہت سے آدمیوں کو کیف ماتفق جمع کر لیا جاوے تو ان میں واقعی بے وقوف زیادہ ہوں گے لیکن ہم جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیف ماتفق جمع نہیں کئے جاتے بلکہ انتخاب کر کے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس میں سب عقلاء ہی ہوتے ہیں۔ تو ان میں جس طرف کثرت ہو گی وہ بے وقوفوں کی کثرت نہ ہو گی بلکہ عقلاء کی کثرت ہو گی مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا۔ لیکن عقلاء میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل اعقل تھوڑے ہیں اور ناقص اعقل زیادہ۔ چنانچہ تجربہ کر لیا جائے کہ ہزار عاقلوں میں کامل اعقل دو ہی ہوتے ہیں۔ تو عقلاء میں بھی کثرت انہی لوگوں کی ہے جو ناقص اعقل ہیں پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر جماعت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہو گا۔

سید احمد خان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بالکل خاموش ہی ہو گئے۔ غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بچوں شخصی حکومت کے ممکن نہیں جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے۔ خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہو بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے قول کے موافق کثرت رائے اکثر غلط ہی ہو گی تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اس وقت تک انتظام درست نہیں ہو سکتا پس ثابت ہو گیا کہ انتظام بدول شخصی حکومت نہیں ہو سکتا۔

دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے۔ وہ پہلے ہی سے اس کو تسلی کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہارائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں، ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے ان کو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنایا جائے۔ اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل و عقد اور اے جماعت عقلاء بادشاہ ایسے شخص کو

بناو جو اتنا صاحب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اس کی رائے صحیح ہو۔ اور جس کی رائے میں اتنی زرانت نہ ہو اس کو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ اب بتاؤ جس کی رائے اتنی زریں ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں کبھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو۔ وہ حکومت شخصی کے قابل ہے، بشرط یہ کہ اہل حل و عقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔ بس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زریں اعقل صائب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نا اہل سمجھتے ہو۔ تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جس کے لئے ضم ضمیر کی ضرورت ہو بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناو جو ضم ضمیر کا محتاج نہ ہو۔ مستقل الرائے ہو اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے صائب اعقل زرین سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کامدار رکھنا اور کامل اعقل کو ناقصین کی رائے کے تابع بنانا ہے۔ جس کا حمافت ہونا بدیکی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ حمافت سوچی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھوٹنہا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ وشاورہم فی الامر مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا۔ اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے۔ اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کرو۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا ان کے آقانے کر دیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں، اگر چاہیں فتح کر دیں۔ اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار عحق کہتے ہیں اس اختیار کی بناء پر حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نکاح سابق کو فتح کر دیا لیکن ان کے شوہر کو ان سے بہت محبت تھی۔ وہ صد مہ فراق میں مدینہ کی گلی کو چوں میں روتے پھرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر رحم آیا اور حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کیا اچھا ہوا گر تم اپنے شوہر سے رجوع

کرو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک فرد ہے اگر حکم ہے تو برسو چشم منظور ہے۔ گوئی کو تکلیف ہی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے۔ تو حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صاف عرض کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی۔

لیجئے اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ تو بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے۔ چنانچہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ذرا بھی ناراض نہ ہوئے۔ نہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کچھ گناہ ہوانہ ان پر کچھ عتاب ہوا سو جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے۔ اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔ پس ”شاورهم فی الامر“ سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو اس وقت تک ”شاورهم فی الامر“ سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔

جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا۔ تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اور ہمارے پاس حدیث بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دلیل موجود ہے۔ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہرگز نہیں ہیں۔ بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں۔ خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو چنانچہ اس آیت میں آگے گے ارشاد ہے:-

فَإِذَا عَزَّمْتَ فَتُوكِلْ عَلَى اللَّهِ

کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل

کریں۔ یہاں اذا عزمت صیغہ واحد ہے۔ معلوم ہوا کہ عزم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو اذا عزمت نہ فرماتے بلکہ اس کی بجائے اذا عزم اکثر کم فتو کلوا علی اللہ فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود ان کے دعویٰ کی تردید کر رہا ہے۔ مگر ان کی حالت یہ ہے حفظت شيئاً و غابت عنک اشیا کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں۔ اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں۔ چنانچہ شریعت میں اشیروا الحکام وہ حق کم علیہم کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ از دم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی۔ کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے۔ چاہے بادشاہ سے رائے لے یا نہ لے۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کر دے۔ تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدوس مشورہ لئے یہ حکم جاری کیا گیا۔ بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا ہے ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے۔ (تقلیل الاختلاف مع الانام ص ۲۸)

## کثرت رائے کلیہ دلیل نہیں کہ حق اسی میں ہے

ج نمبرا۔ آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے۔ صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے۔ کیا ان عوام کا لانعام کی؟ اگر انہی کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا، ساری قوم ایک طرف رہی اور حضور ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انہوں نے کیوں توحید چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی۔ کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا۔ اسی لئے کہ وہ قوم

جاہل تھی۔ اس کی رائے جاہل انہ رائے تھی۔ آج کل علماء پر یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے قوم میں پھوٹ ڈال دی۔ یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے۔ (فضائل اعلم والخیہ ص ۳۰)

ج نمبر ۲:- (غزوہ احمد میں) ان پچاس آدمیوں میں (جو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین کر دیئے گئے تھے) اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہو گئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا، وہ غرض حاصل ہو چکی اس لئے حکم قرار بھی ختم ہو گیا۔ اب یہاں سے بٹھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کی مخالفت نہ ہو گی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ سہیں ایا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہئے۔ ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہئے بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمادیا تھا کہ بدوں میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا۔ اس لئے ہم کو بدوں آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہئے مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے یہاں سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افران کے رہ گئے (اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلت رائے صواب پر تھی)۔ جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔ (ذم النیان ص ۱۲)

ج نمبر ۳:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کچھ قابل مرتد ہو گئے تھے جن میں بعض تو مسلمہ کذاب وغیرہ مدعاں نبوت کے ساتھ ہو گئے تھے اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے تو حیدور سالت کے مقرر ہے۔ کعبہ کو قبلہ مانتے رہے نماز کی فرضیت کے قابل رہے مگر زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہو گئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مخصوص تھی اب فرض نہیں۔ اور علت یہ بتلائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا۔ اس لئے اس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی اب وہ حالت نہیں رہی اس لئے فرضیت بھی باقی نہیں رہی جیسے آج کل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کیا کرتے ہیں۔

پہلی جماعت کے بارہ میں سب صحابہ کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کر لیا جاوے۔ مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نہ تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور جو کھلے کافر ہیں صرف ان سے لڑائی کی جاوے۔ ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جاوے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو بھی کافر کہتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تول الله الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان پر کیونکر جہاد ہو سکتا ہے۔ اور ان کو کفار کی طرح کیے قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی۔ مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں کہ نماز کو تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں اور ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من بدل دینہ فاقتلوه اس لئے میں ان کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر کہا کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کریں گے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

”اجبار فی الجahلیه خوار فی الاسلام واللہ لو منعوںی و فی روایہ عناقاً“

کانوا یؤدونه الى رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم لا قتلنهم علیه“

ترجمہ:- اے عمر! یہ کیا کہ تم جاہلیت میں توز برداشت تھے اور اسلام میں اتنے بودے ہو گئے۔ بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا بکری کے بچے کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔ تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔

اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ان اللہ معنا تور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں۔ اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا تو خدا میرے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا..... کیا انتہا ہے اس قوت قلب کی۔ چنانچہ پھر سب صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کی رائے پر متفق ہو گئے (اس واقعہ سے بھی ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے جو کثرت رائے کو علامت حق سمجھے ہوئے ہیں)۔ (ذم النیان ص ۳۰)

حامد اور مصلیاً: اس وقت عام طور سے علماء حنفی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ سیاست حاضرہ میں مسلمانوں کی قیادت کیوں نہیں کرتے اور اس کی بنیاد پر ایک غلط مقدمہ ہے وہ یہ کہ سیاست ایک حصہ ہے شریعت کا تو علماء شرائع کو ماہر سیاست ہونا ضروری ہے۔ سو اس مقدمہ میں معتبر ضمین کو ایک خلط ہو گیا ہے وہ یہ کہ سیاست کے دو حصے ہیں ایک سیاست کے احکام شرعیہ۔ یہ بے شک شریعت کا جزو ہے اور کوئی عالم اس سے ناواقف نہیں۔ چنانچہ ابواب فہریہ میں سے کتاب السیر ایک مستقل اور مبسوط جزو ہے جس کی درس و تدریس پر دوام والتزام ہے اور دوسرا حصہ سیاست کا اس کی تدبیر تجربہ ہیں جو ہر زمانہ میں حالات و واقعات اور آلات وغیرہ کے تغیر و تبدل سے بدلتی رہتی ہیں اور یہ حصہ شریعت کا جزو نہیں اور علماء کا اس میں ماہر ہونا ضروری نہیں۔ اگر اس میں کوئی عالم ماہر ہو اس کی مہارت کے دوسرے ذرائع ہیں۔ جن کا حاصل تجربہ و مناسبت خاصہ ہے۔

لیکن اور جو عرض کیا گیا کہ سیاست کا یہ حصہ یعنی تدبیر تجربہ شریعت کا جزو نہیں۔ اس کے معنی نہیں کہ وہ حصہ شریعت سے مستغنی ہے اور اس کے استعمال کرنے والوں کو علمائے شریعت کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہیں، اگر کسی کا ایسا خیال ہے مੱحض غلط ہے۔ کوئی واقعہ اور کوئی عمل اور کوئی تجویز اور کوئی رائے دنیا میں ایسی نہیں جس کے جواز و عدم جواز میں شریعت سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہ ہو گو وہ شریعت کا جزو نہ ہو تو جزو نہ ہونے سے تابع نہ ہونا لازم نہیں آتا۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے فن طب میں سیاست بدنبیہ یعنی اصلاح احوال بدن کی تدبیر مدون کی گئی ہیں اور مطب میں ان ہی تدبیر کی مشق کرائی جاتی ہے مگر علمائے شرائع کے لئے ان تدبیر میں ماہر ہونا کسی کے نزدیک بھی لازم نہیں اور نہ یہ عدم مہارت ان کے حق میں نقص ہے۔ البتہ ان تدبیر کے جواز و عدم جواز شرعی کی تحقیق ان کا فرض منصبی سمجھا جاتا ہے بس جو معاملہ سیاست بدنبیہ بالباء یعنی طب کے ساتھ بلا نکیر کیا جاتا ہے کہ حاملان تدبیر طبیہ کی جدا جماعت سمجھی جاتی ہے۔ اور حاملان احکام شرعیہ یعنی ان

تم ابیر کے جواز و عدم جواز کی تحقیق کی جدا جماعت سمجھی جاتی ہے۔ دوسری جماعت کو پہلی کے فرائض پر مجبور نہیں کیا جاتا اور نہ ان فرائض سے بے خبری کو ان کے حق میں نقص سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح سیاست مدنیہ بالکم یعنی نظام ملکی کے ساتھ معاملہ کرنا لازم ہے کہ تم ابیر نظام کی جدا جماعت سمجھی جاوے۔ ان تم ابیر کے شرعی احکام کی جدا جماعت سمجھی جاوے اور دوسری جماعت کو پہلی جماعت کے فرائض پر مجبور نہ کیا جاوے اور نہ ان فرائض کے فرائض کے فقدان کو ان کے حق میں نقص سمجھا جاوے۔ طریق عمل میں دونوں جماعتوں کے فرائض کو اس طرح جمع کیا جاوے کہ پہلی جماعت سے تم ابیر کی تحقیق کریں اور دوسری جماعت سے احکام شرعیہ کی، اسی طرح جہاں نظام مذکور فرض ہو جاوے خود دوسری جماعت بھی پہلی سے تم ابیر دریافت کریں، اور بشرط جواز شرعی ان پر عمل کریں اور پہلی جماعت دوسری جماعت سے جواز و عدم جواز کی تحقیق کریں..... اور بعد ثبوت جواز ان پر عمل کریں۔

کما سیاتی فی الاستدلال الاتی من استر شاد الملوك من الانبياء  
عليهم السلام طاعتهم لهم وارشادهم للملوك وموافقتهم لهم في النظام  
ترجمہ:- ”جیسا کہ آئندہ آنے والے استدلال میں عنقریب آتا ہے کہ شاہان وقت حضرات انبیاء عليهم السلام سے رہنمائی طلب کرتے تھے اور (یہ بادشاہ) ان انبیاء عليهم السلام کی اطاعت کرتے تھے اور ان کی رہنمائی کے مطابق نظام (سلطنت) چلاتے تھے“  
یہ معنی ہیں دونوں جماعتوں سے کام لینے کے اور دونوں جماعتوں کے بالاتفاق کام کرنے کے۔ البتہ اگر کسی وقت کوئی جماعت اہل سیاست کی ایسی نہ ہو کہ علماء سے احکام پوچھ کر عمل کیا کریں۔ جیسا اس وقت غالب ہے تو اس وقت علماء ایسی جماعت کے پیدا ہونے کے منتظر نہ رہیں ورنہ مجان دنیادینی مقاصد کو تباہ کر دیں گے بلکہ وہ خود اپنے میں سے ایسی جماعت بنادیں جو علماء و عملاء سیاست و شریعت کے جامع ہوں۔ مگر یہ حکم کچھ سیاست مدنیہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سیاست بدنیہ یعنی طب بلکہ اسباب معاش میں سے جتنے فرض کفایہ ہیں مثل تجارت و زراعت سب کا یہی حکم ہوگا البتہ جس چیز کا ضرر دین میں قریب ہو اس میں دخل اصلاحی کا وجوب ایسی چیز میں دخل اصلاحی کے وجوب سے اقویٰ و اکد ہوگا

جس کا ضرر دین میں قریب نہ ہوا اور ان مقاصد کی اصلاح کے لئے خصوص حفاظت دین کے لئے جماعت کا انتظام کرنا ہر حال میں مشروط ہو گا استطاعت کے ساتھ یہ تو ایک تحقیق کلی ہے اس سے آگے کچھ جزئیات ہیں جن میں کلام کچھ متفق علیہ کچھ مختلف فیہ اپنے محل میں مبسوط و مضبوط ہے ان میں ایک مسئلہ استطاعت کا بھی ہے اور یہ مسئلہ یعنی عدم لزوم علم بالنظم اعلم الاحکام ہر چند کہ بد یہی جلی ہے اور اگر خفی بھی ہوتا تب بھی طبی مثال سے تنبیہ کے بعد جلی ہو گیا اور اس بداعہت کے سبب محتاج اثبات بالدلیل نہیں مگر میں تبرعاً بعض آیات سے اس کو زیادہ منور کئے دیتا ہوں وہ آیات سورہ بقرہ کی ہیں۔

الْمَ تَرَالِي الْمَلَءُ مِنْ بَنَى إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِلَيْهِ قَوْلُهُ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجَنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهْرِ الْخَ

جس کے ترجمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے (بہت) بعد (لما نقلہ اهل السیر) قوم جالوت کے ظالمانہ تسلط سے تنگ آ کر بنی اسرائیل کے ممتاز لوگوں نے اپنے ایک نبی سے (جن کا نام شمویل ہے) عرض کیا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مستر کر، یعنی ہم اس کے ساتھ (مل کر قوم جالوت سے) جہاد کریں۔ انہوں نے (کچھ گفتگو کے بعد جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا (اخير قصہ میں یہ ہے کہ) طالوت لشکر کو لے کر چلے اور فرمایا، اللہ تعالیٰ تمہارا ایک نہر سے امتحان کرنے والے ہیں (پھر جالوت کے قتل پر اور حضرت داؤد علیہ السلام کو نبوت و سلطنت عطا ہونے پر قصہ ختم ہو گیا) ان آیتوں سے اثبات مدعای تقریر یہ ہے کہ قرآن مجید میں نص ہے کہ بنی اسرائیل نے باوجود ان میں ایک نبی موجود ہونے کے (خواہ ان کا نام یوشع علیہ السلام ہو کما قالہ فتادہ یا شمعون ہو کما قالہ السدی یا شمویل ہو کما علیہ الاکثر بہر حال اذ قالو النبی للہم میں ان کا نبی ہونا مصرح ہے) ان نبی سے یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے قائد بنئے بلکہ اس مقصود کے لئے ایک مستقل بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی سو اگر نبی کافی سمجھے جاتے تو ایسی درخواست کیونکر کی جاتی اور اگر شبہ ہو کہ یہ بنی اسرائیل کی غلطی تھی تو اس غلطی پر ان نبی نے متقبہ کیوں فرمایا کہ میں کافی ہوں بلکہ بادشاہ مقرر کرنے کا

انتظام شروع فرمادیا۔ اور اگر کوئی جارت کر کے یہ کہنے لگے کہ ان نبی سے بھی لغزش ہو گئی تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس غلطی پر تنبیہ کیوں نہیں فرمائی بلکہ اس درخواست کو قبول فرمایا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ خود ہر نبی کے لئے بھی سیاسیات میں تجربہ و مناسبت لوازم میں سے نہیں تابہ دیگر ان از علماء و مشائخ چہ رسد۔ پس مدعا بحمد اللہ با صراح و اوضع وجہ ثابت ہو گیا بلکہ مفسرین کی نقل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے سنتہ اللہ زیادہ یہی رہی کہ کان اقوام امرہم بالملوک وہم کانو یطیعون الانبیاء کذافی التفسیر المظہری تحت قوله تعالیٰ ابعت لنا ملکاً وکثیر امن التفاسیر وفي المظہری ايضاً قوله اتاه اللہ الملک جمع اللہ تعالیٰ له الامرین ولم يجتمعوا قبل ذالک بل کان الملک فی سبط والنبوة فی سبط:

ترجمہ:- (ان کے سیاسی معاملات بادشاہوں سے متعلق ہوتے تھے اور بادشاہ انبیاء کے حکم اور مشورہ کے مطابق چلتے، چنانچہ تفسیر مظہری نے بھی ”ابعث لنا ملکاً“ کے تحت میں یہی لکھا ہے) اور طالوت کے باب میں جو بسطہ فی العلم والجسم آیا ہے اس کی تفسیر میں معرفة الامور السياسية وجسامه البدن منقول ہے کذافی روح المعانی لیکن اس سنت کی اگر کثرت بھی نہ ہو ایک نبی کے تجربہ و مناسبت فی السیاست کی نفی بھی اثبات مدعا کے لئے کافی ہے کیونکہ کسی نبی میں کسی نقص کا ہونا جائز نہیں۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ ایسے تجربہ و مناسبت کا نہ ہونا نقص نہیں۔

وہ مطلوب اگر شبہ کیا جاوے کہ بعض اقوال پر طالوت بھی نبی تھے کما فی التفسیر المظہری تحت قوله تعالیٰ بسطہ فی العلم قیل اتاه الوحی حین اوتی الملک وفیه ايضاً تحت قوله تعالیٰ قال ان

الله مبتليکم اما یوحی اللہ تعالیٰ ان کان نبیا واما بار شاد نبیهم

تو نبی کے ہوتے ہوئے ان سے یہ کام نہ لینا۔ اثبات مدعا کے لئے کہ کمال نبوت کے لئے کمال سیاسی لازم نہیں کافی ہے۔ اب ایک ضعیف ساستبعاد رہ گیا۔ جس کا درجہ مخفی ایک وحشت عنوانیہ سے زیادہ نہیں جس کا منشاء ذہن میں عرف عامینہ کا استیلا ہے حقیقت حکیمانہ پر

وہ یہ کہ امور سیاسیہ کا علم بوجہ اپنے آثار نافعہ کے کمال ہے۔ تو اس کا فقدان نقص ہو گا۔ پھر حضرات انبیاء و رشتہ الانبیاء کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ جواب ظاہر کہ اگر یہ نقص ہوتا تو انبیاء کے لئے کیسے تجویز کیا جاتا۔ اور لم اس کی یہ ہے کہ کمال اور نقص متناقض نہیں کہ کمال کا رفع نقص کے وضع کو سلزیم ہو بلکہ متفاہ ہیں دونوں کا رفع اور درمیان میں واسطہ کا ہونا جائز ہے۔

چنانچہ بعثت عالمہ کمال ہے مگر اس کا عدم بھی نقص نہیں ورنہ بجز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جمیع انبیاء کا نقص لازم آئے گا۔ نعوذ باللہ منه خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود کمال جامعیت اور سیاست میں بھی ماہر پت کے غزوہ احزاب میں حفر خندق کی تدبیر حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حاصل ہوئی۔

کما فی کتب الحدیث والسیر فی حاشیہ الکشمہینی علی البخاری  
باب التحریض علی القتال علی قوله خرج الی الخندق برمزہ ولم  
یکن اتخاذ الخندق من شان العرب ولكنہ من مکائد الفرس اشار  
بذاک سلمان الفارسی قال يا رسول الله کنا بفارس اذا خوصرنا  
خندقنا علينا فامر بحفره و عمل بنفسه ترغیباً للمسلمین.

قصہ تاہیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اتم اعلم بامور دنیا کم ایسے ہی تجارت پر  
محمول ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ ایسے تجارت و تدبیر اپنی ذات میں دنیوی امور ہیں گو مباح ہوں۔  
عارض بے دین ہو جاتے ہیں اس لئے ان کا نہ جاننا کسی درجہ میں کمال مقصود میں قادر نہیں۔

(ولنختم المقالہ علی دعاء الوقایہ عن الضلالہ فی کل حالہ)

## غیر اسلامی حکومت کے شرعی احکام

از افادات حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تحانوی

دارالحرب دارالاسلام کی تحقیق ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں  
کسی نے دریافت کیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟

فرمایا عموماً دارالحرب کے معنی غلطی سے یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جہاں حرب (لڑائی) واجب ہو سو اس معنی کو لو تو ہندوستان دارالحرب نہیں کیونکہ یہاں (آپسی) معاهدہ کی وجہ سے حرب (لڑائی) درست نہیں۔

مگر شرعی اصطلاح میں دارالحرب کی تعریف یہ ہے کہ ”جہاں پورا تسلط غیر مسلم کا ہو“ تعریف تو یہی ہے آگے جو کچھ فقہاء نے لکھا ہے وہ امارات (علمات) ہیں، اور ہندوستان میں غیر مسلم کا تسلط (غلبة) ہونا ظاہر ہے۔ مگر چونکہ دارالحرب کے نام سے پہلے غلط معنی کا شبہ ہوتا ہے اس لئے ”غیر دارالاسلام“ کہنا اچھا ہے۔

پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک دارالامن، دوسرے دارالخوف۔

”دارالخوف“ وہ ہے جہاں مسلمان خائف ہوں، اور ”دارالامن“ وہ ہے جہاں مسلمان خائف نہ ہوں۔ سو ہندوستان دارالامن ہے، کیونکہ باوجود غیر مسلم کے پورے تسلط کے مسلمان خوفناک نہیں سا اور حرب (لڑائی) بھی درست نہیں۔ کیونکہ باہم معاهدہ ہے۔ (حسن العزز مص ۲۷۲ ج ۳)

فرمایا دارالحرب کے معنی ”دارالکفر“ کے ہیں، پھر اس دارالحرب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دارالامن، ایک دارالخوف۔

دارالامن میں بہت سے احکام دارالاسلام کی طرح ہوتے ہیں۔ سو ہندوستان دارالحرب ہے لیکن ہے دارالامن۔ اس لئے زیادہ تر معاملات میں یہاں دارالاسلام ہی کے احکام پر عمل درآمد ہوگا۔ (الافتراضات الیومیہ مص ۱۸۱ ج ۸)

## ہندوستانی غیر مسلم ذمی ہیں یا حربی

سوال:- ہمارے ہندوستان میں جو کفار لوگ ہیں ذمی ہیں یا حربی، مسلمان لوگوں کو امور دینیہ میں ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے؟

الجواب:- لاذمی لعدم دخولهم تحت حمایتہ وال مسلم ولا حربی  
محارب بل حربی مسالم و مستامن واکثر احکامہم کا الذمیین.

ترجمہ:- (ہندوستانی کفار) نہ تو ذمی ہیں کیونکہ کسی مسلمان والی کی ماتحتی میں نہیں، اور نہ ہی حربی ہیں (جیسا کہ ظاہر ہے) بلکہ ایسے حربی ہیں جن سے مصالحت ہے اور امن و امان سے رہنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے اکثر احکام ذمیوں کی طرح ہیں)

مسئلہ:- اہل حرب (یعنی لڑنے مرنے والے حربی غیر مسلم) کے اموال کا احراق یا فساد و قطع اشجار وغیرہ (یعنی ان کے جان و مال کو تباہ و برپا کرنا جانا کاشنا) جب اس میں مصالحت ہو جائز ہے کذافی الہدایہ والروح وغیرہما

## جان و مال کی حفاظت کرنے والی حکومت شکر کی مستحق ہے اس کے خلاف شورش نہیں کرنا چاہئے

جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے طائف تشریف لے گئے کہ شاید وہاں کے باشندے مسلمان ہو جائیں اور وہاں تکلیف سے نجات ملے وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ نہایت گستاخانہ سلوک کیا تو آپ بدول ہو کر پھر مکہ معظمہ واپس تشریف لائے اور مطعم بن عدی کو اطلاع فرمائی کہ اگر مکہ والے مجھے امن دیں تو میں شہر میں رہوں ورنہ کسی دوسری جگہ چلا جاؤں۔ اس وقت مطعم بن عدی نے مکہ والوں سے کہا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی۔ خبردار کوئی ان کو ہاتھ نہ لگائے۔ چنانچہ اس وقت ہجرت مدینہ تک حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مطعم بن عدی کی پناہ کی وجہ سے مکہ میں تشریف فرمائے۔

ان کی اس ہمدردی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ شکریہ ظاہر فرماتے تھے۔ اسی کے صلی اس وقت جب کہ غزوہ بدر میں مسلمانوں کو غلبہ ہوا اور بہت سے کفار مارے گئے اور

بہت سے قید ہو کر آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان کفار کے متعلق گفتگو کرتے تو میں ان کی خاطر چھوڑ دیتا بعض روایتوں میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شکرگزاری کے لئے ایسا فرماتے تھے۔

اس وقت بعینہ یہی حالت ہے ان احکام کے ساتھ کو جس طرح مطعم بن عدی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی تھی اور آپ ان کے منون اور شکرگزار تھے اسی طرح حکام وقت ہمارے محافظ ہیں اور ہمارے امن کے ذمہ دار ہیں ہم کو بھی ان کا شکرگزار رہنا چاہئے جس کا ادنیٰ اثر یہ ہونا چاہئے کہ کوئی ایسی شورش نہ کریں جس سے حکام تشویش میں پڑ جائیں۔

### عملی معاهدہ

فرمایادت سے میرا خیال ہے کہ کفار سے جیسے با قاعدہ زبانی یا تحریری معاهدہ ہو جاتا ہے تو اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہو جاتی ہے اسی طرح بعض اوقات عملی عہد ہو جاتا ہے کہ باہمی طرز معاشرت تعامل سے فریقین ایک دوسرے سے مامون و بے خطر ہوں، باہمی معاملات اور لین دین وغیرہ جاری ہوں، یہ بھی ایک قسم کا عملی عہد ہے اس کی بھی رعایت کرنا ضروری ہے۔

اگر کسی وقت ایسے لوگوں پر حملہ کرنا ہے تو پہلے ان کو نہذ عہد کے طور پر متنبہ کر دیا جائے کہ اب ہم سے مامون نہ رہیں پھر فریقین کو اپنے فعل کا اختیار ہے اور اس نہذ عہد (یعنی متنبہ کے بغیر) ایک قسم کا اندر (ھوکر) ہے جو شریعت اسلامیہ میں کسی حال میں کسی کافر سے جائز نہیں۔

قبطی کا واقعہ سورہ نقص کی آیت میں مذکور ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے قبطی کے قتل ہو جانے کا ذکر ہے..... یہ واقعہ بھی اسی قبیل سے تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھ آپ کے متعلقین اور قبطی کفار دونوں فرعونی سلطنت کے باشندے تھے اور آپس میں ایک دوسرے سے مون (اور مطمئن) تھے۔ اسی حالت میں قبطی کا اچانک قتل ہو جانا عہد عملی کے خلاف تھا۔ اس لئے اس پر عتاب ہوا اور استغفار و مغفرت کی نوبت آئی..... رہایہ سوال کہ جب یہ قتل معصیت تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیسے صادر ہوا؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے قصداً قتل نہیں کیا معمولی ضرب اس کو ہٹانے

کے لئے لگادی تھی۔ اتفاق سے مر گیا۔ اس لئے معصیت کا صدوران سے نہیں ہوا۔ تاہم صورت معصیت کی تھی۔ اس لئے پیغمبر خدا نے اس کو معصیت ہی کے برابر سمجھ کر استغفار کیا۔

پھر فرمایا۔ یہ میرا خیال ہے اگر اس کا ثبوت کتاب و سنت یا علماء اہل حق کے کلام میں مل جائے تو اس کے حوالے سے لکھا جائے۔

حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے اسی روز تحقیق کی، تو بحمد اللہ صحیح بخاری کی ایک حدیث برداشت مغیرہ بن شعبہ میں اس کا ثبوت اور قسطلانی شرح بخاری میں اس کی تصریح نکل آئی۔

### شرعی دلیل

وَفِي الْمَقَامِ تَفْرِيقَانِ يَتَعَلَّقُانِ بِقَصْتَهُ مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِبْيَانُ عَلَىٰ كُونِ  
مَا قَصَ اللَّهُ وَرَسُولُ عَلَيْنَا مِنْ غَيْرِ نِكْرَ حَجَّهُ لَنَا ..... وَالثَّانِي كُونِ  
الْمُعَاهَدَةُ الَّتِي تَحْرُمُ دَمَ الْحَرْبِي عَامًا لِلْقَالِي وَالْحَالِي فَإِنْ مُوسَىٰ عَلَيْهِ  
السَّلَامُ لَمْ يَعَاهِدْهُمْ قَالًا فَلَوْ لَا يَنْعَدِدُ الْعَهْدُ بِالْحَالِ كَانَ دَمَ الْقَبْطِي  
مَبَاحًا فَلَا مَعْنَى لِتَسْمِيهِ قَتْلَهُ عَمَلُ الشَّيْطَانِ وَلَا اسْتَغْفَارَهُ مِنْهُ هَذَا.

خلاصہ ترجمہ: دوسرا مسئلہ: جو اس اصل پر مبنی ہے کہ جس قصہ کو اللہ اور رسول نے بغیر تکبر کے بیان فرمایا ہو وہ ہمارے لئے جوت ہے۔ وہ معاهدہ جس سے حربی کا دم حرام ہوتا ہے۔ یعنی اس کا قتل ناجائز ہوتا ہے۔ وہ عام ہے، قابل وحالی کو کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے قولًا معاهدہ نہیں کیا تھا۔ پس اگر حال کے ذریعہ معاهدہ نہ ہوتا، تو قبطی مباح الدم ہوتا پھر اس قتل کو شیطان کا عمل کہنے اور اس سے استغفار کے کوئی معنی نہیں۔

### کافر حکومت میں رہتے ہوئے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا درست نہیں

اگر کافر حاکم سے معاهدہ ہو جائے تو اس معاهدہ کا پورا کرنا واجب ہے بقولہ تعالیٰ وَاوْفُوا بِالْعَهْدِ۔ (اور وعدوں کو پورا کرو) البتہ اگر شرعی ضرورت اس عہد کے توڑنے کی

ہے تو پہلے اس معاهدہ کے ختم کرنے کی اطلاع کر دے لقولہ تعالیٰ اللہ علیٰ سواء ورنہ غدر (دسوکہ) کا سخت گناہ ہے لقولہ تعالیٰ ان اللہ لا یحب الخائنین۔

### عہد و پیمان کے خلاف کوئی کام کرنا جائز نہیں

جب مسلمان رعایا بن کر ہندوستان میں رہے اور حکام سے (اس بات کا) عہد و پیمان کر چکے کہ کسی حاکم یا رعایا کے جان و مال میں دست اندازی نہ کریں گے اور کوئی امر خلاف اطاعت نہ کریں گے تو مسلمانوں کو عہد و پیمان کے خلاف کرنا یا حکام کی کسی قسم کی مخالفت یا خیانت کرنا ہرگز درست نہیں اور نہ ہی رعایا کے ساتھ عہد کے خلاف اور خیانت کرنا (یعنی ہندو وغیرہ کے ساتھ) درست ہے۔

عہد کے پورا کرنے کی مسلمانوں کے مذہب میں اس قدر تائید ہے کہ شاید کسی دوسرے مذہب میں نہ ہو۔ قال اللہ تعالیٰ وافوا بالعهد ان العهد كان مستولاً۔  
ترجمہ:- ”عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں قیامت کے روز باز پرس ہو گی۔“  
عہد ٹکنی کی سخت ممانعت ہے اور کسی سے عہد کر کے اس کے خلاف کرنے پر بہت دھمکی دی گئی ہے۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

الا من ظلم معاہداً و نتفصه او کلفه فوق طاقتہ او اخذ منه شيئاً بغير

طیب نفس فانا حجیجہ یوم القيامہ

ترجمہ:- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام امت کو فرماتے ہیں کہ جو کسی غیر مذہب سے عہد کر کے اس پر ظلم کرے یا ان کو کوئی عیب لگادے اور اس کی بلا وجہ توہین کرے، یا اس پر زائد مشقت ڈالے، یا اس کے مال میں سے کوئی چیز بغیر اس کی رضامندی کے لئے تو قیامت کے دن اللہ کے رو برو میں اس سے جھگڑا کروں گا (یعنی اس کے مقابلہ میں جھٹ کروں گا)  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے نائبوں کو عام تعلیم یہ ہوتی تھی کہ لا تغدو ایعنی عہد کے خلاف نہ کرو۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ:

ذمة المسلمين واحدة ليسعى بها ادناهم فمن اخفر مسلماً في ذمه فعلية

لعنة والملائكة والناس اجمعين لا يقبل الله يوم القيمة صرفا ولا عدلا.

ترجمہ:- یعنی مسلمانوں کا ذمہ اور عہد ایک ہے اگر ایک مسلمان کسی غیر مذہب والے سے معابدہ کرے گا تو سب مسلمانوں پر اس کا پورا کرنا لازم ہے اگر کسی مسلمان کے عہد کو جو اس نے کسی کے ساتھ کیا تھا کوئی دوسرا مسلمان توڑنا چاہے تو اس پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عہد شکن کی کوئی عبادت فرض یا نفل ہرگز قبول نہ کرے گا۔

**ناحق کسی غیر مسلم کو قتل کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے**

اسی طرح کسی کو بے گناہ اور بلا وجہ قتل کر دینا خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان حرام اور گناہ کبیرہ ہے قال اللہ تعالیٰ ولا تقتلوا النفس التي حرم اللہ الا بالحق:  
یعنی جس جان کے قتل کو خدا تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو ناحق نہ مارڈا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے من قتل معاہدا بغیر حق لم ير ح رائحة الجنہ یعنی جس نے کسی کے ساتھ عہد کر کے اس کو قتل کیا وہ جنت کی بوہی نہ سو نگھے گا علی ہذا فقه کی تمام کتابیں ان مسئللوں اور روایات سے بھری ہوئی ہیں۔

پس مسلمانوں کو اپنے عہد کے موافق حکام کی تابع داری جس میں کچھ معصیت نہ ہو ضروری ہے اور کسی قسم کی بغاوت اور مخالفت اور مقابلہ اور خیانت جائز نہیں۔

**غیر ملکی قوموں کی مدد کرنا جائز نہیں**

**جب کہ وہ ہمارے ملک پر حملہ آور ہوں**

اگر کوئی مسلمان یا غیر مسلمان ہمارے حکام کے مقبوضہ ممالک سے خارج ہیں (یعنی غیر ملکی) ان ہمارے حکام کے ساتھ مقابلہ اور لڑائی کرنے اور ان پر حملہ کر کے آئیں تو ہم کو اس قوم کے ساتھ ہونا اور ان کو مدد دینا بھی ہرگز درست نہیں۔ کیونکہ یہ بھی عہد کے خلاف ہے۔

قال اللہ تعالیٰ وَإِنْ اسْتَصْرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ الْنَّصْرُ إِلَّا عَلَى

**قوم بینکم و بینهم میثاق**

” یعنی اگر اہل اسلام مدد چاہیں تم سے دین کے مقابلہ میں۔ پس تمہارے اوپر مدد کرنا

ضروری ہے مگر اس قوم کے معاملہ میں تمہارے اور ان کے درمیان عہد ہو چکا ہے۔“  
مطلوب یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کا ان لوگوں سے مقابلہ ہو جن سے تم عہد و پیمان  
کر چکے ہو تو مسلمانوں کا ساتھ ملت دو پس مسلمانوں کو ہر حال میں اپنے عہد کی رعایت  
کرنی چاہئے۔ نہ خود مخالفت کریں نہ کسی مخالف کی اعانت کریں۔ اگر اس کے خلاف کریں  
گے تو سخت گنہگار اور مستحق عذاب ہوں گے۔ (بیاض اشرفتی فصل)

### غیر مسلم حکومت میں رعایا بن کر رہنے کا حکم

حضرت مولانا گنگوہی قدس سر ہے اپنے ایک فتویٰ میں فرمایا ہے جو ذیل میں منقول ہے۔  
سوال:- یہ ملک ہندوستان جو سو برس سے زائد مسیحی حکام کے مملوکہ و مقبوضہ ہے اور  
ان کی رعایا میں ہندو وغیرہ مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں اور ہم لوگ مسلمان بھی زیر  
حکومت آباد ہیں۔ تو مسلمانوں کو اس ملک میں حکام کی رعایا بن کر رہنا چاہئے یا نہیں۔ اور  
ہم مسلمانوں کو اپنے ان حکام کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے۔ اور نیز ہندوؤں وغیرہ رعایا  
کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے۔

الجواب:- چونکہ قدیم سے مذہب، اور جملہ مسیحی لوگوں کا قانون یہ ہے کہ کسی کی ملت  
اور مذہب سے پر خاش اور مخالفت نہیں کرتے اور نہ کسی مذہبی آزادی میں دست اندازی  
کرتے ہیں۔ اور اپنی رعایا کو ہر طرح سے امن و حفاظت میں رکھتے ہیں۔

اہنذا مسلمانوں کو یہاں ہندوستان میں جو کہ اہل مسیحی کا مملوکہ و مقبوضہ ہے رہنا اور ان کی  
رعایت بننا درست ہے۔ چنانچہ جب مشرکین مکنے مسلمانوں کو تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں تو  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ملک جہشہ میں جو نصاریٰ کا مقبوضہ تھا بھیج دیا۔ اور یہ  
صرف اس وجہ سے ہوا کہ وہ کسی کے مذہب میں دست اندازی نہیں کرتے تھے۔

### غیر مسلم حکومت میں رہنے اور ہجرت کرنے کا شرعی حکم

سوال:- زید کہتا ہے کہ کسی مسلمان کا کفار کی حکومت میں رہنا جائز نہیں۔ اس کے الفاظ  
یہ ہیں کہ کسی مسلمان قوم کا کسی کافر کے تحت میں رہ کر زندگی بسر کرنا دو حال سے خالی نہیں۔

اول یہ کہ وہ ان کے سیاسی و سرکاری مکملوں میں عہدے قبول کریں گے یا نہیں دوسری شکل میں ان کی سیاسی طاقت رفتہ بالکل ختم ہو جائے گی۔ اور وہ دنیا کے واسطے عضو معطل سے زیادہ بے کارثابت ہوں گے۔

اور اگر پہلی صورت ہے یعنی سرکاری عہدے قبول کریں تو من لم یحکم بما انزل اللہ فالشک هم الکافرون کے مصدقہ ہوں گے۔ کیا زید کا یہ خیال صحیح ہے۔ اگر صحیح ہے تو اس کی رو سے مسلمانان ہند پر ہجرت واجب ہے یا نہیں۔

اجواب:- زید کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ جواہل اسلام کفار کی حکومت میں رہتے ہیں وہ دو مصیبتوں میں سے ایک مصیبت میں باتلا ہیں۔ اگر سیاسی مکملوں میں مراتب حاصل کریں (اور عہدے قبول کریں) تو من لم یحکم کی وعید میں داخل ہوں گے ورنہ دنیا کے واسطے عضو معطل سے بڑھ کر بے کارثابت ہوں گے لہذا ان پر ہجرت فرض ہے۔

ہمارے نزدیک زید کا یہ خیال غلط ہے۔ اول شق میں یہ تسلیم نہیں کہ سرکاری تمام ملازمتوں میں حکم خلاف ما انزل اللہ ضروری ہو۔ بلکہ بہت سے ایسے مجھے ہیں کہ جن میں حکم ہی نہیں (یا شریعت کے مطابق اور جائز حکم ہو)۔ نیز دوسری شق بھی غیر مسلم اور غلط خیال ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مراتب (یعنی عہدے) حاصل نہ کرنے کی صورت میں عضو معطل اور بے کار ہونے سے اگر دنیاوی اعتبار سے مراد ہے ظاہر ہے کہ غلط ہے۔ کیونکہ تجارت، زراعت، حرفت اور دنیاوی کار و بار کر سکتے ہیں اور اگر دنیوی اعتبار سے مراد ہے تو غلط ہونا بہت ہی زیادہ روشن ہے۔ جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

اس کے علاوہ ہجرت کر کے جس جگہ جائیں گے وہاں بھی اپنی دلوں مصیبتوں کا سامنا ہو گا کیونکہ اس وقت کوئی سلطنت علی منہاج المنوہ نہیں۔ تو وہاں سے بھی ہجرت فرض ہو گی۔ تو سوا اس کے دنیا سے ہجرت فرمائیں کوئی چارہ نہ ہو گا خلاصہ یہ کہ زید کا یہ خیال غلط اور بے اصل ہے۔ جب حکومت کی طرف سے شائع متعلقہ کے (یعنی مذہب پر) ادا کرنے کی اس طرح سے آزادی ہے اور کچھ روکنوگ نہیں۔ تو ہجرت واجب نہیں۔ خواہ سیاسی مکملوں میں جائز عہدہ حاصل کریں یا نہ کریں۔ مسلمانوں کی دینی اور دنیوی عزت سیاسی عہدوں کے اصول کیستھے وابستہ

نہیں بلکہ ان کی عزت شریعت کی پوری اتباع اور باہمی اتحاد و اتفاق کیسا تھا متعلق و مر بو ط ہے۔

حررہ خلیل احمد عفی عنہ

الجواب صحیح عبد الوہید عفی عنہ

الجواب صحیح محمد عجی عفی عنہ۔ الجواب صحیح عبدالطیف

اللطیف عفی عنہ۔ (بیاض اشرفی ص ۲۶)

## کافر حکومت کی ماتحتی میں رہنے کی ممانعت پر ایک استدلال اور اس کا جواب

ایک صاحب نے اس مضمون کو کہ کافر کی حکومت مسلمانوں پر جائز نہیں آیت ولا  
تنکحو المشرکین حتی یومنوا سے استنباط کیا ہے کہ جب ایک مسلمان عورت کا کافر  
کی ماتحتی میں رہنا جائز نہیں تو بہت سے مسلمانوں کا کسی کافر کی ماتحتی میں رہنا کیسے جائز  
ہو گا۔ لیکن اس مضمون کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ دوسری دلیلوں سے ثابت ہے۔

اور اگر اسی دلالت کی بناء پر یہ کہا جائے کہ دوسری آیت میں ولا تنکحو المشرکات  
حتی یومن ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک عورتوں کا مسلمان کے تحت میں رہنا جائز  
نہیں۔ توجہ ایک مشرک کا مسلمان کے تحت میں رہنا جائز نہیں تو بہت سے مشرکین کا مسلمانوں  
کی رعایا بن کر رہنا بھی جائز نہ ہو گا تو اس کا کیا جواب دیں گے؟ یہ حال ہے ان استنباطوں کا۔

بعض لوگوں نے قرآن شریف کی آیتوں سے نئی سیاست کو مرتبط کرنا شروع کر دیا  
ہے یہ ایک قسم کی تحریف ہے۔ (الفصل للوصل ص ۱۸۳ مطبوعہ تھانہ بھوون)

## دارالکفر سے ہجرت کرنے کا شرعی حکم

سوال۔ مخدومنا ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ماتحت بڑے بڑے اکابر اور  
بزرگان دین گزرے ہیں اور اب بھی ہیں جو چشمہ فیض اور قابل اقتدار ہیں لیکن ایک طرف شیخ  
اکبر بھی بڑے بزرگ ہیں جو فتوحات مکیہ ص ۳۶۰ ج ۳ باب الوصایا میں وصیہ فرماتے ہیں کہ۔

وعلیک بالہجرة ولا تقم بین اظہر الکفار فان فی ذالک اهانہ دین

الاسلام ..... واياك والدخول تحت ذمه كافر ما استطعت واعلم ان المقيم بين اظهير الكفار مع تمكنه من الخروج من بين ظهر انهم لاحظ له في الاسلام فان النبي صلی اللہ علیہ قد تبرأ منه وقال انابری من مسلم یقیم بين اظهير المشرکین فما اعتبر له کلمه الا سلام:

ترجمہ:- (تم پر بھرت کر جانا لازم ہے اور کفار کے درمیان نہ رہو کیونکہ اس میں دین اسلام کی اہانت ہے اور کسی کافر کی ماتحتی میں رہنے سے اپنے کو بچاؤ۔ اور یقین کرلو کہ کفار کے درمیان رہنے والا شخص جو کہ باوجود یہ کہ بھرت کرنے پر قادر ہو ایسے شخص کے لئے اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے برائت ظاہر فرمائی ہے اور فرمایا آپ نے کہ میں ایسے مسلمان سے بیزار ہوں جو مشرکین کے درمیان رہے۔ ایسے شخص کے کلمہ اسلام کا اعتبار نہیں کیا گیا)۔

اس وصیت نامہ میں لاحظ لہ فی الاسلام اور حدیث شریف انابری من مسلم اور لفظ فما اعتبر له کلمته الاسلام وغیرہ کو دیکھ کر دل میں سخت خلجان ہے براہ مہربانی مطابقت کی تحریر فرما کر مشکور ہوں۔ (البدائع بدیعہ ۷ ص ۱۸)

الجواب:- کسی غیر مجتهد کا قول دوسرے پر جھٹ نہیں ہو سکتا اور نصوص اس دعویٰ میں بعض قطعی الثبوت نہیں اور بعض قطعی الدلالہ نہیں اس لئے دوسروں کا (یعنی بھرت نہ کرنے والے بزرگان دین کا) قول یا فعل نص کے بھی خلاف نہیں۔

اور اگر اس حکم میں اطلاق ہوتا تو حضرات صحابہ کو جسہ بھرت کر جانے کی اجازت نہ دی جاتی جہاں کے حاکم کا نہ ہب عیسائی تھا۔

دوسرے جواب:- یہ کہ اس وقت اسلام کے لئے مثل اقرار کے (یعنی کلمہ طیبہ کی طرح اقرار کرنے کی) قدرت و تملک کی شرط کے ساتھ بھرت بھی فرض، اور اسلام کی قبولیت اور اسلامی احکام کے جاری ہونے کا مدار تھی جیسا کہ اب یہی حالت اقرار (شہادتیں) کی ہے۔ چنانچہ روح المعانی میں تیسیر سے اس کی فرضیت کی تصریح کی ہے۔ پس جو منافقین مدینہ میں رہتے تھے جو کہ دار الاسلام تھا۔ وہ ظاہر اس فرض کے عامل تھے اسی لئے ان سے تعرض نہ

ہوتا تھا۔ بخلاف..... ہجرت نہ کرنے والوں کے کہ ان کا حکم عام کفار کا ساتھا۔

روح المعانی میں ہجرت کی فرضیت کا منسوخ ہونا نقل کیا ہے البتہ منتخب اب بھی ہے۔

(بیان القرآن ص ۱۳۲، نساء ص ۳۲، ۱۵۰)

## ہجرت کرنے کا حکم

ایک جامع مختصر تقریر لکھی جاتی ہے۔ جس کا مأخذ روایات و قواعد اور اقوال علماء و اشارات نصوص ہیں ان دلائل کے مجموعہ سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ۔

”ابتدائے اسلام میں ہجرت فرض تھی اور فرضیت کے ساتھ وہ ظاہر الازی شعار اور ثبوت اسلام کے لئے موقوف علیہ بھی تھی لیکن حالت عذر میں اس کی فرضیت اور شعارات ساقط ہو جاتی تھی، جیسا کہ تلفظ بالشہادتین (یعنی کلمہ طیبہ) کی اب بھی یہی شان ہے۔ اور عہد نبوی میں صحابہ کے اقوال سے نماز کی یہی شان معلوم ہوتی ہے اور اس شعار ہونے کی وجہ سے اس سے بلاعذر رجوع کرنا ارادت کی علامت تھا۔

والمسروعیہ انما یکون اذا کان فی الارض محل بھا جرا الیہ۔

(یعنی ہجرت کی مشروعیت اس وقت ہے جب کہ زمین میں ایسی جگہ پائی جاتی ہو کہ جہاں ہجرت کرنا ممکن ہو)“

فائدہ:- روح المعانی میں ہجرت کی فرضیت کا منسوخ ہونا نقل کیا ہے البتہ منتخب اب بھی ہے اور مسلم شریف کی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اعرابی کو جس نے ہجرت کی اجازت چاہی تھی یہ فرمانے سے ان شان الهجرة لشديد (کہ بیشک ہجرت کا معاملہ بذرا سخت ہوتا ہے) وطن میں رہنے کے لئے ارشاد فرمانے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس کے ہجرت کے ارادہ کرنے سے ظاہر ایہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دارالاسلام میں نہ تھا۔

(بیان القرآن سورہ نساء آیہ ۵۰ و من یہا جرنی سبیل اللہ اخی ص ۵۰)

## مشرع ہجرت

۱:- عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہجرت منہدم کر دیتی ہے (یعنی ختم کر دیتی ہے) ان گناہوں کو جو اس سے پہلے ہو چکے ہوں۔ روایت کیا اس کو مسلم نے۔

۲:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ایسی حالت ہو گی کہ مسلمانوں کا سب سے بہتر مال بکریاں ہوں گی۔ جن کے پیچھے پیچھے پھرتا پھاڑوں کی چوٹیوں پر، اور بارش کے موقعوں پر اپنے دین کو لئے ہوئے فتنوں سے بھاگا پھرتا ہو۔ روایت کیا اس کو بخاری نے۔

فائدہ:- اگر کسی شہر میں یا کسی محلہ میں یا کسی مجمع میں دین کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو وہاں سے بشرط قدرت علیحدگی واجب ہے۔ البتہ اگر یہ شخص عالم، مقتدا ہے اور لوگوں کو اس سے دینی حاجات واقع ہوتی ہوں تو ان میں رہ کر صبر کرے۔ اور اگر کوئی اس کو پوچھتا ہی نہ ہو، نہ ان کی اصلاح کی امید ہو تو بھی بہتر ہے کہ ان سے علیحدہ ہو جائے۔ (فروع الایمان ۶۲)

### مذہبی امور میں حکومت کو خل دینے کا حق نہیں

فرمایا کہ وقف بھی چونکہ ایک مذہبی رکن ہے اس لئے گورنمنٹ کی مداخلت اس میں جائز نہیں، جیسا کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ میں مداخلت جائز نہیں اسی طرح نکاح و طلاق میں بھی یہی حکم ہے۔ اگر شبہ ہو کہ شوہر تین طلاق دے کر پھر رکھنا چاہتا ہے تو مطلقہ کا استخلاص (یعنی چھنکارا) کفار کی عدالت سے تو شرعاً جائز ہے (تو یہ مداخلت کیسے گوارا کر لی گئی؟) تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ گورنمنٹ سے طلاق واقع ہونے میں امداد نہیں ملتی بلکہ طلاق کا جواہر ہوتا ہے اس میں امداد چاہتی ہے۔ یعنی طلاق کے بعد جو اس کو آزادی ہوئی چاہئے اس میں امداد چاہتی ہے۔ اور اسی طرح اپنے کو نقصان سے بچانا چاہتی ہے۔

پھر اگر شبہ ہو کہ وقف میں بھی متولی بڑی گڑ بڑی کرتے ہیں اور وقف کے مال کو کھا ڈالتے ہیں اور محتاج و مسکین محرم رہ جاتے ہیں اس طرح مساکین کا نقصان ہوتا ہے (تو یہاں وقف کے معاملہ میں نقصان سے بچنے کے لئے حکومت کا دخیل بننا صحیح ہونا چاہئے) لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ یہ صورت عدم انتفع (یعنی نفع نہ ہونے) کی نہ ضرر کی۔ اس لئے وقف کو مطلقہ کے خلاصی حاصل کرنے پر قیاس نہیں کر سکتے۔ کیونکہ متولیوں کی گڑ بڑی سے مسکینوں کا ضرر نہیں، ہاں عدم انتفع ضرور ہے (دونوں میں بڑا فرق ہے) مثلاً کسی کی جیب سے سور و پیہ کا نوٹ نکال کر لے لے یہ تو اس کا ضرر (نقصان)

ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس کو سور و پیہ کا نوٹ دینے والا تھا مگر دیا نہیں، یا کسی نے دینے نہیں دیا۔ تو یہ جس کو دینے والا تھا اس کا ضرر (نقسان) نہیں ہوا، بلکہ عدم انجع (یعنی نفع نہ ہونے کی) صورت ہوئی۔ پس ضرر اور ہے اور عدم انجع اور ہے۔

## مذہبی امور میں حکام کا جبراً دست اندازی کرنا اور محکوم مسلمانوں کا اس پر راضی ہو جانا

سوال: گورنمنٹ اپنی ملکہ اراضی میں رفاه عام کے لئے ایک شفاخانہ بنانا چاہتی ہے اس اراضی میں بعض منہدم مساجد بھی ہیں۔ گورنمنٹ ان کو اپنے خرچ سے بنانے کا وعدہ کرتی ہے۔ مگر عام لوگوں کو وہاں اجازت دینا مشکل ہے۔ البتہ شفاخانہ کے مراپتوں اور ملازموں کو ہر وقت اجازت ہے اور ایک مسجد کو بنانے سے کسی وجہ سے عذر کرتی ہے مگر اس کے تحفظ کے لئے احاطہ اس کا بھی بنادینے کو ہتھی ہے سوال یہ ہے کہ اس صورت کو اگر مسلمان منظور کر لیں تو یہ جائز ہے یا نہیں.....؟

الجواب: احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں۔ ایک اصلی، دوسرے عارضی۔ یعنی احکام کبھی شئی کی ذات پر نظر کر کے مرتب ہوتے ہیں اور کبھی عوارض پر نظر کر کے۔ اور ان دونوں قسم کے احکام باہم مختلف بھی ہو جاتے ہیں۔

صورت مسئلہ میں حکم اصلی یہی تھا کہ مسجد ہر طرح آزاد ہے ان میں کسی وقت کسی کونہ نماز پڑھنے کی ممانعت کی جائے نہ آنے جانے سے لا لمصلحہ المساجد اور یہ حکم اس وقت ہے جب مسلمان بغیر کسی شورش (یعنی مسلمانوں کے خطرہ اور ضرر لائق ہوئے بغیر) اس پر قادر ہوں۔ اور حکم عارضی یہ ہے کہ جس صورت پر صلح کی جاتی ہے اس پر رضامند ہو جائیں اور یہ حکم اس حالت میں ہے جب مسلمان حکم اصلی پر قادر نہ ہوں۔

اس کی نظر مسجد الحرام ہے جب تک اس پر مشرکین مسلط رہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وہاں نماز بھی پڑھتے رہے، بیت اللہ کا طواف بھی فرماتے رہے۔ اسی درمیان میں وہ زمانہ بھی آیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے عمرہ کے لئے مکہ تشریف لائے۔ اور مشرکین نے

نبیس آنے دیا پھر اس پر صلح ہوئی کہ تمین روز کے لئے تشریف لائیں اور عمرہ کر کے چلے جائیں آپ نے اس صلح کو قبول فرمایا اور وقت محدود تک قیام فرمائ کرو اپس تشریف لے گئے۔

یہ سب وقت ہوا جب سلطان (یعنی آپ کا غالبہ و اقتدار) نہ تھا۔ عذر کی حالت میں آپ نے اس حکم عارضی پر عمل فرمایا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو باقاعدہ سلطان فرمایا اس وقت اصلی حکم پر عمل فرمایا۔ یہ تفصیل ہے اس صلح کے منظور کر لینے میں۔ (امداد الفتاویٰ ص ۶۹۲ ج ۲، سوال نمبر ۹۷ بودا رانواد ص ۱۷۷ ج ۲، امداد الفتاویٰ ص ۲۳۶ ج ۲ ملفوظات اشرفی ص ۳۹۹)

## اگر حکام کی طرف سے ناگوار بات پیش آئے یا وہ ظلم زیادتی کریں

اگر حکام کی جانب سے کوئی امر طبیعت کے خلاف پیش آئے تو صبر کرے شکایت اور بددعا نہ کرے البتہ اس کی نرم مزاجی کے لئے دعا کرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اہتمام کرے تاکہ اللہ تعالیٰ حاکموں کے دل کو نرم کر دے ایک حدیث میں یہ مضمون آیا ہے۔ (حقوق الاسلام ص ۱۰)

حضرت ابو دردار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بادشاہوں کا مالک ہوں، بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں اور جب بندے میری اطاعت کرتے ہیں میں ان بادشاہوں کے دلوں کو ان پر حرم اور شفقت کے ساتھ پھیر دیتا ہوں اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں، میں ان بادشاہوں کے دلوں کو غضب اور عقوبت کے ساتھ پھیر دیتا ہوں۔ پھر وہ ان کو سخت عذاب کی تکلیف دیتے ہیں۔ (حیۃ اُسلمین ص ۲۰۳)

(اس سے معلوم ہوا کہ) اگر حکام ظلم کرنے لگیں تو ان کو برامت کہو سمجھ جاؤ کہ ہم سے حقیقی حاکم (یعنی اللہ تعالیٰ) کی نافرمانی ہوئی ہے یہ اس کی سزا ہے۔ اپنی حالت درست کرلو۔ اللہ تعالیٰ حاکموں کے قلوب کو نرم کر دیں گے۔ (تعلیم الدین ص ۲۱)

اگر حکام ہی کی طرف سے کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کر دو۔ اگر پھر بھی حسب مرضی انتظام نہ ہو تو صبر کرو اور عمل سے یا زبان سے یا قلم

سے مقابلہ مرت کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو کہ تمہاری مصیبت دور ہو۔ اور اگر کہیں ظالم لوگ چھوڑ دینے پر نہ مانیں اور جان ہی لینے پر آمادہ ہوں تو مسلمانوں کو مقابلہ پر مضبوط ہو جانا ہر حال میں فرض ہے۔

وَهَذَا مِنْ بَابِ الْقَتْالِ حِيثُ تَفْرُضُ عِنْنَا أَذَاهِجْمُ الْعَدُوِّ لَا مِنْ بَابِ الْأَكْرَاهِ  
(جِئَةُ الْمُسْلِمِينَ ص ۱۷۹)

منظالم کے وقت بھی حکومت سے مقابلہ کرنا ہمارا کام نہیں  
حکومت سے مقابلہ کرنا تو حکومتوں کا کام ہے رعایا کو حکومت  
سے مقابلہ کرنے میں نقصان ہے

بعض لوگ علانية طور پر خردہ گیری اور اس کے خلاف خفیہ تدبیریں اور سازش کرتے ہیں اس خردہ گیری کے جو نتائج ہیں ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو ہر طرح حکومت کے دائرہ میں مقید ہو کسی طرح ان نتائج کا متحمل نہیں ہو سکتا تو پھر اس پر اقدام کرنا حدیث ذیل کی صریح مخالفت کرتا ہے۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَنْبُغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يَذْلِلْ نَفْسَهُ  
قَيْلٌ يَا رَسُولُ اللَّهِ وَكَيْفَ يَذْلِلُ عَلَى نَفْسِهِ قَالَ يَتَحَمَّلُ مِنَ الْبَلَاءِ مَا لَا  
يَطِيقُهُ (رواہ الترمذی)

ترجمہ:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کو زیبائیں کہ اپنے کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ اپنے کو کس طرح ذلیل کرے گا۔ فرمایا ایسی بلا کو اپنے اور پرلا دے جس کے برداشت کی اس کو طاقت نہ ہو۔

اور ایسی حالت میں سازش کرنا کہ حکومت کے ساتھ معابدہ بھی قائم ہے سراسر غدر (دھوکہ) اور بد عہدی ہے جس کا حرام ہونا شریعت محمد یہ میں صریح ہے۔

اسلامی تعلیم تو یہاں تک ہے کہ اگر حکومت کی جانب سے کوئی تکلیف بھی پہنچے تو بھی حکام کے لئے بد دعا میں مشغول ہونے تک کی اجازت نہیں۔ چنانچہ مشکلہ شریف کی "کتاب الامراۃ" کی یہ آخری حدیث ہے۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں تمام بادشاہوں کا مالک ہوں۔ اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں بادشاہوں کے دل میرے قبضہ میں ہیں اور بیشک بندے جب میری اطاعت کرتے ہیں میں ان کے بادشاہوں کے دلوں کو مہربانی اور شفقت کے ساتھ ان پر پھیر دیتا ہوں۔ اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں میں ان کے دلوں کو ناخوشی اور انتقال کے ساتھ پھیر دیتا ہوں پس وہ ان کو سخت تکلیف پہنچاتے ہیں سو تم اپنے کو بادشاہوں کے لئے بددعا کرنے میں مت لگاؤ۔ البتہ اپنے کو ذکر اور نیاز مندی میں لگاؤتا کہ میں تمہارے لئے کافی ہو جاؤ۔

روایت کیا اس کو ابو نعیم نے کتاب ”الخلیل“ میں۔ (مشکوٰۃ کتاب الامارة)

پس اسلامی تعلیم کا خلاصہ ایسے حالات کے متعلق یہ ہوا کہ ان کلفتوں اور مصیبتوں کا سبب اپنے اعمال بد کو سمجھ کر دعا و استغفار اور ذکر اللہ اور اصلاح اعمال اور اللہ کی اطاعت میں مشغول ہوں اور کوئی امر قوم یا ملک یا ملوك (حکام) کے ساتھ خلاف شرع نہ کریں۔

**عزت و عصمت کی حفاظت کے لئے اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا**

سوال:- ایک عورت ریل گاڑی میں سفر کر رہی تھی، شام کا وقت تھا یہ تہا تھی، گاڑی میں ایک لمباڑ نگارہ چڑھا یا اور اس کو دھمکانا شروع کیا خدا تعالیٰ نے ان کو بھی ہمت دی۔ انہوں نے اس کو ڈانٹا اور زنجیر کھینچ لی، گاڑی ٹھہر گئی اور وہ شخص کو دکر بھاگ گیا اس عورت نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر گاڑی نہ ٹھہری تو میں گاڑی سے کو دجاوں گی۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو کیا یہ خود کشی ہوتی؟

الجواب:- عفیف (پاک دامن) عورتوں کو ایسے وقت میں حیا و عفت کا اکثر اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وقوع ہلاکت کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ اس طرح کو دکر بچ بھی گئے ہیں۔ البتہ چوٹ ضرور لگی ہے۔ سوا ایسے غلبہ کے وقت حق تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ معدود ہوں گی۔ اس لئے اس کو خود کشی نہ کہا جائے گا۔

وَقَرِيباً فِي هَذَا اجَابُ اسْتَاذِي مُولَانَا مُحَمَّدُ يَعْقُوبُ حِينَ سُئِلَ عَنِ النِّسْوَةِ الَّتِي اتَّقِينَ انفُسَهُنَّ فِي الْبَيْرِ حِينَ خَفَنَ عَلَى عَفْتِهِنَّ فِي الزَّمَانِ الْمَعْرُوفِ بِالْغَدْرِ. لَكِنْ إِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَّ الْمُشْرُوطُ.

## قربانی اور گوشت خوری پر پابندی اور مسلمانوں کے لئے شرعی ہدایت

بعض ظالم لوگ قربانی پر خاص کر گائے کی قربانی پر مسلمانوں سے لڑائی کرتے ہیں اور کبھی عین قربانی کے وقت مسلمانوں پر چڑھاتے ہیں اور قربانی جو کہ ان کا حق جائز بلکہ واجب ہے اس کے چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں جو اسرار ان کی زیادتی ہے۔ اور چونکہ حدیثوں میں خاص گائے کا حلال ہونا اور اس کی قربانی کی فضیلت اور خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا گائے کی قربانی فرمانا نہ کورہ ہے۔

اس لئے مسلمان اس مذہبی دست درازی کو گوارہ نہیں کرتے۔ اور اپنی جان تک دے دیتے ہیں جس میں وہ بالکل بے قصور ہیں۔ سواس کے متعلق مسئلہ سمجھ لینا چاہے کہ جس طرح ایسی مضبوطی کرنا (ہمت دکھانا) جائز ہے۔ اگر کہیں ایسی مضبوطی کرنا (جو ان مردی دکھانا) خلاف مصلحت ہو تو بھی شریعت سے دوسری بات بھی جائز ہے وہ یہ کہ اس وقت صبر کریں اور قربانی نہ کریں فوراً حکام کو اطلاع کر کے ان سے مدد لیں۔ اگر قربانی کی مدت میں یعنی بارہ تاریخ تک اس کا کافی انتظام کر دیا جائے تو قربانی کر لیں۔ اور اگر اس کے بعد انتظام ہو تو اگلے سال قربانی کریں اور اس سال قربانی کے حصہ کی قیمت محتاجوں کو دے دیں۔ (مسلم شریف)

اور اگر پہلے سے معلوم ہو جائے کہ جھگڑا ہو گا تو اس وقت وہ طریقہ اختیار کریں جو (پہلے) لکھا گیا جس کا مضمون یہ ہے کہ:

”اگر کسی مخالف کی طرف سے کوئی شورش (ہنگامہ، فتنہ) ظاہر ہو تو حکام کے ذریعہ سے اس کی مدافعت کرو۔ خواہ وہ خود انتظام کر دیں خواہ تم کو انتظام کی اجازت دے دیں۔“

اور اگر حکام ہی کی طرف سے ناگوار واقعہ پیش آئے تو تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کر دو۔ اگر پھر بھی حسب مرضی انتظام نہ ہو تو صبر کرو۔ اور عمل سے یا زبان سے یا قلم سے مقابلہ مت کرو۔ (کیونکہ حکومت سے مقابلہ کرنا حکومتوں کا کام ہے نہ کہ رعایا کا) اور اللہ سے دعا کرو کہ تمہاری مصیبت دور ہو۔

اور اگر کہیں ظالم لوگ چھوڑ دینے پر نہ مانیں اور جان ہی لینے پر آمادہ ہوں تو مسلمانوں کو مقابلہ پر مضبوط ہو جانا ہر حال میں فرض ہے، گوکمزور ہی ہوں خلاصہ یہ کہ حتیٰ الامکان فتنہ و فساد کو امن کے ساتھ دفع کریں۔ اور جو کوئی اس پر بھی سر ہو جائے (یعنی بازنہ آئے) تو پھر مرتا، کیا نہ کرتا۔

## ہندوؤں کو خوش کرنے یا اتفاق کی وجہ سے گائے کی قربانی ترک کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندوؤں کو خوش کرنے اور اتفاق پیدا کرنے کے خیال سے گائے کی قربانی یا روزمرہ کے لئے گائے کا ذبح بند کر دینا کیسا ہے؟ ہندوستان کی حالہ ملاحظہ فرماتے ہوئے شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

الجواب:۔ محض ہندوؤں سے اتفاق پیدا کرنے اور ان کو خوش کرنے کے لئے گائے کی قربانی کو موقوف کر دینا اور ہمیشہ کے لئے گائے کی قربانی کا گوشت چھوڑ دینا درست نہیں۔ اس لئے کہ گائے کا ذبح کرنا شعائر اسلام سے ہے۔ اور گائے کا ذبح نہ کرنا اور اس کے گوشت سے مذہبی حیثیت سے نفرت کرنا شعائر کفر سے ہے۔ اسلامی شعائر کو چھوڑ کر کفر کے شعائر کو اختیار کرنا، اور اس خیال سے خود ذبح کو چھوڑ دینا اور کسی کو ترغیب نہ دینا بلکہ ترک کی رغبت دلانا کہ مخالفین اسلام خوش رہیں، یہ مداراۃ ناجائز اور مداہنہ فی الدین ہے۔ ہماری شریعت مطہرہ نے ہر گز اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

یحلفوں باللہ لکم لی رضوکم میں تصریح ہے کہ اللہ و رسول کو..... ناراض کر کے جب مسلمانوں کو راضی کرنا بھی موجب عقاب و عتاب ہے۔ تو اللہ و رسول کو ناراض کر کے کافروں کو راضی کرنا تو کس طرح موجب عتاب نہ ہوگا اور اس امر کو معمولی نہ سمجھیں۔

## دوسرے مذہب کی رعایت میں

### گوشت خوری ترک کرنا شریعت کی روشنی میں

فرمایا گوشت خوری وغیرہ میں بعض مسلمان کچھ کام کرنے لگتے ہیں کہ یہ واجب یا

شعائر اسلام میں سے تو ہے نہیں (پھر اس پر اتنا اصرار کیوں؟) مگر اس رائے کا مذموم ہونا اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اونٹ کا گوشت ترک کرنا چاہا تھا تو اس پر آیت نازل ہوئی:

يَا يَهُوَ الَّذِينَ امْنَوْا اَدْخُلُوا فِي الْسَّلَمِ كَافِةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَنِ.  
تَرْجِمَة:- اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو۔

تشریح:- حضرت عبد اللہ بن سلام وغیرہ جو پہلے علماء یہود تھے اور اس مذہب میں اونٹ کا گوشت حرام تھا۔ ان صاحبوں کو اسلام کے بعد یہ خیال ہوا کہ شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا۔ اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں سو اگر ہم بدستور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعماق اور کھنے کے صرف عملًا ترک کر دیں تو شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہو اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خیال کی اصلاح اہتمام سے فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جائے اور ایسے امر کو دین سمجھنا یہ ایک شیطانی (مکراور) لغزش ہے۔ (بیان القرآن ص ۷۱۱)

اور اس مکر شدید کی جڑ تھی ملت منسونہ کی رعایت، پس مکر کا حاصل یہ ہوا کہ جب وہ ملت اسلامیہ کے معارض ہے اور اس گوشت کو اسلام نے قبیح نہیں قرار دیا پھر ایسا کیوں کیا جاتا ہے (کہ دوسرے مذہب کی رعایت و اتباع میں گوشت چھوڑ دیا جائے) اسی کو اتباع شیطانی فرمایا۔ پھر بھی اگر کسی کی رائے ہو کہ گاؤں کشی چھوڑ دیں تو چونکہ اس رائے کی بنیاد ملت کفریہ کی رعایت ہے یہ اس سے بھی اشہد سنگین) ہو گا۔

ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ یہ تو گویا جائز کو واجب قرار دے دیا۔ میں نے کہا کہ خصوصیت کے اعتبار سے گوئی نفہ یہ واجب نہیں لیکن ملت کفریہ کی رعایت کے مقابلہ میں بیشک اہل اسلام کا شعار ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ گائے کا گوشت کھانے سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانے سے شدید تعلق معلوم ہوتا ہے۔

من صلیٰ صلوا تناو استقبل قبلتنا واکل نبیحتنا۔ (حسن العزیز ص ۳۹۲ ج ۲)

### مزید تحقیق و تفصیل

بعض مسلمان ہندوؤں کے میل جوں کی وجہ سے گائے کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا پسند نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اسلام کچھ گوشت خوری پر موقوف نہیں۔ اسلام میں گوشت کھانا اور نہ کھانا دونوں یکساں ہیں گائے کا گوشت نہ کھا کر بکری کا کھالیا تو اس میں کیا حرج ہے۔ گائے کا گوشت کھانا فرض تھوڑی ہے۔

افسوس ان لوگوں نے شریعت خداوندی کے مقابلہ میں اپنی ایک شریعت گھری ہے ان لوگوں نے یہ مسئلہ ہندوؤں سے لیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ گائے ہندوؤں کا معبد ہے اس کا ذبح کرنا اس لئے ان کو ناگوار ہے۔ پھر ان مسلمانوں کو شرم نہیں آتی جس غرض کا مشاء شرک ہوا س میں وہ ہندوؤں کی موافقت و حمایت کرتے ہیں۔ (سنۃ ابراہیم ص ۳۲ ج ۱۷)

جو چیز عام طور پر اسلام و کفر میں امتیاز پیدا کرنے والی ہو وہی شعار اسلام ہے اور ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمان کو ہندوؤں سے امتیاز گائے کے ذبح اور اس کا گوشت کھانے، ہی سے ہوتا ہے اور اس وقت تجربہ نے بتلا دیا کہ جو لوگ اس شعار اسلام کے تارک تھے زیادہ تر وہی فتنہ ارتدا د کے دام میں بتلا ہوئے۔ اور جو اس شعار کو اختیار کئے ہوئے ہیں ان کی طرف کوئی رخ بھی نہیں کرتا تو علاوہ شعار اسلام ہونے کے یہ بڑا پھرہ دار بھی ہے۔ (محاسن اسلام ص ۲۶ ج ۱۲)

### غلط فہمی کا ازالہ

از روئے شرع گائے کی قربانی سے روکنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ بعض بھولے لوگوں کو اس میں غلطی ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ مطلق قربانی واجب ہے خواہ بکری کی ہو یا گائے کی۔ پھر کیا ضرورت ہے آپس میں اختلاف پیدا کرنے کی۔ گائے کی قربانی چھوڑ دیں۔ بکری کی

کیا کریں۔ بظاہر تو یہ رائے بہت مناسب ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بالکل لچراور (ضعیف بات ہے)۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دیکھنا چاہئے کہ گائے کی قربانی ترک کرنا دوسری قوم کے نزدیک مذہبی امر پر مبنی ہے یا ملکی مصالح پر۔ تو واقع میں ان کے یہاں یہ مذہب کا جز ہے پس اس وقت ہمارا ترک کرنا کفر کی رعایت کرنا ہے اس لئے ہرگز جائز نہیں ہے۔

بعض لوگ گاؤں کشی کے متعلق اخباروں میں اپنی رائے لکھ کر ہم سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ ہم بھی اخباروں میں اس کے متعلق اپنی رائے لکھیں مگر ہمارے نزدیک اخباروں میں آج کل ایسا مضمون لکھنا حکام کو اپنی طرف سے بدگمان کرنا ہے۔ کیونکہ نامہ نگاروں کو حکام عموماً مفسد سمجھتے ہیں اس لئے ہم کسی کو بدگمان نہیں کرنا چاہتے۔

ہمارے اصول میں ہے اتفاقاً مواضع التهم تہمت کے موقع سے بچو۔

نیز اخبار میں مضمون لکھ کر اس مضمون کو بے قدر کرنا ہے۔ اس مضمون کی عام مسلمانوں اور دینداروں کی نظر وہ میں کچھ وقعت نہیں ہوتی اس لئے ہم کو اخبار میں مضمون لکھنا پسند نہیں۔ اور یہ بھی پسند نہیں کہ ہندوؤں کو چڑا چڑا کر گاؤں کشی کریں کہ اس میں دل آزاری اور بلا ضرورت فتنہ ہے جیسے پہلے سے کرتے ہو اسی طرح کرتے رہو۔ (الفحایا بالحقیقت ابراہیم ص ۱۶۰)

## غیر مسلموں کو قرآن مجید جلانے سے متعلق

### ایک استفتہ اور اس کا جواب

سوال:۔ ہولی ہندوؤں کی عید کا دن ہے وہ اس دن کھیل کو دکرتے ہیں ہندوؤں کے محلہ میں ایک مسجد ہے جس میں کھڑکی میں قرآن شریف رکھا تھا جسے ہندوؤں کے بچوں نے وہاں سے اٹھا کر باہر لا کر آگ میں جلا دیا۔ جلے ہوئے اور اق مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ انہوں نے افسوس کے ساتھ مقدمہ دائر کر دیا جو چل رہا ہے۔ ہندوؤں اور ان کے دیکیلوں نے مسلمانوں سے کہا کہ مقدمہ اٹھا لو۔ تمہارا مذہب اس بارے میں جو فیصلہ کرے گا ہم سب کو قبول ہو گا۔ مسلمانوں نے بندہ کو طلب کر کے شرعی حکم مانگا۔ میں نے کہا کہ میں اس

مسئلہ سے ناواقف ہوں علماء مفتیان کرام کو لکھ رہا ہوں جو فتویٰ آئے گا اسے پیش کر دوں گا فتویٰ آنے تک انہوں نے سرکار سے مہلت لے لی ہے۔ معاملہ چونکہ نہایت اہم ہے اس لئے جواب میں حوالہ کتب ضرور تحریر فرمائیں۔

نیز یہ بھی واضح فرمائیں کہ اگر بالفرض بے حرمتی بجائے بچوں کے بڑوں سے ظاہر ہو تو کیا حکم ہوگا۔ اور ہوش یا بے ہوشی کی حالت میں ہو تو کیا حکم ہے۔

الجواب :- (صورت مسئلہ میں) دریافت کردہ فعل میں "تعزیر" (یعنی سزا) واجب ہے۔

۲:- اور شرعاً تعزیر کی مقدار معین نہیں ہے بلکہ حاکم کی صواب دید پر موقوف ہے۔

۳:- اور حاکم کے لئے ضروری ہے کہ جرم کے درجہ اور مجرم کی حالت پر نظر کرے دونوں باتوں پر اچھی طرح غور و خوض کر کے ایسی سزا تجویز کرے جس سے تعزیر کا مقصد حاصل ہو۔ یعنی اس قسم کے جرائم سے رکاوٹ (وبندش) ہو۔ ناظرین کو عبرت و سبق ملے۔ اور شعائر اسلامی کے احترام و تقدس کی حفاظت ہو۔

اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ واقعہ تو ہولناک اور انتہائی اضطراب انگیز ہے اگر کافی سزا تجویز نہ کی جائے گی تو شعائر اسلام کے بے قعی کا سبب اور مسلمانوں کے دل ٹوٹنے کا باعث نیز اہل اسلام کے غصب کو جوش میں لانے والا، اس کے علاوہ مستقبل میں سنگین مفاسد اور بڑے فتنوں کو جنم دینے والا ہوگا۔ اور نابالغ ہونا مانع تعزیر نہیں اور نشہ میں ہونا بھی تعزیر سے مانع نہیں۔ (امداد الفتاویٰ ص ۵۳۸ ج ۲ دلائل کے لئے اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں)

## مکتوب گرامی

اس کے ساتھ مندرجہ ذیل خط بھی روانہ فرمایا۔

السلام علیکم! قرآن سے دل میں یوں آتا ہے کہ ہندوؤں کے وکیلوں نے کتابوں کے مطالعہ سے یقین کر لیا ہے کہ اس جرم میں قانونی سزا کے مقابلہ میں شرعی سزا زیادہ ہلکی چھلکی ہے۔ اسی وجہ سے وہ شرعی سزا پر راضی ہوتے ہیں۔ اور شرعی سزا حاکم پر موقوف ہے، اور حاکم کا حال معلوم ہے لہذا اندیشہ ہے کہ ہلکی (معمولی) سزا ہی تجویز کر دے جس سے

جرائم کی بندش کا مقصد بھی حاصل نہ ہو۔ (جو تعزیر کا اصل مقصد ہے) اس لئے احقر کی رائے یہ ہے کہ عقلاء بھی اتفاق کر لیں تو بھی اس قسم کی درخواست کو قبول نہ کریں۔

اور یہ حکم شرعی کا رد کرنا نہیں ہے بلکہ چوں کہ بصورت دیگر اس قسم کے جرائم کی بندش کی مصلحت حاصل ہونے کی امید نہیں ہے۔ لہذا (گویا) یہ امر غیر شرعی کا رد کرنا ہے اور سرکاری حاکموں سے قانونی سزا کے اجراء کی درخواست کریں کہ یہ مذکورہ بندش پر مرتب ہونے کے سبب گویا) شرعی سزا ہی پر مشتمل ہے۔ واللہ اعلم۔ (امداد الفتاویٰ ص ۵۳۸، ج ۲ سوال نمبر ۶۲۶)

### حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی

ایک مقام پر ایک گستاخ کافر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ حالات شائع کئے تھے۔ مسلمانوں کے مواخذہ پر اس نے علماء کی ایک باقاعدہ جمیعت سے معافی چاہی اور آئندہ احتیاط رکھنے کا اور فی الحال اپنی اس غلطی اور معافی کی درخواست کا اخباروں میں اعلان کر دینے کا وعدہ کیا۔ اکثر مسلمانوں کی رائے کو منظور کر لینے کی ہو گئی اور بعض نے اختلاف کیا۔ اور حکومت موجودہ میں استغاثہ ہی کو ترجیح دی۔

اور دلیل یہ بیان کی کہ یہ حق اللہ ہے اس کی معافی کا حق صرف سلطان اسلام کو ہے اس کے متعلق سوال آیا تھا۔ جس کا جواب حسب ذیل لکھا گیا۔

”معافی کی جو حقیقت صاحب شبهے نے سمجھی ہے اس معنی کو یعنی معافی کے بعد ناگواری نہ رہنا“ یہ معافی صورۃ معافی ہے۔ اسی لئے بعض حضرات کو شبهہ ہو گیا کہ حق تعالیٰ کے معاف کرنے کا کسی کو حق نہیں مگر حقیقت میں یہ معافی نہیں بلکہ صلح ہے اور صلح سے کوئی امر مانع نہیں، اور صلح جیسے بلا شرط ہو سکتی ہے اسی طرح شرط پر بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے یہاں پر شرط مقرر کی جاتی ہے کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔ البتہ صلح میں یہ شرعاً قید ہے کہ مسلمانوں کے حق میں وہ مصلحت ہو اور یہاں مصلحت ہونا ظاہر ہے کہ فی الحال اسلام کی عزت اور کفر کی ذلت ہے اور فی الحال ایک منکر قبیح کفری (یعنی آئندہ کے لئے ایک کفری منکر) کی بندش ہے خود عہد کرنے والے سے بھی اور امید ہے کہ دوسرے لوگوں میں (بھی اس کا اثر ہو گا) کہ اس منکر کا نتیجہ دیکھ کر بعض لوگ عبرت پکڑیں گے۔ اور بعض لوگ مسلمانوں کی رواداری سے متاثر ہوں گے۔

اور حکومت سے استغاثہ میں ان توقعات کا گمان بھی نہیں۔ چنانچہ موجودہ فضاء اس کی شاہد ہے۔ پھر اگر خدا نخواستہ استغاثہ میں کامیابی نہ ہوئی تو اس پر جو مفاسد مرتب ہوں گے ان کے انسداد (بندش) پر مسلمانوں کو کوئی کافی قدرت نہیں۔ ہمیشہ کے لئے ایسے لوگوں کی جرأت بڑھ جائے گی۔

بلکہ ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ اگر کامیابی بھی ہو گئی تو ظاہر ہے کہ سزاۓ موت کا تو احتمال بھی نہیں قید یا جرمانہ ہو سکتا ہے سو بہت سے مفسد (ظالم) ایسے ہیں کہ قید اور جرمانہ کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ ان کو ایک نظیر ہاتھ آ جائے گی (اور آئندہ بھی خطرہ ہوگا)۔

رہایش بہ کہ معافی کا حق صرف سلطان اسلام کو ہے عام مسلمانوں کو نہیں اور اس کی جو دلیل بیان کی گئی ہے کہ یہ حق اللہ ہے اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ سلطان کو بھی یہ حق نہیں کیونکہ سلطان حقوق اللہ کو معاف نہیں کر سکتا۔ (ملفوظات کمالات اشرفیہ ص ۲۰۲)

## حکام کی اطاعت کا بیان

### حکام کی اطاعت کے حدود اور مسئلہ کی مختلف صورتیں

جس صورت میں سلطان نے کوئی حکم دیا ہے اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

۱:- اگر وہ حکم ایسا ہو کہ اس میں عام لوگوں کی مصلحت ہے (اور اس کے) خلاف کرنے میں عام ضرر ہو۔ اس میں (حاکم کی اطاعت قانون کی پابندی) ظاہر اور باطنًا واجب ہے۔ (یعنی علائیہ طور پر بھی واجب ہے اور خفیہ طور پر یعنی حاکم کو اطلاع بھی نہ ہوتی بھی واجب ہے)۔

۲:- اور اگر ایسا نہیں ہے (یعنی خلاف کرنے میں عام ضرر نہیں ہے) تو صرف ظاہراً (حاکم کی اطاعت) واجب ہے تاکہ فتنہ نہ ہو۔ باطنًا واجب نہیں (یعنی اگر حاکم کو اطلاع نہ ہو تو خفیہ طور پر اس حکم کے خلاف کرنے میں گناہ نہیں) کیونکہ اپنے نقصان کے التزام کا ہر شخص کو اختیار ہے۔

۳:- (حاکم نے جو حکم دیا ہے) ایسا حکم دائی نہیں ہو سکتا حاکم کی حیات تک باقی رہے گا پھر باطل ہو جائے گا۔ اس کے بعد کے حاکم کو خصوصیت کے ساتھ تجدید کی حاجت ہوگی۔ (مزید تفصیل دلائل کے لئے ملاحظہ ہونمبر ۲)

## حکام کی اطاعت اور حکومت کے

### قوانين کی پابندی کا شرعی ضابطہ

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے (رانج یہ ہے کہ) حکام اسلام کی اطاعت مباحثات میں بھی ضروری ہے۔ اگر حاکم کسی مباح کو منع کر دے۔ مکھوین (رعایا) پر اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ آیات و احادیث میں امراء مسلمین کی اطاعت واجب ہونے کا حکم مصروف ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا محل (موقع) وہی امر ہے جو فی نفسہ مباح ہے۔ یعنی جائز ہے۔ ورنہ واجب یا حرام میں خود امر و نبی شرعی (یعنی شریعت کا حکم کرنا) کافی ہے۔ اس میں اولو الامر کا کیا دخل۔

(ای طرح) امر مجتہد فیہ میں (یعنی جس مسئلہ میں اختلاف ہوا س میں) حکام مسلم اگر ایک شق متعین کر دے تو وہ واجب ہو جاتی ہے۔

### حاکم کے ظلم کرنے کی صورت میں شرعی حکم

(حاکم اگر) ایسا فرق اختیار کرے جس کا اثر دوسروں تک پہنچ جس کو ظلم کہتے ہیں (اس کی دو صورتیں ہیں یا تو اس کا تعلق دنیا سے یعنی مال سے ہو گا یا اس ظلم کا تعلق دین سے ہو گا اگر) اس ظلم کا محل صرف مال ہو یعنی لوگوں کے مال تا حق لینے لگے۔ اس کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ اس میں جائز ہونے کا شہر ہو سکتا ہے۔ دوسرے جس میں جائز ہونے کا شہر نہ ہو اگر پہلی صورت ہے یعنی اس میں جواز کا استباہ بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے مصالح سلطنت کے نام سے (یعنی حکومت کے فائدے اور مصلحت کے نام سے) نیکس وغیرہ وصول کرنے لگے۔

(اس کا حکم یہ ہے کہ حاکم کے حکم کی اور اس کے قانون کی پابندی) اور اطاعت کرے۔

(دوسرا صورت میں یعنی جب حاکم) مالی ظلم کرے مگر اس میں جواز کا بھی استباہ نہ ہو بلکہ صریح ظلم ہو (اس کا حکم یہ ہے کہ) اپنے اوپر سے ظلم کو دفع کرے اگرچہ قتال کی نوبت آ جائے (البتہ) صبر کرنا بھی جائز ہے بلکہ غالباً اولی ہے اور یہ قتال للحر و نج (بعاوت) نہیں ہے بلکہ دفاع کے لئے ہے اور حدیث میں فاسمع واطع کا امر ہے جو ظاہر اوجوب کے لئے ہے اس کی تفسیر عدم خروج (یعنی بغاوت نہ کرنا) ہے پس کوئی تعارض (اور اشکال بھی) نہیں مگر چونکہ یہ دفاع بھی صورۃ

خروج (بعاوت) تھا لہذا صبر کی افضلیت ظاہر ہے..... جس کی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔

## حاکم اگر دینی امور میں ظلم و زیادتی کرنے لگے اس صورت کا شرعی حکم

(حاکم اگر ایسا) فرق و ظلم اختیار کرے جس کا محل دین ہو یعنی ان کو معاصلی شریعت کے خلاف باتوں پر مجبور کرے۔ مگر فرق (ظلم اسی، وقت تک ہے جب کہ اس کا نشاء استخفاف، یا استقباح دین اور احسان کفر (یعنی دین کو حقیر اور براجانا اور کفر کو اچھا سمجھنا) نہ ہو ورنہ یہ بھی حقیقتہ کفر ہو گا۔ (جس کا حکم پہلے گزر چکا) یا فی الحال تو اس کا نشاء (سبب) استخفاف وغیرہ نہ ہو، لیکن اکراہ عام قانونی شکل میں ایسے طریقہ پر ہو کہ ایک مدت تک اس پر عمل ہونے سے ظن غالب یہ ہو کہ آئندہ چل کر طبیعتوں میں استخفاف (یعنی اس شرعی حکم کی حقارت) پیدا ہو جائے گی تو ایسا اکراہ اور قانون بنا نا بھی کفر کے حکم میں ہو گا۔ چنانچہ فقہاء کا اذان و ختنہ کو (جو کہ سنت ہیں) عام طور پر ترک کرنے کو استخفاف دین یا تارکیں (چھوڑنے والوں) سے لڑائی کا موجب قرار دینا صریح دلیل ہے۔ ایسے عموم کے کفر میں ہونے کی۔

اس صورت کا حکم یہ ہے کہ یہ (صورتیں یعنی ظلم و زیادتی) اکراہ علی المعاصلی کے قبیل سے ہیں اس کا مستقل حکم کتاب الائکراہ میں مذکور ہے وہاں معلوم کیا جائے۔

## حاکم کے ظلم کرنے کی صورت میں

### مظلومین کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے شرعی حکم

یہ حکم تو خود مظلومین کا تھا باقی دوسروں کے لئے امام (حاکم) کے مقابلہ میں ان مظلومین کی اعانت (مد) کرنا، یا ان کے مقابلہ میں امام کی اعانت کرنا (شرع اس کا حکم کیا ہے؟) سو امام کی اعانت تو اس صورت میں بالاتفاق حرام ہے باقی مظلومین کی اعانت (و حمایت) کرنا اس میں جامع الفصولین اور فتح کی عبارت میں اختلاف ہے۔ علامہ شامی نے تطہیق کی کوشش کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر اس اعانت (یعنی مظلومین کی حمایت) کے مفید ہونے کی امید ہو تو اعانت ہے۔ اور قواعد سے مفید ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی

فتنہ مرتب نہ ہو ورنہ اعانت نہ کرے۔ واللہ اعلم۔

بعض حالات میں غیر اسلامی حکومتوں کی نصرت واجب ہے اصولیین و فقهاء کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ ما جتمع الحلال والحرام الا وقد غالب الحرام یعنی حلال و حرام کا مجموعہ حرام ہی ہوتا ہے۔ اور یہی مسئلہ عقلی بھی ہے کہ کامل اور ناقص کا مرکب ناقص ہی ہوتا ہے تو کفار اور مسلم سے جو سلطنت مرکب ہوگی، ایسی حکومت بھی غیر اسلامی ہوگی۔ پس جب کہ ترکی میں (جمهوریت) قائم ہوگئی ہے جو مسلم اور غیر مسلم سے مشترک ہے تو وہ اسلامی سلطنت نہ ہوگی لیکن مسلمانوں پر اس کی نصرت واجب ہے کیونکہ دوسری سلطنتیں اس کا مقابلہ اسلامی سلطنت سمجھ کر کرتی ہیں۔

وقد افتی استاذی بنصرۃ بعض اهل البدعة فی مقابلۃ اهل الکفر لان  
اہل الکفر انما ز احموهم فی البدعة ز عما منہم انہا من الاسلام.

حاکم وقت کسی امر مباح کا حکم دے تو وہ واجب ہوتا ہے

فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ حاکم وقت اگر کسی امر مباح کا حکم دے یا منع کرے تو اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے اور اس کی دلیل وہ نصوص ہیں جن میں سمع و اطاعت حکم دیا گیا ہے اور میرے نزدیک اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مبنی ہے و ما کان لمو من ولا مونہ الا یہ کیونکہ یہ نکاح جس کی وجہ سے یہ آیت نازل کی گئی واجب نہیں تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی وجہ سے واجب ہو گیا تھا۔ لہذا اس قول کی بھی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم وحی کی وجہ سے تھا اور حاکم جب مصلحت دیکھے گا اپنے اجتہاد سے حکم دے گا۔ (بیاض اشرفی)

حکومت کی چوری

حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی اور چوری کرنا جائز نہیں  
عوام الناں کا فتویٰ یہی ہے کہ کافروں کا مال جس طرح بھی ملے لے لیا جائے سب جائز ہے۔

چنانچہ ریل میں بے احتیاطیوں کا مشاہدہ ہوتا ہے (کوئی بغیر نکٹ کے سفر کرتا ہے کوئی خلاف قانون زیادہ سامان لاد کر لے جاتا ہے) اس طرف توجہ ہی نہیں کہ قانون سے زیادہ سامان ریل پر لے جانا چاہئے، یا نہیں؟

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کفار کا قانون ماننا ضروری تھوڑی ہے مگر خوب سمجھ لجھئے کہ یہ قانون (اور اس طرح کے بہت سے قوانین صرف) ملکی قانون نہیں ہے۔ جو یہ عذر کیا جائے بلکہ یہ شرعی قانون اجارة کے متعلق ہے۔

(بالفرض) اگر سلطنت ہونے کی حیثیت سے اس کا ماننا ضروری نہ بھی ہو تو اجارة کے شرعی قانون کے لحاظ سے تو ماننا ضروری ہے شرائط اجارة میں سلطنت اور غیر سلطنت برابر ہیں۔ جن شرائط پر اجرت طے ہوان کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے۔ تو ان کا قانون (یعنی حکومت کا قانون) شرعی اجارة کے قانون کے لحاظ سے واجب لعمل ہے جب انہوں نے قانون مقرر کر دیا ہے کہ (مثلاً) پندرہ کلوے زیادہ سامان کسی کو بغیر کرایہ کے لے جانے کی اجازت نہیں تو اگر تھوڑا بھی اس سے زیادہ ہوگا تو اس وجہ سے کہ (شرائط اجارة اور قانون کے خلاف ہے نیز) غیر کی حق تلفی ہے اس لئے اس کا لے جانا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

بہت سے لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ کفار کا مال ہے چاہے جس طرح تصرف کرو۔ یہ ان کی غلطی ہے۔

## کافروں کا مال کھانا ان کا حق دبانا جائز نہیں

فرمایا بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کافروں کا ہم پر کوئی حق نہیں اور ان کا مال ہر طرح کھانا جائز ہے اور اس سے کوئی وباں نہیں پڑتا۔ حالانکہ اس کا وباں مسلمانوں کا حق دبانے سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس واسطے کے نصوص (قرآن حديث) سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن حق والے کو اس ظالم (یعنی حق دبانے والے اور نا حق مال کھانے والے کی) نیکیاں دلائی جائیں گی یا پھر حق والے کے گناہ اس پڑا لے جائیں گے..... اگر کافر کے گناہ مسلمان پڑا لے گئے تو کافر کے گناہ ظاہر ہے کہ زیادہ سخت ہوتے ہیں وہ اس پڑا لے جائیں گے کتنی سخت بات ہے۔

## غلط فہمی کا ازالہ اور احتیاط کا مقتضی

عوامِ الناس کا توفیق ہے کہ کفار کا مال جس طرح بھی ملے سب جائز ہے (اس میں پڑھے کہے لوگ بھی بتلا ہیں) یہ ان کی غلطی ہے۔

بعض لوگوں نے اس کی وجہ گھڑی ہے کہ ہمارے بہت سے حقوق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گئے ہیں اسی لئے ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم خفیہ طور سے وصول کریں۔

اول تو اس میں یہ بات ہے کہ کیا..... ہر شخص کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے اور پھر جن کے حقوق گورنمنٹ کے ذمہ ہوں بھی تو کیا ان کے پاس اس کا حساب ہے کہ کتنے حقوق گورنمنٹ کے ان کے ذمہ ہیں یہ سب نفس کی تاویلیں ہیں بلکہ اگر ثابت بھی ہو جائے کہ اس کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے تب بھی نفس کی حفاظت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسا نہ کیا جائے وجبہ اس کی یہ ہے کہ نفس کو جیسی عادت ڈالی جاتی ہے ویسی ہی پڑ جاتی ہے اگر اس کی عادت ڈالی گئی تو وہ اس کا عادی ہو جائے گا اور آئندہ حد سے آگے بڑھے گا جہاں قطعاً جائز نہ ہو گا وہاں بھی اسی عادت پر عمل کرے گا نفس کو تو ذرا سا بہانہ چاہئے۔

الغرض۔ اگر ثابت بھی ہو جائے کہ گورنمنٹ کے ذمہ ہمارا حق رہ گیا ہے جب بھی ایسا نہ کریں علاج کا مقتضی یہی ہے، ورنہ عادت ہو جانے کے بعد اپنا حق وصول ہو جانے پر بھی نفس (یہ حرکت) نہیں چھوڑے گا۔

### جن مکثوں پر مہر نہ لگی ہواں کا دوبارہ استعمال کرنا درست نہیں

میرے پاس کثرت سے ایسے خطوط آتے ہیں کہ جن پر یا تو ڈاکخانہ کی مہر نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو نکت پر مہر نہیں ہوتی۔

اگر میری نیت بری ہو تو میں ان مکثوں سے دوبارہ نفع اٹھا سکتا ہوں کہ دوسرے خطوط پر لگا کر بھیج دوں، مگر شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ جو پیسے لفافہ کے دیئے گئے ہیں وہ اجرت کے طور پر ہیں، اور وہ لفافہ کی شکل اصل میں ان پیسوں کی رسید ہے پس جب ڈاک پہنچی تو وہ پیسے وصول ہو گئے اب اس رسید سے (یعنی لفافہ یا نکت سے) دوسری بار

وصول کرنا حرام ہے۔ پس میں ایسے نکشوں کو پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔

ریل کے نکٹ سے اسی طرح ڈاک کے نکٹ سے دوبارہ نفع اٹھانا جائز نہیں۔ کیونکہ جتنے کام کی یہ رسید تھی اتنا کام تو آپ نے ڈاک سے لے لیا۔ اب اگر دوسرا کام لینا ہو تو دوسرا نکٹ خریدنا پڑے گا، اس سے نفع لینا حرام ہو گا۔

### بغیر نکٹ یا خلاف قانون سفر کرنا درست نہیں

ایک طالب علم نے مسئلہ پوچھا کہ میں فلاں جگہ سے سوار ہو کر فلاں جگہ اترا، حالانکہ ریل کا نکٹ میں نے صرف تھوڑی ہی دور (قریب والے اسٹیشن) تک کالیا تھا، پھر چوری سے بیٹھے ہوئے دور تک چلا آیا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟

فرمایا فلاں جگہ سے فلاں جگہ تک کا جو کرایہ ہوا س میں سے جو تم دے چکے ہواں کو گھٹا کر باقی ادا کر دو۔ (یعنی اتنی دور تک کا نکٹ لے کر پھاڑ کر پھینک دو)۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم سفر کر رہے تھے میں بھی ریل میں سوار تھا، تم تو درمیانی درجہ میں تھے وہ تیسرے درجہ میں (یعنی تھرڈ کلاس میں) یہ شخص محبت سے ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے اور ایک دو سیشن تک بیٹھے رہے اس کے بعد اتر کر اپنے درجہ میں جانے لگے، میں نے ان سے کہا کہ تم نے اتنی مسافت درمیانی درجہ میں طے کی ہے اور تمہارے پاس نکٹ تیسرے درجہ کا ہے اتنی مقدار تمہارے ذمہ محسول کی دین ہے۔ تم اس کو ادا کر دینا۔ اور آسان ترکیب بتا دی، کہ جس قدر محسول (کرایہ) درمیانی درجہ کا تیسرے درجہ سے زائد ہو، اس کا نکٹ اسی لائے کا خرید کر چاک کر دینا (یعنی پھاڑ کر پھینک دینا) بس ادا ہو جائے گا۔ درنہ گناہ ہو گا۔ اس گناہ کی تلافی یہی ہے کہ اس کا بدل ادا کر دے۔ کیونکہ یہ گناہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔

### حکومت کی طرف سے دی ہوئی سرکاری پنسل کو

#### بھی اپنے کام میں لانا جائز نہیں

ایک صاحب نے عرض کیا کہ پنسل (وغیرہ) دفتر میں سرکاری ملازمین کو دی جاتی ہے اور ایک ماہ کے خرچ کے لئے ایک پنسل ملتی ہے اور اس میں سے کچھ بچ جاتی ہے اس کو اپنے

کام میں لانا درست ہے یا نہیں۔ بہت سے لوگ بھی ہوئی کو اپنے کام میں لیتے ہیں۔

فرمایا کہ جائز نہیں یہ تو سرکاری کام میں استعمال کے لئے دی جاتی ہے ان کو مالک تھوڑی بنایا جاتا ہے اور اس کا ایک آسان امتحان یہ ہے کہ جو بھی جائے اس کو پیش کر کے (یعنی واپس کر کے) دیکھ لو۔ اطلاع کرنے پر بھی یہ حکم نہ ہو گا کہ جو بھی ہوئی ہے وہ تمہاری ہے۔ اور اس کا ایک مہینہ کے لئے مقرر کرنا یہ صرف انتظامی چیز ہے۔ نہیں کہ ان کو ایک مہینہ کاٹھیکدے دیا ہے۔

### کافر کا مال لینا، مسلمان کا مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے

لانا محمد قاسم صاحب نے اس کے متعلق ایک عجیب بات فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ بھائی اگر کسی کا مال ہی رکھنا ہو تو مسلمان کا رکھ لے کافر کا نہ رکھ کیونکہ قیامت کے دن ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو نماز، روزہ ظالم کا اس کے بھائی ہی کو ملے گا خیر اگر ظاہر میں ظلم کیا تو باطن میں قومی ہمدردی بھی تو کی، کہ اپنی نیکیاں اسے دے دیں۔ اور اگر کافر کا حق رکھا۔ تو ایک تو اپنی نیکیاں پرائے گھر گئیں پھر اس صورت میں نہ تمہارا بھلا، نہ اس کا بھلا۔ کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم میں ہی گیا۔ اگر کوئی کہے کہ پھر اسے نفع کیا ہو اجب نیکیاں اس کے کارآمد نہ ہو گیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نفع تو ہو گا مگر اتنا کم ہو گا کہ اسے محسوس نہ ہو گا۔ جیسے اگر کسی کے پاس میں بھرسونے کا ایک ڈھیر ہے اور اس میں کسی نے ایک رتی بھرسونا چڑالیا تو واقع میں تو کمی ہوئی مگر محسوس نہ ہوئی لیکن کوئی عقلمند اس کی اجازت نہ دے گا کہ اتنا سا چڑالیا کرو۔

بہر حال مولانا کی تقریر سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے۔

### ایک استدلال اور اس کا جواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لا يحل مال امری مسلم الا بطیب نفس منه

یہاں ایک شبہ نئے مجتہدوں کی طرف سے ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو

مسلم کی قید لگائی ہے اس لئے کافر کا مال جبرا (زبردستی) لینے میں کیا حرج ہے؟ حدیث میں تو مسلم کی قید ہے اس لئے مسلمان کا مال تو بغیر اس کی دلی مرضی کے حلال نہیں ہو گا۔ لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے۔ اور شاید پھر اس استدلال کے پیش نظر میں بغیر نکت کے سفر کرتے ہوں کہ وہ مسلمان کی نہیں ہے غیر مسلم اس کے مالک ہیں، اور بعض لوگ اسے سرکاری سمجھ کر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہیں۔ (حالانکہ) یہ مسئلہ بھی خود اپنی جگہ پر قابل بحث ہے کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں۔ مگر بہت سے لوگ اس جگہ مسلم کی قید دیکھ کر یوں سمجھے ہوں گے کہ کافروں کا مال لینے میں کچھ حرج نہیں خواہ اس پر ہمارا حق ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسلمان کا مال جبرا لینے کو منع فرمایا ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے کیونکہ عادۃ مسلمانوں کو سابقہ مسلمانوں ہی سے (زیادہ تر) پڑتا ہے (اس لئے مسلمانوں کا مال نا حق لینے کا زیادہ امکان ہوتا ہے) ورنہ عام نصوص کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی مال لینا حلال نہیں۔ چنانچہ بعض احادیث میں آیا ہے۔

### الرجل يقطع مال الرجل

دوسرा جواب یہ ہے کہ۔ کافر، ذمی (جو اسلامی حکومت کی ماتحتی میں ہو) اور کافر مسلم (یعنی جن سے معابدہ ہو) حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثلاً مسلمان کے ہی۔

### لهم مالنا وعليهم ما علينا

(جو حکم ہمارے لئے وہ ان کے لئے بھی) البتہ حرbi کافر کا مال مباح ہے، مگر وہاں بھی فریب مکر (یعنی دھوکہ جھوٹ وغیرہ) جائز نہیں۔

تیسرا جواب یہ کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عادل امت سے یہ احتمال ہی نہ تھا کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو نقصان پہنچائے گا۔ اگر کرے گا تو اپنے بھائی ہی کی گلوٹر اشی کرے گا..... اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس سے بھی روک دیا۔

غرض دلی مرضی کے بغیر کسی کا بھی مال حلال نہیں ہوتا (گووہ کافر ہی کیوں نہ ہو)۔

## دارالحرب اور سود

### دارالحرب میں حربیوں سے سود لینے کا مطلب

ایں قدر ظاہر است کہ گرفتن سود از حربیاں بائیں وجہ

حلال است کہ مال حربی مباح است اگر در ضمن آن نقض

عہد نباشد و حربی چوں خود بخود بد ہد بلاشبہ حلال خواہد یوہ

ترجمہ:- اتنی مقدار ظاہر ہے کہ حربیوں سے سود لینا اس وجہ سے حلال ہے کہ حربی کامال

مباح ہے اگر اس کے ضمن میں نقض عہد نہ ہو اور حربی جب خود بخود دے تو بلاشبہ حلال ہو گا۔

اور مسلمان کا کسی غیر مسلم کو سود دینا کسی کے نزدیک جائز نہیں۔

### مسلمکی توضیح

زیوینین المسلمين والحربي (یعنی دارالحرب میں حربیوں سے سود لینے کا مسئلہ) مختلف

فیہ ہے۔ امام صاحب اور امام محمد چند قبود کے ساتھ جواز کی طرف گئے ہیں، اور ابو یوسف اور

امیرہ ثلاثۃ عدم جواز کی طرف (یعنی ان کے نزدیک جائز نہیں)۔

### قاتلین جواز کی دلیل

جو لوگ (دارالحرب میں حربی سے سود لینے کو اور) بینک کے سود کو جائز کہتے ہیں وہ

شرعی دلائل سے ربوہ کی حرمت کے لئے مال محترم کی قید لگاتے ہیں اور ”مال محترم“ سے مراد

وہ مال ہے جو غیر مباح ہو۔ اور مال محترم کی اس سے زیادہ آسان تعبیر یہ ہے کہ جس مال میں

عقد صحیح کے بغیر تصرف جائز نہ ہو وہ مال محترم ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ آسان تعبیر یہ ہے کہ جس مال پر جہاد میں بھی قبضہ جائز نہ ہو وہ

مال محترم ہے پس ایسا مال تو مون یا ذمی کا ہے۔ باقی حربی کامال عارضی عہد کی وجہ سے محترم

ہو جاتا ہے ورنہ فی نفسہ محترم نہیں کیونکہ مال کے اندر احترام صاحب مال کے احترام کی وجہ

سے آتا ہے اور کافر غیر ذمی محترم نہیں، لہذا اس کامال بھی محترم نہیں۔ جب احترام نہیں تو اس

میں رٹا بھی نہیں یہ حاصل ہے ان قائمین جواز کے قول کا۔

### جواز کے شرائط

جن حضرات کے نزدیک (دارالحرب میں حریبوں سے سود لینا) جائز ہے ان کے نزدیک بھی اس میں اتنی قیدیں ہیں۔

۱:- وہ محل دارالحرب ہو۔

۲:- رٹا کا معاملہ حریبی سے ہو۔

۳:- مسلم اصلی سے نہ ہو۔ اور نہ ذمی سے ہو۔ اور مسلم اصلی وہ ہے جو دارالحرب میں آنے کے قبل اسلام لایا ہو، خود یا اپنے آبا اور اجداد کی اتباع میں۔

۴:- معاملہ کرنے والا وہ مسلم ہو جو دارالاسلام سے دارالحرب میں امن لے کر آیا ہو۔ یا وہ مسلم ہو جو دارالحرب ہی میں اسلام لایا ہو، وہ مسلم اصلی نہ ہو جو خود دارالحرب میں رہتا ہو۔ اس قید رابع (چوتھی قید) کی تصریح کہیں نظر سے نہیں گز ری مگر اس قاعدہ کی تصریح ہے کہ روایات فقیہہ کے مفہوم جلت ہیں۔ اس بناء پر اوپر کی روایات سے یہ قید لازم ہے۔ اب جو مسلمان یہ معاملہ کرتے ہیں (یعنی غیر مسلموں سے سود لیتے ہیں) وہ یہاں ہی رہتے ہیں، کسی دارالاسلام سے یہاں نہیں آئے۔ اس میں بینک سے معاملہ کرنے والے بھی داخل ہیں کہ یہ قید چہارم ان میں نہیں پائی جاتی تو اس بناء پر خود امام صاحب کے قول پر بھی یہ معاملہ جائز نہ ہوا۔

### حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی رائے

(دارالحرب میں حریبی سے سود لینا اور) بینک کے سود کا مسئلہ علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ میری رائے اس میں یہ ہے کہ میں اس کو ناجائز سمجھتا ہوں۔

کسی نے کہا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب غیر دارالاسلام میں عقد رٹا کو جائز لکھتے ہیں۔ اور دلیل یہ ہے کہ

لاربیین المسلمين والحربيين (یعنی مسلم و حریب کے درمیان رٹا کا تحقیق ہی نہیں ہوتا) فرمایا کہ میری تحقیق یہ ہے کہ عقد جائز نہیں، ہمارے بعض اکابر جائز فرماتے تھے اس

کی وجہ سے مجھ پر اعتراض ہوا کہ آپ نے اپنے بڑوں کی مخالفت کی۔

میں نے جواب دیا کہ یہ مخالفت نہیں، خلاف توجہ ہوتا کہ وہ جائز کہتے، اور میں ناجائز کہتا۔ میں نے تو احتیاط کو لیا ہے۔ احتیاط تو اچھی چیز ہے۔

### حضرت تھانویؒ اور دیگر علماء کی رائے کا فرق

جو لوگ دارالحرب میں حرbi کے مال کو بلا غدر (یعنی دھوکہ عہد شکنی جھوٹ کے بغیر اس کی رضامندی سے خواہ عقود فاسدہ ہی کے ذریعہ (یعنی صورۃ سودی معاملہ کے ذریعہ) سے کیوں نہ ہو لینا جائز کہتے ہیں ان کے نزد یہ حلال ہوگا۔

میری رائے اس میں یہ ہے کہ وہ مال تو حلال اور طیب ہوگا لیکن چونکہ اس نے عقد فاسد کرنے کا ارتکاب کیا ہے نص کے عموم کی وجہ سے اس کا گناہ ہوگا۔

وَمَا فِي الْكِتَابِ فَقَهِيْهِ مِنْ اَنْهُ لَارْبُوْ بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِيِّ فَلَا يَسْتَلِزُمُ ابَاحَةَ الْمَالِ ابَاحَةَ الْعَقْدِ وَاللَّهُ اعْلَمُ.

یعنی مال کی اباحت سے عقد کی اباحت لازم نہیں آتی۔

### حضرت تھانویؒ کی رائے کی دلیل

فرمایا الہامی تحقیق کے طور پر ایک بات لکھ لو، وہ یہ کہ حدیث شریف، میں جو آیا ہے کہ

”لَارْبُوْ بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِيِّ فِي دَارِ الْحَرْبِ“

اس سے ربا کے جواز پر استدلال نہیں کر سکتے کیونکہ اس قسم کی ترکیب کے دو مطلب ہوا کرتے ہیں ایک تو یہ کہ لا مضائقہ فیہ (یعنی اس میں کوئی مضائقہ نہیں) دوسرے یہ کہ لا یتحقق حقیقتہ ولا یترتب جمیع احکامہ (یعنی سود کی حقیقت نہیں پائی جاتی اور اس کے جملہ احکام مرتب نہیں ہوتے) مثلاً اس ربا کے یہ معنی ہوں گے کہ ان میں ربا کی حقیقت ہی مرتب نہیں تو اس کا اثر زائد سے زائد یہ ہوگا کہ اس پر تمام احکام مرتب نہ ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ اس (رقم) کا واپس کرنا واجب نہ ہوگا۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ربا کے دوسرے آثار بھی مرتب نہ ہوں مثلاً اگر ہونا کہ اس کا تحقق ربا کی حقیقت نہ پائے جانے کے باوجود بھی ہوگا۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ خود فقہاء نے بھی لا ربو' بین العبد و سیدہ (یعنی غلام اور اس کے آقا کے درمیان سود نہیں ہوتا) میں ربو' کی حقیقت کا نہ پایا جانا تسلیم کیا ہے لیکن صورۃ سودی معاملہ کے ارتکاب سے دونوں گھنگار ہوں گے۔

اس کی نظریہ ہے کہ لاصلوۃ الابظہور (پاکی کے بغیر نماز نہیں ہوتی) اس میں نفی کے معنی یہی ہیں کہ بغیر وضو کے نماز کی حقیقت محقق نہ ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود اس طرح (بلا وضو) نماز کی ہیئت (تصورہ) بنانے سے اس پر گناہ ہوگا۔

اسی طرح لانکاح بین المحارم (محارم مثلاً ماں بہن کے درمیان نکاح نہیں) اس میں بھی یہی مراد ہے جس کا اثر یہ ہے کہ (نکاح کے بعد بھی) مہر اور نفقة واجب نہ ہوگا۔ لیکن نفس اس فعل سے گناہ ضرور ہوگا۔

اسی طرح لاصوم یوم عید (عید کے دن روزہ نہیں) اس میں بھی یہی ہے (کہ روزہ نہیں ہوگا اور صورۃ روزہ رکھنے سے گناہ ہوگا)

اسی طرح لارضاع بعد الفطام (یعنی دودھ چھڑانے کی مدت کے بعد رضاعت ثابت نہیں ہوتی) اس میں بھی یہی معنی ہیں۔ کہ رضاعت کی حقیقت کا تحقق نہ ہوگا چنانچہ حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی۔ لیکن مدت رضاعت کے بعد دودھ پلانے کا گناہ ضرور ہوگا۔

پس جب حدیث لا ربو' اخ اس معنی کو متحمل ہے اور خود احادیث میں اس کے موئیات و نظائر اس قدر موجود ہیں، تو اس حدیث سے ربو' کی حلیت (یعنی جائز ہونے) پر استدلال کافی نہیں ہوگا۔

## گنجائش کی صورت اور سودی رقم کا مصرف

۱:- مجبوری اور اشد ضرورت میں ان لوگوں کے قول پر عمل جو جواز ربو' فی دارالحرب کے قائل ہیں (یعنی حربی سے سود لینے کو جائز کہتے ہیں)

۲:- اگر غلطی سے روپیہ (بینک میں) جمع ہو چکا تو اخف المفسد تین (یعنی کم درجہ کا مفسدہ) یہ ہے کہ لے کر غرباء پر تقسیم کر دیا جائے۔

۳:- بعض علماء کے نزدیک اس کا لینا جائز ہے اگر اس قول پر عمل کر لیا جائے گنجائش ہے اور بہتر ہے کہ امداد مجرمین (یعنی..... زخمی مفلس، بحال بھائیوں کی مدد) میں دے دیا جائے، انشاء اللہ تعالیٰ گناہ نہ ہوگا۔

## شرعی دلیل

وَفِي الْمَقَامِ تَفْرِيعَانِ لِطَيْفَانِ يَتَعْلَقُانِ بِقَصَّةِ مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ  
مَبِينَانِ عَلَىٰ كَوْنِ مَا قَصَّ اللَّهُ وَرَسُولُهُ عَلَيْنَا مِنْ غَيْرِ نَكِيرٍ حِجَّةً لَنَا:  
أَحَدُهُمَا إِبَاحَةُ مَالِ الْحَرْبِيِّ بِرَضَاهُ وَلَوْ بِعَقْدٍ فَاسِدٍ فَانِ اسْتِيْجَارُ الْأَمْرِ  
لِأَرْضَاعِ إِلَّا بِعَقْدٍ فَاسِدٍ وَهُوَ مَذْهَبُ الْحَنِيفَةِ. (بِوَادِرِ النَّوَادِرِصِ ۱۰۸/)

ترجمہ:- دولطیف مسئلے جو موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے متعلق ہیں اور اس اصل پر مبنی ہیں کہ جس قصہ کو اللہ و رسول نے بغیر نکیر کے بیان فرمایا ہو وہ ہمارے لئے جھٹ ہے ان میں سے ایک مسئلہ جو حربی کے مال کی اباحت کا ہے۔ جب کہ اس کی رضامندی کے ساتھ ہو اگرچہ عقد فاسد کے واسطے سے ہو۔ کیونکہ حقیقی بیٹھ کو دودھ پلانے کی اجرت کا معاملہ (یعنی مال اپنے بیٹھ کو دودھ پلانے کی اجرت لے یہ معاملہ) فاسد ہے (ابوحنیفہ کا یہی مذہب ہے)۔

## سوال و جواب

سوال:- سرکاری ملازمین جو قوانین شریعت کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں ان کی تحریک  
حلال ہے یا مشتبہ؟

الجواب:- فی نَفْسِهِ تَوْمَثَتْ بِهِ (لکونہ عوضاً عما یوافق و عملاً یوافقہ)  
لیکن اباحت مال غیر مسلم و غیر ذمی کی بنا پر (یعنی غیر مسلم و غیرہ ذمی کا مال مباح ہے) اس وجہ  
سے خفیہ کے نزدیک طیب ہے۔

ایک وکیل صاحب نے دعوت کی..... حضرت نے فرمایا وکالت کی آمدنی میں خود  
فقہاء کو کلام ہے خواہ مقدمات سچ ہی آتے ہوں۔ اور جھوٹے مقدمات میں تو کسی کو اس  
کے ناجائز ہونے میں کلام نہیں مگر ہندوؤں سے آمدنی کا حصہ زیادہ آتا ہے۔ اور امام  
صاحب کے نزدیک کافر غیر ذمی سے اس کی رضامندی سے اس کا مال لینا درست ہے۔ اس  
لئے امام صاحب کے اس قول پر فتویٰ کی رو سے کھانا جائز ہے۔

## حربیوں سے سود لینے کے متعلق حضرت تھانویؒ کی سب سے آخری تحریر

تكلموا في امثال هذا المعاملات هل يكون العقد موثماً والمال مباح  
ام يباحان جميعاً فبعض العلماء ذهب إلى الأول..... في تعذير  
الأخوان عن مولانا محمد يعقوب في تاویل قول الامام بجواز  
الربافي. دارالحرب ان معناه لواخذ مسلم درهمین بدرهم من  
الحربی في دارالحرب لم يتعرض له الامام كمالاً يحده اذا زنى في  
دارالحرب وحاصله الجواز قضاء لا ديانة فحل المال لا يقتضي حل  
العقد لان حلة ليس مستفادا من العقد بل من جهة اخری فيكون  
العقد موثماً واجاب خصمهم بان محمدآ قد صرحا بجواز العقد في  
غير موضع من السیر الكبير..... واکثر العلماء ذهب الى الثاني  
مستدلين بعبارات غير فارقه بين العقد والمال. والله اعلم.

(۲۵ ذی الحجه ۱۳۵۵ھ)

(ترجمہ): فقہاء نے اس قسم کے مسائل میں بحث کی ہے کہ آیا عقد ربو (یعنی دارالحرب  
میں حربی سے سود لینے کے لئے کوئی عقد کرنا) گناہ ہے اور وہ مال مباح ہوگا۔ یا عقد اور مال دونوں  
ہی مباح ہوں گے۔ بعض علماء اول کے قائل ہیں (یعنی یہ کہ مال تو مباح لیکن عقد ناجائز ہوگا)  
اور تحریر الاخوان میں مولانا محمد يعقوب صاحبؒ سے منقول ہے کہ امام صاحب کے اس قول کا  
مطلوب ”کہ دارالحرب میں سود جائز ہے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی حربی سے  
دارالحرب میں ایک درہم کے عوض دو درہم لے لے تو حاکم اس سے تعرض نہ کرے گا۔ جس  
طریقے سے کہ دارالحرب میں اگر کوئی زنا کر لے تو امام اس پر حد ناجاری نہ کرے گا۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ قضا تو جائز ہے دیانتا جائز نہیں۔ مال کے حلال ہونے سے عقد  
کا حلال ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ مال کی حلت عقد کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسری جھت سے

ہے۔ لہذا عقد تو موجب گناہ یعنی ناجائز ہو گا۔

دوسرے فریق (یعنی مال کے ساتھ عقد کے بھی قائمین جواز) نے اس کا جواب دیا کہ امام محمدؐ نے سیر کبیر میں متعدد مواقع میں عقد کے جواز کی بھی تصریح فرمائی ہے اور اکثر علماء فقہاء نے دوسرے مسلک کو اختیار کیا ہے (یعنی یہ کہ مال کے ساتھ عقد بھی جائز ہے) اور وہ استدلال کرتے ہیں ان فقہی عبارات سے جس میں عقد و مال کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ واللہ اعلم۔ (بیاض اشرفی)

### مشہور شخصیت سے مسلمان نہ کرانا چاہئے

تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ ایسے موقع پر غیر مشہور شخص مسلمان کر لے۔ مشہور شخص مسلمان نہ کرے۔ اس میں یہ مصلحت ہے کہ کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔

میری توہر حالت میں یہی رائے ہے کہ مشہور ہستیوں سے ایسے کام نہ لینے چاہئیں اس میں فتنے کا احتمال ہے۔ دشمنی بڑھے گی، سوتے ہوئے فتنہ کو جگانا ہے۔ اور غیر مشہور ہستیوں میں یہ فتنہ نہیں۔ کسی کو توجہ بھی نہیں ہوتی کہ کیا ہورہا ہے۔ (الافتراضات الیومیہ ص ۳۱/۲)

### صیانتہ اسلامیین

### اسلامی تنظیم چلانے کا مفید و ستور اعمال

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بات میں کہ آج کل مسلمانان ہندق جن پر بیشانیوں میں بٹلا ہیں اور آئندہ اس سے زیادہ بٹلا ہونے کا خطرہ ہے ان سے خود محفوظ رہنے اور دوسرے بھائیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک جماعت نے ایک مجلس قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کی دفعات حسب ذیل ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دفعات شریعت مطہرہ کے خلاف تو نہیں تاکہ ایسی دفعہ کو بدل کر شریعت کے موافق کر لیا جاوے۔ وہ دفعات یہ ہیں۔  
۱:- احکام شرعیہ پر پورے اہتمام سے عمل کرنا اور جن اعمال پر قدرت نہ ہوان میں معذوری ہے۔  
۲:- دوسروں کو ان احکام کی اور ان کی پابندی کی تبلیغ کرنا۔

۳:- خصوص احکام ذیل جن کو خاص دخل ہے حفاظت مقصودہ میں وہ احکام یہ ہیں۔  
 اسلام پر قائم رہنا، علم دین سیکھنا اور سکھانا، قرآن مجید کا پڑھنا، پڑھانا اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت درجہ عشق میں رکھنا، تقدیر پر ایمان لانا اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا، دعا مانگنا، نیک لوگوں کے پاس بیٹھنا، اور جوان میں گزر گئے ہیں ان کے اچھے حالات کی کتابیں پڑھنا یا سننا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا پڑھنا یا سننا، مسلمانوں کے حقوق کا خاص خیال رکھ کر ادا کرنا، اپنی جان کے حقوق ادا کرنا، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ حکام کا مقابلہ نہ کریں بلکہ تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کر دیں اگر حسب مرضی انتظام نہ ہو صبر کریں اور اگر کسی مخالف کی طرف سے کوئی شورش ہو تو حکام ہی کے ذریعہ سے اس کی مدافعت کریں پھر خواہ وہ خود انتظام کر دیں خواہ تم کو انتقام کی اجازت دے دیں نیز جان کے حقوق میں یہ بھی داخل ہے کہ ورزش کریں حدود قانون کے اندر فن سپہ گیری سیکھیں، نماز کی پابندی رکھنا، ضرورت کے مقام پر مسجد بنانا کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا، زکوٰۃ دینا، نیز دوسرے نیک کاموں میں خرچ کرنا، روزے رکھنا، حج کرنا، اور اگر وسعت یا ہمت ہو روضہ شریف کی زیارت بھی کرنا، قربانی کرنا اور اگر اس میں کوئی روک ٹوک کرے تو اس دستور العمل کو اختیار کریں جو ابھی اپنی جان کے حقوق میں مذکور ہوا آمدی اور خرچ کا انتظام رکھنا، نکاح سے نسل بڑھانا، دنیا سے دل نہ لگانا، گناہوں سے بچنا، صبر و شکر کرنا، صبر میں یہ بھی داخل ہے کہ جہاں شریعت کا حکم ہو وہاں مالی یا جانی کیسی ہی تکلیف ہو اس کو برداشت کرنا، مشورے کے قابل امور میں مشورہ لینا، باہم محبت و ہمدردی و اتفاق رکھنا، امتیاز قومی یعنی اپنا لباس اپنی وضع اپنی بول چال اپنا بر تاؤ وغیرہ وغیرہ مذہب والوں سے الگ رکھنا (ان اعمال کی تفصیل رسالہ حیوۃ اُسلمین میں کی گئی ہے جو قابل ملاحظہ ہے)۔

۴:- طریق عمل احرقر کے ذہن میں یہ ہے کہ جس جگہ جس جماعت کو گوہ قلیل ہی ہو تو فیق ہوا یک مجلس بنانے کر ان احکام پر عمل کرنے اور کرانے کی کوشش شروع کر دیں۔

۵:- سہولت نظم کے لئے اس مجلس کا کوئی لقب بھی تجویز کر لیا جائے مثلاً صیانت اُسلمین یا اور کچھ اور باقاعدہ اس کے کچھ عناصر بھی مقرر کر دیجئے جاویں۔ جن کی خدمت کا

کوئی معاوضہ نہ ہو گا۔

۶:- یہ عناصر تین قسم کے ہوں گے۔ ایک ارکان، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا مشورہ مجلس کے کام کے لئے شرط ہو گا اور کن کا چندہ گزار ہونا شرط نہیں دوسرے معین، یہ چندہ گزاروں کا القب ہو گا۔ تیسرا عامل، یہ ان لوگوں کا القب ہو گا جو نہ مشیر ہیں نہ چندہ گزار بلکہ محض بلا معاوضہ اپنی خدمات مجلس کے لئے وقف کرتے ہیں اور مجلس کی طرف سے جو خدمت ان کے سپرد کی جاوے وہ اس کو حبہ اللہ بجالاتے ہیں۔ ان تینوں عناصر کا تعلق باضابطہ ہے۔ چوتھے تین ہیں جو محض خیرخوابی و دعا میں مشغول ہیں اور کوئی مناسب رائے خیال میں آتی ہے اس کی اطلاع مجلس میں کرتے ہیں اس طبقہ کا تعلق باضابطہ نہیں۔

۷:- طبقہ ارکان میں سے ایک شخص کو اس مجلس کا صدر تجویز کیا جاوے جس کا انتخاب ارکان کے اتفاق سے ہو گا۔

۸:- ارکان کا عدد بہت زیادہ ہونا چاہئے بلکہ ہر مقام پر ایسا عدد ہو جن کا اجتماع مشورہ کے لئے سہل ہو خواہ وہ مقامی ہوں یا پریونی ہوں مگر ضرورت کے وقت بہولت جمع ہو سکتے ہوں۔ اور بقیہ تین طبقوں کی تعداد کی کوئی حد نہیں۔

۹:- جدید رکنیت کے لئے قدیم ارکان کی متفقہ منظوری شرط ہے جس میں وہ مختار ہیں اور بقیہ تین عناصر کی خدمات کا قبول کر لیں ارکان کے ذمہ لازم ہے الا لمانع شرع مفوض الی را یہم۔

۱۰:- ایک شخص دو خدمتیں لے کر دو طبقوں میں بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔

۱۱:- کوئی شخص خود رکنیت کی درخواست نہ کر سکے گا بلکہ ارکان سابق خود اس سے رکنیت کی درخواست کریں گے اور معین اور عامل خود درخواست کر سکتے ہیں ان کی درخواست پر ان کو ایک فارم دیا جائے گا جن میں ان کا اپنा� نام و نشان اور و عدہ خدمت لکھنا ہو گا جس کا نقشہ ارکان تجویز کر سکتے ہیں اور یہ سب فارم مجلس میں محفوظ رہیں گے اور تین خود بھی درخواست کر سکیں گے اور ان سے بھی درخواست کی جاسکتی ہے۔ مگر یہ سب زبانی ہو گی اور اگر کسی جانب سے بھی خالص درخواست نہ ہوتی بھی ہر مسلمان سے عام درخواست اس وقت کی جاتی ہے کہ نیک مشوروں سے دعا سے اس مجلس کی مدد فرماتے رہیں۔

۱۲:- صدر اور رکن کا تقریبے اتفاق ارکان سے ہوا تھا اسی طرح ان کا عزل بھی اتفاق ارکان سے ہوگا۔

۱۳:- اور صدر اور رکن کا استعفاء کسی کی منظوری پر موقوف نہیں لیکن ان کا احسان ہوگا اگر دو ہفتے قبل اطلاع دے دیں۔

۱۴:- باشنا و قتی کاموں کے کوئی کام بدوں مشورہ نہ کیا جاوے۔

۱۵:- مشورہ کے لئے صدر اور تین مشوروں کا اجتماع کافی ہے۔ اگر صدر کو کچھ عذر ہو وہ قتی مشورہ کے لئے کسی رکن کو اپنا قائم مقام بنادے، اور اگر صدر سفر میں ہو خود ارکان کسی کو صدر کا قائم مقام بنالیں۔

۱۶:- اگر اہل شوری میں اختلاف ہو جاوے تو جس جانب صدر کی رائے ہو قطع نظر اقلیت یا اکثریت سے اس کو ترجیح ہوگی اور اگر اہل شوری اور صدر میں اختلاف ہو جاوے تو احتیاط کے پہلو کو ترجیح دی جائے گی۔ یعنی اگر امر متنازع یہ ایک رائے میں نافع مغض غیر محتمل الضرر ہو اور دوسری رائے میں نہ نافع ہونہ مضر، تو نافع والی رائے کو ترجیح ہوگی اور اس کام کو کر لیا جاوے گا اور اگر ایک رائے میں مضر ہو اور دوسری رائے میں نافع مگر غیر ضروری تو مضر والی کو ترجیح ہوگی اور اس کام کو ترک کر دیا جائے گا اور اگر ایک رائے میں مضر ہو، اور دوسری رائے میں نافع اور ضروری اور صرف یہ اختلاف اہم و اشد ہے تو صدر کی رائے کو ترجیح ہوگی۔

۱۷:- کوئی کام خلاف شرع نہ کیا جائے گا نہ کوئی رائے خلاف شرع قبول کی جائے گی اگر جواز و عدم جواز میں تردد ہو علماء سے استفتاء کیا جائے گا اگر انتخاب مفتی میں اختلاف ہو جائے یا علماء کے فتاوے میں اختلاف ہو جاوے تو صدر کے تجویز شدہ مفتی کا فتویٰ معمول بہ ہوگا لیکن جس رکن کو اس میں شرح صدر نہ ہو وہ عمل پر مجبور نہ کیا جائے گا اس کو سکوت اور اس کام میں شریک نہ ہونے کی اجازت دی جائے گی مگر مناقشہ کی اجازت نہ ہوگی اسی طرح کوئی کام خلاف قانون بھی نہ کیا جائے گا۔

۱۸:- اس مجلس میں شریک ہونے کے لئے کسی پر اصرار نہ کیا جاوے بہتر تو یہ ہے کہ تر غیب بھی نہ دی جائے لیکن اگر کسی مقام پر اس میں مصلحت ہو تو تر غیب میں مخاطب کی طیب

خاطر و انتشار قلب سے تجاوز نہ کیا جاوے صرف مجلس کے اغراض و مقاصد کی خصوصی یا عمومی اطلاع دی جاوے جو شخص خود یا جائز تر غیب سے شرکت کرے اس کو شریک کر لیا جاوے۔

۱۹:- اس مجلس کی طرف سے کچھ ملخص و اہل مبلغ بھی مقرر کئے جائیں کہ وہ احکام

شرعیہ کی عموماً اور احکام مذکورہ نمبر ۳ کی خصوصاً اشاعت کریں اور یہ تبلیغ بے خطاب عام ہوگی اور اس تبلیغ میں غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی بھی ترغیب دیا کریں اور مناظرہ وغیرہ کسی سے نہ کریں اگر کوئی خود درخواست کرے اس کو مناظرین کا پتہ بتلادیں۔

۲۰:- اس مجلس کی طرف سے کچھ فہیم و سلیم رضا کار بھی مقرر کئے جائیں کہ ان کا کام تبلیغ خطاب خاص ہوگا۔ مثلاً نمازوں کے وقت مشغولین غافلین کو نرمی اور محبت سے نماز کا یاد دلانا۔ کوئی شخص خلاف شرع کام کرتا ہو یا اس کا ارادہ کرتا ہوادیکھا جاوے جیسے بدکاری یا شراب خوری یا قمار بازی اس کو نرمی سے شرعی وعیدیں یاد دلا کر سمجھادینا لیکن اگر اس سے کوئی نہ مانے تو پھر اس پر مسلط ہو جانا یا کسی طرح سے زور دینا خواہ ختنی سے خواہ ہاتھ جوڑ کر یا راستہ میں لیٹ کر یہ مناسب نہیں بلکہ جب ناصح کی باضابطہ حکومت نہ ہو ایسا کرنا اکثر مضر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر یہ رضا کار کسی پر ظلم ہوتا ہوادیکھیں مثلاً کوئی شخص ایک مباح معاملہ کر رہا ہے۔ جیسے کپڑا خریدنا یا بیچنا اور دوسرا اس کو معاملہ نہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے تو یہ رضا کار اس مظلوم کی مدد کریں لیکن صرف مدافعت کی حد تک رہیں ظالم سے انتقام نہ لینے لگیں اسی طرح راستہ میں کسی حاجت مند کا بوجھ اٹھوادینا، کسی کو سوار ہونے میں مدد دے دینا کسی پیاسے کو پانی پلا دینا، کسی انجان کو راستہ بتلادینا، دو شخص لڑتے ہوں ان میں صلح کر دینا۔ یہ سب رضا کاروں کی خدمات ہیں اور اس مظلوم یا حاجت مند میں یہ نہ دیکھا جائے کہ یہ اپنے مذہب کا ہے یادوں رے مذہب کا سب کی مدد کرنا چاہئے۔ رضا کاری کے یہ شرائط ہیں۔ اسلام عقل بلوغ ذکورت، طالب علمی میں مشغول نہ ہونا خواہ علم معاش ہو، خواہ علم معاد ہو کسی کا ماتحت یا مازم نہ ہونا۔

۲۱:- ان مبلغین اور رضا کاروں کی کوئی امتیازی علامت بھی ہو تو قرین مصلحت ہے۔

۲۲:- یہ مبلغین اور رضا کار سب صدر مجلس کے ماتحت ہوں گے کوئی کام بدلوں اس کی اجازت کے نہ کر سکیں گے۔

۲۳:- یہ رضا کار روزانہ اور مبلغین مہانہ صدر کے پاس یا صدر جس کو اپنی نیاست میں اس کام کے لئے منتخب کر دے اس کے پاس جمع ہو کر اپنی کارگزاری کی اطلاع دیا کریں اور آئندہ کے لئے مناسب احکام حاصل کیا کریں اور مجلس کا جلسہ کم از کم مہانہ ہوا کرے جس میں ضروری مشورے طے ہوا کریں۔

۲۴:- ان مبلغین و رضا کاروں کی مالی خدمت کے لئے کچھ چندہ کا انتظام بھی کیا جاوے مگر اس میں شرعی حدود کا اہتمام واجب ہے اگر چندہ کم ہو کام مختصر پیانے پر کیا جاوے اور جن رضا کاروں کو دلچسپی ہوان کو دریش وغیرہ بھی سکھائی جاوے۔

۲۵:- اگر مجلس میں ایسے حضرات شریک ہو جائیں جو مسلمانوں کو دکان کھلوانے کا انتظام کر سکیں تو مجلس اس خدمت کو بھی اپنے فرائض میں داخل کرے۔

۲۶:- اور اگر مجلس میں ایسے حضرات شریک ہو جائیں جو مسلمانوں کی تکالیف کا چارہ کاریاں کے حقوق آئین اور تہذیب کے حدود میں رہ کر گورنمنٹ سے طلب کر سکیں تو مجلس اس خدمت کو بھی اپنے فرائض میں داخل کر لے۔

۲۷:- وقتاً فوقتاً مجلس کی کارگزاری مع حساب چندہ شائع ہونا چاہئے۔

۲۸:- اس کارگزاری کی عام روئاد بھی اور اس کی جزئیات وقتیہ خاص طور پر زبانی بھی حکام رس حضرت کے توسط سے حکام کو پیش کرتے رہیں تا کہ کسی مخالف کو بدگمانی پیدا کرنے کی گنجائش نہ ہو۔

۲۹:- اس مجلس کا مرکزی مقام دہلی ہو گا اور دوسرے مقامات پر اہل مقام کو اختیار ہے خواہ مستقل طور پر اپنے یہاں ایسی مجلس قائم کریں خواہ اس مرکزی مجلس کی شانخیں بنادیں اور شاخ بنانے کی صورت میں مرکز اور شاخوں کے باہمی تعلقات و حقوق و شرائط کے متعلق زبانی مشورہ کر لیا جاوے۔

۳۰:- شعبہ تبلیغ کے تحت میں مفید رسائی بھی حسب ضرورت و حسب وسعت وقتاً فوقتاً خرید کر مجلس میں محفوظ رہیں گے اور ایک خاص وقت میں عام..... مسلمانوں کو وہاں آ کر مطالعہ کی اجازت ہوگی اور اگر وسعت ہو تو ایسے رسائل چھپوا کریا خرید کر عام مسلمانوں میں شائع بھی ہو جایا

کریں گے مگر مجلس کے سرمایہ سے کوئی اخبار نہ خریدا جاوے گا۔ اگر کوئی مالک اخبار بلا معاوضہ بھیج دیا کرے یا ارکان یا غیر ارکان بطور خود خرید کر خواہ مجلس میں داخل کر دیں خواہ بطور خود مطالعہ کر کے استحضار واقعات سے مشورہ میں کام لیں اس کی اجازت ہے مگر ہر حالت میں یہ وصیت کی جاتی ہے کہ محض اخبار میں کسی واقعہ کے درج ہونے سے بدوں اذن شرعی کوئی اثر نہ لیں۔

۳:- چونکہ مذکورہ بالا کا رگزاریوں کے لئے ضبط کی بھی ضرورت ہو گی اس لئے مجلس میں ایک فہیم مستعد محترم کا مقرر کرنا بھی ضروری ہے جس کی خدمت کی نگرانی صدر کے یا جس کو صدر تجویز کر دیں اس کے ذمہ ہو گی۔ اسی طرح دفتر کے لئے ایک مکان کی بھی ضرورت ہو گی اور یہی مکان انعقاد مجلس کے بھی کام آؤے گا۔

نوت:- یہ مجلس خالص مذہبی ہے۔ سیاسیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں نہ کسی کو مدافعت میں نہ مخالفت میں اور حکومیں کا حکام سے اپنا جائز حق حدود قانون میں مانگنا سیاست نہیں جیسا جائز ملازمت کی درخواست کو کوئی شخص سیاست نہیں کہہ سکتا۔

الجواب:- یہ سب دفعات بالکل شریعت کے ایسے موافق ہیں کہ دلائل کی بھی حاجت نہیں لیکن چونکہ اس مجموعہ کی ضرورت اجتہادی ہے اس لئے اگر باوجود اعتقاد ان کے احسان کے ان کو عمل میں لانے سے کسی کو دچھپی نہ ہو اور وہ اپنے لئے ذوقاً یکسوئی کو اسلام سمجھے اور اس مسلک کو پسند کرے جس کو احرق نے رسالہ "معاملۃ اُسلمین" کے نوٹ نمبر ۲ میں اپنے لئے طریق عمل تجویز کیا ہے اس پر اس مجلس کی شرکت کے لئے اصرار نہ کیا جاوے۔ چنانچہ خود مجلس مسؤول عنہ کی دفعہ نمبر ۱۸ میں بھی اس کی تصریح کی ہے۔ اب اس جواب کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں۔

کتبہ اشرف علی

## انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

## انتخابات میں ووٹ اور امیدوار کی شرعی حیثیت

اسلام کا ایک بھی مجزہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری جماعت کبھی گراہی پر جمع نہیں ہوتی۔

ہر زمانہ اور ہر جگہ کچھ لوگ حق پرختنی سے قائم رہتے ہیں جن کو اپنے ہر کام میں حلال و حرام کی فکر اور خدا اور رسول کی رضا جوئی پیش نظر رہتی ہے پھر قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ آپ نصیحت کی بات کہتے رہیں کیونکہ نصیحت مسلمانوں کو نفع دیتی ہے۔ ”اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ انتخابات میں امیدواری اور ووٹ کی شرعی حیثیت اور ان کی اہمیت کو قرآن اور سنت کی رو سے واضح کر دیا جائے۔ شاید کچھ بندگان خدا کو تنبیہ ہو اور کسی وقت یہ غلط کھیل صحیح بن جائے۔

## امیدواری

کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لئے جو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہے ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے جس کا امیدوار ہے دوسرے یہ کہ وہ دیانت داری سے اس کام کو انجام دے گا اب اگر واقع میں وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہے، یعنی قابلیت رکھتا ہے اور امانت و دیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبے سے اس میدان میں آیا تو اس کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے اور بہتر طریق اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کر دے اور جس شخص میں اس کام کی صلاحیت ہی نہیں وہ اگر امیدوار ہو کر کھڑا ہو تو قوم کا غدار اور خائن ہے۔ اس کا ممبری میں کامیاب ہونا ملک و ملت کے لئے خرابی کا سبب تو بعد میں بنے گا، پہلے تو وہ خود غدار اور خیانت کا مجرم ہو کر عذاب جہنم کا مستحق بن جائے گا۔ اب ہر وہ شخص جو کسی مجلس کی ممبری کے لئے کھڑا ہوتا ہے اگر اس کو کچھ آخرت کی بھی فکر ہے تو اس میدان میں آنے سے پہلے خود اپنا جائزہ لے لے اور یہ سب سمجھ لے کہ

اس ممبری سے پہلے تو اس کی ذمہ داری صرف اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال تک محدود تھی کیونکہ بہض حدیث ہر شخص اپنے اہل و عیال کا بھی ذمہ دار ہے اور اب کسی مجلس کی ممبری کے بعد جتنی خلق خدا کا تعلق اس مجلس سے وابستہ ہے ان سب کی ذمہ داری کا بوجھ اس کی گردن پر آتا ہے اور وہ دینا و آخرت میں اس ذمہ داری کا مسئول اور جواب دہ ہے۔

## دوف و وہر

کسی امیدوار ممبری کو دوف دینے کی آز روئے قرآن و حدیث چند حیثیتیں ہیں ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ وہر جس شخص کو اپنا دوف دے رہا ہے اس کے متعلق اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت اور امانت بھی اور اگر واقع میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں اور وہر یہ جانتے ہوئے اس کو دوف دیتا ہے تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے۔ جو سخت کبیرہ گناہ اور وہ بال دنیا و آخرت ہے صحیح بخاری کی حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کا ذبہ کو شرک کے ساتھ کبائر میں شمار فرمایا ہے۔ (مشکلاۃ) اور ایک دوسری حدیث میں جھوٹی شہادت کو اکبر کبائر فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم) جس حلقے میں چند امیدوار کھڑے ہوں اور وہر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابل ترجیح ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو دوف دینا اس اکبر کبائر میں اپنے آپ کو بتلا کرنا ہے۔

”اب دوف دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر دوف دے محض رسمی مرودت یا کسی طبع و خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وہال میں بتلانہ کرے، دوسری حیثیت دوف کی شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ وہر اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے اس سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر وہر کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔“ جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے اس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور بری سفارش کرتا ہے۔ تو اس کی برائی میں اس کا بھی حصہ لگتا ہے، اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانت دار آدمی کی سفارش کرے جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے۔ اور بری سفارش یہ ہے کہ نا اہل، نالائق، فاسق، ظالم کی سفارش کر کے اس کو خلق خدا پر مسلط کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے دواؤں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے چیخ سالہ دور میں جو نیک یا بد عمل کرے گا ہم اس کے شریک سمجھے جائیں گے۔

وہر کی ایک تیسری حیثیت دکالت کی ہے کہ دوف دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور

وکیل بناتا ہے لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا اور اس کا یہ خود مدد دار ہوتا مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اس لئے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لئے دوست دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا دوست تین حیثیتیں رکھتا ہے۔ ایک شہادت دوسرے سفارش تیسرا حقوق مشترکہ میں وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح، قابل آدمی کو دوست دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں۔ اسی طرح نااہل یا غیر متدين شخص کو دوست دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

**ضروری تنبیہ:** مذکورالصدر بیان میں جس طرح قرآن وسنت کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو دوست دینا گناہ عظیم ہے اسی طرح ایک اچھے، نیک اور قابل آدمی کو دوست دینا ثواب عظیم ہے بلکہ ایک فریضہ شرعی ہے۔ قرآن کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے اسی طرح اچھی شہادت کو واجب و لازم بھی فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

كُونُواْقَوَّاْمِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ

كُونُواْقَوَّاْمِينَ يَا لِلْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ

ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ اچھی شہادت سے جان نہ چڑائیں، اللہ کے لئے ادا یا گنگی شہادت کے واسطے کھڑے ہو جائیں تیسرا جگہ سورۃ طلاق میں ارشاد ہے۔

ترجمہ:- "اللہ کے لئے اچھی شہادت کو قائم کرو۔"

ایک آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ

ترجمہ:- "اچھی شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے۔

ارشاد ہے۔

ترجمہ:- "شہادت کو نہ چھپا و اور جو چھپائے گا اس کا دل گناہ گار ہے۔"

ان تمام آیات نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا ہے کہ اچھی گواہی سے جان نہ

چنانیں۔ ضرور ادا کریں۔ آج جو خرابیاں انتخابات میں پیش آ رہی ہیں ان کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ نیک صالح حضرات عموماً ووٹ دینے ہی سے گریز کرنے لگے جس کا لازمی نتیجہ وہ ہوا جو مشاہدہ میں آ رہا ہے کہ ووٹ عموماً ان لوگوں کے آتے ہیں جو چند نکلوں میں خرید لئے جاتے ہیں اور ان لوگوں کے وٹوں سے جو نمائندے پوری قوم پر مسلط ہوتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ کس قماش اور کس کردار کے لوگ ہوں گے اس لئے جس حلقہ میں کوئی بھی امیدوار قابل اور نیک معلوم ہوا سے ووٹ دینے سے گریز کرنا بھی شرعی حرام اور پوری قوم و ملت پر ظلم کا مترا دف ہے اور اگر کسی حلقہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانت دار نہ ہو مگر ان میں کوئی ایک صلاحیت کا را اور خدا تری کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے غنیمت ہو تو تقلیل شر اور تقلیل ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دے دینا جائز بلکہ مستحسن ہے جیسا کہ نجاست کے پورے ازالہ پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تقلیل نجاست کو اور پورے ظلم کو دفع نہ کرنے کا اختیار نہ ہونے کی صورت میں تقلیل ظلم کو فقہاء حرمہم اللہ نے تجویز فرمایا ہے۔

مختصر یہ کہ انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام، اس میں محض ایک سیاسی ہار جیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے آپ جس امیدوار کو ووٹ دینے ہیں شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور علم و عمل اور دیانتداری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے جس کام کے لئے یہ انتخابات ہو رہے ہیں اس حقیقت کو سامنے رکھیں تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱:- آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعے جو نمائندہ کسی اسمبلی میں پہنچ گا وہ اس سلسلہ میں جتنے اچھے یا بے اقدامات کرے گا ان کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوگی۔ آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں برابر کے شریک ہوں گے۔

۲:- اس معاملہ میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ شخصی معاملات میں کوئی غلطی بھی ہو جائے تو اس کا اثر بھی شخصی اور محدود ہوتا ہے ثواب بھی عذاب بھی محدود۔ قومی اور ملکی معاملات سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے اس کا ادنیٰ نقصان بھی بعض اوقات پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے اس لئے اس کا ثواب و عذاب بھی بہت بڑا ہے۔

۳:- پچی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے۔ اس

لئے آپ کے حلقہ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظریہ کا حامل اور دیانتدار نمائندہ کھڑا ہے تو اس کو ووٹ دینے میں کوتا ہی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔  
۴:- جو امیدوار نظریہ اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے اس کو ووٹ دینا ایک جھوٹی شہادت ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

۵:- ووٹ کو پیسوں کے معادنے میں دینا بدترین قسم کی رشوت ہے اور چند نکلوں کی خاطر اسلام اور ملک سے بغاوت ہے۔ دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لئے اپنا دین قربان کر دینا کتنے ہی مال و دولت کے بد لے میں ہو کوئی داشمندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص سب سے زیادہ خسارے میں ہے جو دوسرے کی دنیا کے لئے اپنا دین کھو بیٹھے۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ

## عورت کی سربراہی

از حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ العالی

## عورت کی سربراہی کے متعلق

حضرت مولانا یوسف لدھیانوی صاحب کی خدمت میں

## ایک سوال اور حضرت کا جامع جواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الدين اصطفى

مکرم ومحترم جناب حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب مدظلہ العالی۔

السلام عليکم ورحمة اللہ وبرکاتہ۔

ناچیز نے آپ کے رسالہ عورت کی سربراہی پڑھا تھا جس سے اس موضوع سے متعلق خلجان دور ہو گیا تھا لیکن آج کے جنگ اخبار مورخہ ۱۲۵ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں مولانا کوثر نیازی صاحب نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا ہے جس کو پڑھ کر پھر کچھ پریشانی لاحق ہے، مولانا کوثر نیازی نے جو مثالیں عورتوں کی سربراہی کی رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور شجرۃ الدر کی دی ہیں وہ بے چاری عورتیں بہت ناکام اور مختصر عرصے کے لئے سربراہ رہیں۔ ان کی رقباتیں اور اخلاقی کمزوریاں، تاریخ دانوں کے لئے بہت اندوہ گیں ہیں۔ شیکسپیر کا قول ان پر صادق آتا ہے "Frailty! Thy name is Woman" "کمزوری! تیرانام عورت ہے۔" تینوں بڑی طرح قتل ہوئیں۔ مولانا کوثر نیازی کی زیادہ تر مثالیں اہل کفر کی ملکاوں کی ہیں جن کی مسلمان معاشرہ پر تطبیق درست نہیں۔

اہل علم حضرات تو چاہے ان کا تعلق علم دین سے ہو چاہے ان کا مطالعہ و مشاہدہ سینکڑوں ممالک کی ہزاروں سال کی تاریخ پر محیط ہو، مولانا کوثر نیازی کی مثالوں کو چند ان

گئی چنی دور از کار مستثنیات کا درجہ دیں گے۔ لیکن ہمارے مسلمان موصوف کی شرح تفسیر و حدیث سے ضرور شبہات کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس لئے آں جناب کا عوام الناس پر بڑا احسان ہو گا کہ اگر آپ مولانا کوثر نیازی صاحب کے فقہی ارشادات کی تصحیح فرمائیں۔

جزاکم اللہ احسن الجزاء ڈاکٹر شہیر الدین کراچی۔

جواب:- اس مضمون کا مختصر جواب روز نامہ جنگ کراچی ۶ نومبر ۱۹۹۳ء میں لکھ چکا ہوں۔ مفصل جواب حسب ذیل ہے۔

اس مسئلہ کے اہم ترین پہلو یہ ناکارہ اپنے رسالہ ”عورت کی سر برائی“ میں لکھ چکا ہے۔ اس کا مطابع غور و تدبر کے ساتھ ایک بار پھر کر لیجئے۔ انشاء اللہ شکوک و شبہات کا بھوت کبھی قریب نہیں پھٹکے گا اور ہمیشہ کے لئے اس ”آسیب“ سے نجات مل جائے گی۔ تاہم آں جناب کے خط کے حوالے سے مولانا کوثر نیازی کے مضمون پر گفتگو کرنے سے پہلے چند امور کا بطور اصول موضوعہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے۔

پہلا اصول:- جوں جوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بُعد ہو رہا ہے اور قرب قیامت کا دور قریب آ رہا ہے اسی رفتار سے فتنوں کی بارش تیز سے تیز تر ہو رہی ہے، ان فتنوں کے طوفان بلا خیز میں سفینہ نجات بس ایک ہی چیز ہے، اور وہ یہ کہ سلف صالحین کی تشریحات کے مطابق کتاب و سنت کا دامن مضبوطی سے تھام لیا جائے اور اس بارے میں ایسی اولوالعزمی اور ایمان کی چیختگی کا مظاہرہ کیا جائے کہ فتنوں کی ہزاروں آندھیاں بھی ہمارے ایمان و یقین کو متزلزل نہ کر سکیں، اور کتاب و سنت اور سلف صالحین کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ ”علیکم بدین العجائز۔“

دوسرہ اصول:- تمام فقہائے امت جو کتاب و سنت کے فہم میں جحت اور سند کا درجہ رکھتے ہیں اس پر متفق ہیں کہ کسی خاتون خانہ کو سر برائی مملکت بنانا حرام ہے، کیونکہ شرعاً وہ جس طرح نماز کی امامت کی صلاحیت نہیں رکھتی، جس کو امامت صغیری (چھوٹی امامت) کہا جاتا ہے، اسی طرح وہ امامت کبریٰ یعنی ملک کی سر برائی کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی، اگر کوئی مرد عورت کی اقتداء میں نماز ادا کرے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر عورت کو حاکم اعلیٰ بنادیا جائے تو

شرعاً اس کی حکومت لاٽ تسلیم نہیں ہوگی۔ اس سلسلہ میں اس ناکارہ نے اپنے رسالہ ”عورت کی سربراہی“ میں اکابر امت کے جو حوالے نقل کئے ہیں ان کو ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیجئے۔

تیسرا اصول:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان واجب الاذعان بحق ہے کہ ”وہ قوم ہرگز فلاح کو نہیں پہنچے گی جس نے زمام حکومت عورت کے پر دکر دی“ اس حدیث شریف کو تمام فقہائے امت اور اکابر ملت نے قبول کیا ہے، امامت و قضا کے مسائل میں اس سے استناد کیا ہے اور اسی پر اپنے اجماع و اتفاق کی بنیاد رکھی ہے۔ اور اصول یہ ہے کہ جس حدیث کو تمام فقہائے امت نے قبول کر لیا ہوا اور جس پر اجماع امت کی مہربنت ہو وہ جحت قاطعہ بن جاتی ہے اور ایسی حدیث کو ”حدیث متواتر“ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے امام ابو بکر حاصص رازی احکام القرآن (ص ۳۸۶ جلد اول) میں لکھتے ہیں۔

”جس خبر واحد کو تمام لوگوں نے قبول کر لیا وہ ہمارے نزدیک متواتر کے حکم میں ہے جس کی وجہ ہم کئی جگہ بیان کر چکے ہیں۔

پس ایسی حدیث جو سب کے نزدیک مسلم الثبوت ہوا س کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی اور نہ امت کے مسلم الثبوت مفہوم کو بدئے کی۔

چوتھا اصول:- دینی مسائل میں اجماع امت مستقل جحت شرعیہ ہے خواہ سند اجماع (یعنی قرآن و حدیث سے اس اجتماعی مسئلہ کا ثبوت) ہمیں معلوم نہ ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی، پس اجتماعی مسائل ”سبیل المؤمنین“ ہیں اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اپنانے کی کسی کے لئے گنجائش نہیں۔ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے ”اور جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہو لیا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اسکو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بڑی جگہ ہے جانے کی۔ (النساء ۱۱۵)

پس جو شخص اجماع امت کے خلاف کوئی نظریہ پیش کرے اس کا نظریہ لاٽ اتفاقات نہیں، ہر شخص کو ایسے نظریات سے پناہ مانگنی چاہئے جن کا نتیجہ دنیا میں اہل ایمان کے راستے سے انحراف اور آخرت میں جہنم ہو۔

پانچواں اصول:۔ دلائل شرع، جن سے شرعی مسائل کا ثبوت پیش کیا جائے، چار ہیں۔

(۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم (۳) اجماع امت (۴) ائمہ مجتہدین کا اجتہاد و استنباط۔ ان چار چیزوں کو چھوڑ کر کسی اور چیز سے شرعی مسائل پر استدلال کرنا صحیح نہیں۔

چھٹا اصول:۔ اللہ تعالیٰ نے دین قیم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور وعدہ خداوندی کے مطابق یہ دین اصولاً و فروعاً الحمد للہ آج تک محفوظ ہے اور انشاء اللہ قیامت تک محفوظ رہے گا۔ مختلف ادوار میں ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگوں نے دین کے مسلمہ مسائل میں نئی را ہیں نکالنے کی کوشش کی لیکن الحمد للہ ان کی کوششیں ناکام ہو گئیں ورنہ آج تک یہ دین مسخ ہو چکا ہوتا جس طرح پہلی قوموں نے اپنے دین کو مسخ کر دیا تھا آج بھی جو لوگ دین کے مسلمہ اجتماعی مسائل کو بدلنا چاہتے ہیں، اطمینان رکھئے کہ ان کی کوششیں بھی ناکامی سے ہمکنار ہوں گی اور اللہ کا دین انشاء اللہ جوں کا توں محفوظ رہے گا۔

ساتواں اصول:۔ مومن کا کام یہ ہے کہ اگر وہ گناہ سے نہ فجع سکتا ہو تو کم سے کم گناہ تو سمجھے، اور اگر کسی برائی کے خلاف جہاد نہ کر سکتا ہو تو دل سے برائی کو برائی ہی جانے یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے کسی گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھتا اور کسی برائی کو برائی سمجھنے کے بجائے اس کو بھلائی ثابت کرنے کی کوشش کرنا تقاضائے ایمان کے خلاف ہے اور یہ بڑی خطرناک حالت ہے۔

آٹھواں اصول:۔ جو شخص کسی غلطی میں مبتلا ہواں کا ناشا کبھی تو ناواقفی اور غلط فہمی ہوتی ہے اور کبھی اس کا ناشا "جہل مرکب" ہوتا ہے کہ آدمی کسی بات کو ٹھیک سے نہ سمجھتا ہو، مگر اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر وہ اس مسئلہ کو سمجھتا ہے، دوسرے نہیں سمجھتے۔ ان دونوں حالتوں میں چند درجہ سے فرق ہے۔ اول یہ کہ ناواقف آدمی حقیقت کی تلاش و جستجو میں رہتا ہے اور جو شخص جہل مرکب میں مبتلا ہو وہ باطل کو حق سمجھ کر حق کی تلاش سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

دوم یہ کہ ناواقف آدمی کو اگر صحیح مسئلہ بتا دیا جائے تو بصد شکر یہ اس کو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن جہل مرکب کا مریض چونکہ اپنے قلب میں قبول حق کی استعداد و صلاحیت نہیں رکھتا اس لئے وہ اپنی غلطی پر متنبہ پر اپنی اصلاح کرنے کی بجائے غلطی کی نشاندہی کرنے والوں پر خفا ہوتا ہے۔

"سو پوچھ لواہل علم سے، اگر تم کو علم نہیں۔" (الخل ۲۳)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا:  
”جب ان کو علم نہیں تھا تو انہوں نے کسی سے پوچھا کیوں نہیں؟ کیونکہ مرض جہل کا  
علاج تو پوچھنا ہے۔“ (ابوداؤ دص ۳۹ ج ۱)

لیکن ”جہل مرکب“ ایک لا علاج بیماری ہے، اس کا علاج نہ لقمان حکیم کے پاس ہے،  
نہ سقراط و بقراط کے پاس۔ دنیا بھر کے علماء و فضلاء، غوث قطب اور نبی و ولی اس کے علاج  
سے عاجز ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناواقفی و لاعلمی کا منشا تو غفلت ہے، سوتے کو جگا دینا اور  
بے علم کو آگاہ کر دینا ممکن ہے جب کہ ”جہل مرکب“ کا منشا کبر ہے، جو شخص ”جہل مرکب“  
میں مبتلا ہو، اس کو ”انا ولا غیری“ کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے، وہ اپنے کو عقل کل سمجھتا ہے اور  
اپنی رائے کے مقابلے میں دنیا بھر کے علماء و عقلااء کو بیچ سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کو کس دلیل اور  
کس منطق سے سمجھایا جائے اور کس تدبیر سے اسے حق کی طرف واپس لایا جائے؟

صحیح مسلم وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ  
ایسا شخص جنت میں داخل نہیں ہو گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر کبر ہو۔ عرض کیا  
گیا کہ یا رسول اللہ ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو، کیا یہ بھی کبر  
ہے؟ فرمایا نہیں یہ تو جمال ہے اللہ تعالیٰ خود صاحب جمال ہیں اور جمال کو پسند فرماتے ہیں  
کبیر یہ ہے کہ آدمی حق بات کو قبول کرنے سے سرکشی کرے اور دوسروں کو نظر حقارت سے  
دیکھے۔“ (مشکوٰۃ شریف ص ۳۳۳)

الغرض آدمی کا کسی شرعی مسئلہ میں ناواقفی کی بنا پر چوک جانا کوئی عار کی بات نہیں،  
بشرطیکہ یہ جذبہ دل میں موجود ہو کہ صحیح مسئلہ اس کے سامنے آئے تو اسے فوراً مان لے گا اور  
اس کے قبول کرنے سے عار نہیں کرے گا اور جو شخص حق کھل جانے کے باوجود اسکے قبول  
کرنے سے عار کرتا ہے وہ ”جہل مرکب“ میں مبتلا ہے اور اس کی بیماری لا علاج ہے۔ اللہ  
تعالیٰ ہر مومن کو اس سے پناہ میں رکھیں۔

ان اصول موضوعہ کے بعد گزارش ہے کہ مولانا کوثر نیازی کو مسئلہ کی صحیح نوعیت کے  
سمجھنے میں بہت سی غلط فہمیاں ہوئی ہیں اور موصوف نے مذکورہ بالا اصول موضوعہ کی روشنی

میں مسئلہ پر غور نہیں فرمایا اور نہ مسئلہ کے مالہ و مالیہ پر طاہر انہ نظر ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اگر موصوف نے سلامتی فکر کے ساتھ اس مسئلہ کی گہرائی میں اتر کر اس پر غور و فکر کیا ہوتا تو مجھے توقع تھی کہ ان کو غلط فہمیاں نہ ہوتیں۔

اس ناکارہ کا منصب نہیں کہ ان کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی گستاخی کرے اور ان کی بارگاہ عالی میں شناوائی ہو کیونکہ وہ آشیان اقتدار کے مکین، وزیر اعظم کے مشیر و ہمنشین اور صاحب سخنہائے دل نشین ہیں اور ادھر یہ ناکارہ فقیر بے نوا، زاویہ خمول کا گدا اور صاحب نالہ ہائے نار سا ہے۔

کب وہ سنتا ہے کہانی میری  
لیکن بزرگوں کا ارشاد ہے:

گاہ باشد کہ کوڈ نادان بہ غلط برہف زند تیرے  
اس لئے اپنے فہم نارسا کے مطابق کچھ عرض کرتا ہوں کہ صاحب موصوف کی بارگاہ  
میں شرف قبول پائے تو زہ سعادت ورنہ:

حافظ وظیفہ تو دعا گفتمن است و بس در بند آں میاں کہ نشید یا شنید  
بہر حال مولانا موصوف کو مسئلہ کی صحیح نوعیت کے سمجھنے میں جو مغالطے ہوئے یہ ناکارہ  
ان کو ایک ایک کر کے ذکر کرتا ہے۔ اور نتائج کا فیصلہ خود ان کے فہم انصاف پر اور اگر وہ داد  
انصاف نہ دیں تو اللہ تعالیٰ کی عدالت پر چھوڑتا ہوں۔

مولانا موصوف اپنے مضمون کی تمهید اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”۱۹۶۳ء میں صدر ایوب خاں اور محترمہ فاطمہ جناح کے درمیان صدارتی انتخاب کا معرکہ برپا ہوا تو صدر ایوب کے حامی بہت سے علمائے کرام نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ عورت کا صدر مملکت بننا حرام ہے، اس لئے محترمہ فاطمہ جناح کو دوٹ دینا جائز نہیں، اس پر میں نے جامع مسجد شاہ عالم مارکیٹ لاہور میں خطبہ دیتے ہوئے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی جو بعد میں ہفت روزہ ”شہاب“ لاہور میں شائع ہونے کے علاوہ ایک کتابچہ کی صورت میں بھی چھاپ دی گئی تھی، بعد میں پشتو اور سندھی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے اور یہ کتابچہ

لاکھوں کی تعداد میں ملک بھر میں پھیل گیا۔ میں نے اپنے اس خطبہ میں قرآن و حدیث اور تاریخ کے حوالوں سے علمائے کرام کے مذکورہ بالافتوئے کی "محل تردید" کی تھی۔ مزید تفصیل کے لئے رسالہ "عورت کی سربراہی" از مولا نا یوسف لدھیانوی ملاحظہ فرمائیں۔

### چند شبہات کا جواب

گذشتہ سطور میں ہم نے قرآن و حدیث اور ائمہ دین کے حوالوں سے واضح کیا ہے کہ عورت سربراہ حکومت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں بعض حضرات کی تحریروں میں اس سلسلہ میں چند شبہات کا اظہار کیا گیا ہے، مناسب ہو گا کہ علمی انداز میں ان پر بھی غور کر لیا جائے۔

### الرجال قوامون علی النساء پر شبہ

بعض حضرات سے آیت کریمہ الرجال قوامون علی النساء (النساء ۲۲) کے بارے میں فرمایا کہ یہ آیت صرف ازدواجی زندگی اور تدبیر منزل (گھر یو مسائل) کے بارے میں ہے، امور مملکت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے۔ شوہر کے اخراجات کا ذمہ عورت پر نہیں۔ اس کی وجہ عورت کو مرد سے وفادار رہنا چاہئے۔

ان حضرات نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ جب ازدواجی زندگی اور تدبیر منزل میں قرآن کریم نے مرد کو نگران اور حاکم اور عورت کو اس کے تابع اور مطیع قرار دیا ہے تو امور مملکت میں قرآن کریم عورت کو حاکم اور مردوں کو اس کا مطیع دفرمان بردار کیئے قرار دے سکتا ہے؟ اس نکتہ کی وضاحت یہ ہے کہ مرد و عورت، شریعت کے مقرر کردہ دستور کے مطابق ازدواجی رشتہ میں مسلک ہوتے ہیں تو اس سے ایک "گھر" وجود میں آتا ہے یہ انسانی تمدن کا پہلا زینہ ہے۔ یہیں سے تدبیر منزل (گھر یو مسائل) کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر چند گھروں سے مل کر ایک بستی آباد ہو جاتی ہے اور یہاں سے "سیاست مدینہ" کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ انسانی تمدن کا گویا دوسرا زینہ ہے۔ پھر چند شہروں کے مجموعہ سے ایک ملک وجود میں آتا ہے اور اس سے "امور مملکت" کی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔ یہ انسانی تمدن کا تیسرا مرحلہ ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی تمدن کے پہلے قدم اور پہلے مرحلہ پر ہی قرآن حکیم اعلان کر دیتا ہے، الرجال قوامون علی النساء گویا قرآن کریم کی نظر میں انسانی تمدن کے پہلے مرحلہ کا فطری نظام یہ ہے کہ مرد حاکم ہو اور عورت اس کی مطیع و فرمانبردار ہو۔ اس کے برعکس اگر عورت حاکم اور مرد اس کا مطیع و فرمانبردار ہو تو یہ نظام قرآن کریم کی نظر میں غیر صالح اور خلاف فطرت ہو گا۔ اب غور فرمائیے کہ جب تمدن کی پہلی اکائی اور اولین قدم پر عورت حاکیت کی صلاحیت نہیں رکھتی تو تمدن کے آخری زینہ (ملکی سیاست) میں عورت کی حاکیت کا مقام قرآن کریم کی نظر میں کیا ہو گا۔ آپ اسے مختصر الفاظ میں یوں تعبیر کر لجھئے کہ قرآن کریم جب ایک چھوٹے سے گھر میں (جس کی ابتدائی تشكیل صرف دو فراد سے ہوتی ہے) عورت کی حاکیت کو تسلیم نہیں کرتا تو کروڑوں انسانوں کی آبادی کے ملک میں عورت کی حاکیت کو کیسے تسلیم کر سکتا ہے؟

اور پھر ان حضرات نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا کہ عائلی زندگی میں مرد کی حاکیت کا اعلان کرتے ہوئے قرآن کریم نے اس کی پہلی وجہ مرد کی فضیلت قرار دی۔ بما فضل الله بعضهم علی بعض اس توجیہ و تغییل میں صراحةً کر دی گئی ہے کہ مرد کی حاکیت کا اصل سبب اس کی فضیلت ہے۔ لہذا جو معاشرہ مردوں اور عورتوں کے مجموعہ پر مشتمل ہو (جس کی بالکل ابتدائی شکل تبدیل منزل ہے اور اس کی آخری شکل سیاست ملکیہ ہے) (اس میں مرد بوجہ اپنی فضیلت کے حاکم ہو گا اور عورت اس کے تابع فرمان ہو گی) فالصلحت فنتت الایہ۔ اور مرد کی حاکیت کا دوسرا سبب یہ بیان فرمایا ہے کہ مردوں پر عورتوں کے مہر اور ننان و نفقة کی ذمہ داری ہے، عورتوں پر مردوں کے نان و نفقة کے ذمہ داری تو کیا ہوتی خود ان کے اپنے نان و نفقة کی ذمہ داری بھی ان پر نہیں ڈالی گئی، ایسا کیوں کیا گیا؟ اس لئے کہ کب معاشر کے لئے گھر سے باہر جانے اور کھلے بندوں پھرناں کی ضرورت ہے، اس کی صلاحیت صرف مرد رکھتا ہے، عورت اپنی صنفی خصوصیات کی بنا پر اس کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس لئے قرآن کریم ان کے نان و نفقة کی ذمہ داری مردوں کے کندھوں پر ڈال کر خود ان پر گھر میں رہنے اور حجاب و ستر اختیار کرنے کی پابندی عائد کر دیتا ہے۔

”وَقُرْنَ فِي بِيُوتِكُنْ وَلَا تَبْرُجْنَ تَبْرُجْ الْجَاهِلِيَّةِ الْأَوَّلِيِّ۔“ (الاحزاب ۳۳)

”اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو۔“ (ترجمہ: حضرت تھانوی)

اب الصاف فرمائے کہ جو قرآن گھر میں عورت کو حکمران تسلیم نہیں کرتا جو مرد کی فضیلت کا حوالہ دے کر اس کی حاکمیت کا اعلان کرتا ہے جو عورت کے نان و نفقہ کا بار مرد پر ڈال کر عورت پر حجاب و ستر اور گھر میں جم کر بیٹھنے کی پابندی عائد کرتا ہے، کیا یہ عقل و دانش کی بات ہوگی کہ وہی قرآن عورت کو ملک کی حاکم اعلیٰ بن کر سب کے سامنے بے جوابانہ گھونٹے پھرنے اور ساری دنیا کے لوگوں سے ملاقاتیں کرنے کی اجازت دے؟

الغرض آیت کریمہ مرد کی قوامیت کا اعلان کرتے ہوئے عورت کی حکومت و ولایت کی نفی کرتی ہے، اکابر امت نے آیت کا یہی مفہوم سمجھا ہے جیسا کہ متعدد اکابر مفسرین کے حوالے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ کی کتاب احکام القرآن کا حوالہ مزید پیش کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”القَوْمُ وَالْقِيمُ وَاحِدٌ وَالْقَوْمُ أَبْلَغٌ وَهُوَ الْقَائِمُ بِالْمُصَالِحِ وَالْتَّدْبِيرِ وَالْتَّدِيبُ وَعَلَلُ ذَالِكَ بِامْرِيْنِ وَهِبَيْ وَكَسْبَيْ فَقَالَ ”بِمَا فَضَلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ“ يَعْنِي فَضْلُ الرِّجَالِ عَلَى النِّسَاءِ فِي أَصْلِ الْخَلْقَهِ وَكَمَالِ الْعُقْلِ وَحَسْنِ التَّدْبِيرِ وَبِسْطَهِ فِي الْعِلْمِ وَالْجَسْمِ وَمُزِيدَ الْقُوَّهِ فِي الْأَعْمَالِ وَعَلَوَالاً سَتَعْدَادُ. وَلَذَالِكَ خَصُوا بِالنِّبَوَهِ وَالإِمَامَهِ وَالْقَضَاءِ وَالشَّهَادَهِ فِي الْحَدُودِ وَالْقَصَاصِ وَغَيْرِهِمَا وَوُجُوبِ الْجَهَادِ وَالْجَمَعَهُ وَالْعِيَدَيْنِ وَالْأَذَانِ وَالْحَطَبَهُ وَالْجَمَاعَهُ وَزِيَادَهِ السَّهَمِ فِي الْأَرْثِ وَمَا لَكِيَتِهِ النِّكَاحُ وَتَعْدَادُ الْمُنْكَوَحَاتِ وَالْأَسْبَدَادِ بِالْطَّلاقِ وَكَمَالِ الصَّومِ وَالصَّلُوَّهِ مِنْ غَيْرِ فَتُورِ وَغَيْرِهِ ذَالِكَ، وَهَذَا امْرُ وَهِبَيْ ثُمَّ قَالَ وَبِمَا انْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فِي نِكَاحِهِنَّ مِنْ الْمَهْوَرِ وَالنَّفَقَاتِ الرَّاتِبَهُ وَهَذَا امْرُ كَسْبَيْ.“ (احکام القرآن ج ۲، ص ۱۷۶)

”قوام اور قیم کے ایک ہی معنی ہیں اور قوام زیادہ بیلغ ہے قوام وہ ہے جو کسی کے مصالح،

تدبیر اور تادیب کا ذمہ دار ہو۔ ”مرد عورتوں کے قوام ہیں“ اس کی دو وجہیں ذکر فرمائی ہیں۔ ایک وجہی اور دوسری کبی چنانچہ فرمایا ”اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔“ یعنی اللہ تعالیٰ نے مردوں کو فضیلت دی ہے اصل خلقت میں، کمال عقل میں، حسن تدبیر میں، علم و جسم کی فراغی میں، اعمال کی مزید قوت میں اور استعداد کی بلندی میں اسی بناء پر درج ذیل امور مردوں سے مخصوص ہیں، نبوت، امامت، قضاحد و وقصاص وغیرہ پر شہادت دینا، وجوب جہاد، جموعہ، عیدین، اذان، خطبہ، جماعت، وراثت میں زیادہ حصہ ملنا، نکاح کا مالک ہونا، ایک سے زیادہ نکاح کرنا، طلاق دینے کا اختیار، بغیر وقفہ کے نماز روزہ کا پورا کرنا وغیرہ ذالک۔ اور یہ امر وہی ہے۔ پھر فرمایا ”اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں۔“ یعنی نکاح میں مہر اور ننان و نفقة مردوں پر لازم ہے اور یہ کبی امر ہے۔“

اگر کسی کو قرآن کریم کو اپنے خود ساختہ معنی و مفہوم پہنانے اور خود ہی اپنے ہنی خیالات کو قرآن کریم سے اگلوانے کی ضد ہو اس کا مرض تولا علاج ہے ورنہ قرآن کریم کا بالکل سیدھا سادھا مفہوم سامنے رکھئے اور پھر بتائیے کہ کیا قرآن مردوں پر عورت کی حاکیت کا اعلان کرتا ہے یا اس کے برعکس اس کا اعلان یہ ہے کہ ”مرد حاکم ہیں عورتوں پر۔“ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے معاشرہ میں مرد و عورت کے مقام و منصب کا جو تعین کیا ہے، اور خواتین کے بارے میں نکاح، طلاق، عدت اور ستر و حجاب کے جو تفصیلی احکام دیئے ہیں اگر کوئی شخص ان سے واقف بھی ہے اور ان پر ایمان بھی رکھتا ہے تو اسے یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ قرآن کریم کی خصوصی ہدایات کی روشنی میں عورت کے سربراہ مملکت و سربراہ حکومت بننے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں! جو شخصی احکام و ہدایات سے واقفیت ہی نہ ہو وہ بے چارہ اپنے جہل کی وجہ سے معذور ہے۔

”لَنْ يَلْفَحَ قَوْمٌ وَلَوَا امْرٌ هُمْ امْرَاةٌ“، پر شبہات

ا:- کیا یہ حدیث موضوع ہے؟

بعض حضرات نے حدیث نبوی ﷺ ”وَهُوَ قَوْمٌ هُرَّگَزْ فَلَاحُ نَهِيْسْ پَائِيْ گی جس نے

حکومت عورت کے پر دکر دی۔“ کو موضوع قرار دینے کی کوشش کی ہے، ان حضرات پر اس جبھی کی حکایت صادق آتی ہے جسے راستے میں کہیں آئینہ پڑا ہوا مل گیا۔ اسے اٹھایا تو اپنی مکروہ شکل نظر آئی اسے پھر پر مار کر توڑ دیا اور کہا کہ تو ایسا ہی بد شکل تھا تبھی تو تجھے کسی نے یہاں پھینک دیا۔ ان حضرات کو بھی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینہ میں اپنی شکل بھیا کن نظر آئی تو انہوں نے اس حدیث کو ہی مجرد حکرنے کی کوشش کی یہ حدیث نہ موضوع ہے نہ کمزور، بلکہ اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔ اس حدیث کے لئے درج ذیل کتابیں ملاحظہ فرمائیے۔

☆ صحیح بخاری جلد ص ۲۳ (باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کسری و قیصر۔ جلد ۲)

ص ۱۰۵۲، باب الفتنة التي تموج كموح البحر

☆ نسائی جلد ۲ ص ۳۰۳ (باب النبی عن استعمال النساء في الحرم)

☆ ترمذی جلد ص ۱۵ (قبیل ابواب الرؤیا)

☆ مسند رک حاکم جلد ۲ ص ۱۱۹

☆ سنن کبری للبیهقی جلد ۳ ص ۹۰ باب لا یاتم رجل بامراة جلد ۱ ص ۱۸ باب لا یولی الاولی امراة (لخ)

☆ مسند احمد جلد ۵ ص ۳۸، ۳۷، ۳۳، ۵۱۔

اس حدیث کا صحیح بخاری میں ہونا ہی اس کی صحت کی کافی ضمانت ہے امام حاکم اس کو نقل کر کے ”صحیح علی شرط الشیخین“ فرماتے ہیں۔ اور امام ذہبی تخلیص مسند ک میں اس کو صحیح علی شرط الشیخین تسلیم کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس حدیث کو بے شمار ائمہ حدیث اور فقہائے امت نے نقل کیا، اس سے اہم ترین مسائل کا اتھر اخراج کیا ہے مگر کسی نے کبھی یہ بحث نہیں اٹھائی کہ یہ حدیث صحیح بھی ہے یا نہیں؟ آج اس حدیث کی صحت کے بارے میں وہ لوگ شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں، جو ابو بکر اور ابو بکرہ کے درمیان فرق نہیں کر سکتے اور یہ م Hispan اس لئے کہ ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خواہش نفس کے خلاف ہے، اسی مضمون کی دوسری حدیث مسند رک حاکم (جلد ۲ ص ۲۹۱) میں ہے:

”عن ابی بکرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتاه بشیر یشرہ بظفر خیل له وراسہ فی حجر عائشہ رضی اللہ تعالیٰ

عنها، فقام، فخر لله تعالى ساجداً فلما انصرف انساء يسأل الرسول، فحدثه، فكان فيما حدثه من امر العدو: وكانت تلיהם امراة فقال النبي صلی اللہ علیہ وسلم هلکت الرجال حين اطاعت النساء. ”

(قال الحاکم هذا صحيح الاسناد ولم يخر جاه واقره الذهبي)

”حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قاصد اس لشکر کی کامیابی کی خوشخبری لے کر آیا جو آپ نے کسی مہم پر بھیجا تھا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا۔ آپ اٹھے اور خوشخبری سن کر سجدہ شکر بجالائے۔ سجدہ سے اٹھے تو قاصد سے حالات دریافت فرمانے لگے۔ اس نے دشمن کے حالات بتاتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ ان کی حکمران ایک عورت تھی، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہلاک ہو گئے مرد جب انہوں نے عورتوں کی ماتحتی قبول کر لی۔“

امام حاکم اس حدیث کی تخریج کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، امام ذہبی حاکم کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

۲: کیا ابو بکر بن العربي نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے:

ایک صاحب نے تو اس حدیث کو موضوع ثابت کرنے کے لئے ایک بہت بڑے فقیہ و محدث قاضی ابو بکر ابن العربي نے اپنی کتاب کا حوالہ بھی دے ڈالا، وہ لکھتے ہیں:

”علامہ ابو بکر ابن العربي نے اپنی کتاب ”عواصم القواسم“ میں اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کی احتجاجی مہم کو ان کا غلط فیصلہ ثابت کرنے کے لئے یہ حدیث وضع کی گئی۔“ (روزنامہ جنگ کراچی ص ۲۲، ۸۸ دسمبر ۱۹۸۸)

جن حضرات نے قاضی ابو العربي (المتومنی ۵۳۳ھ) کی ”العواصم من القواسم“ کا مطالعہ کیا ہے انہیں معلوم ہو گا کہ اس پوری کتاب میں زیر بحث حدیث کا کہیں ذکر نہیں آیا اور جس حدیث کا کتاب میں ذکر ہی نہ آیا ہو اس پر کلام کرنے یا اس کو موضوع و محرود قرار دینے کا کیا سوال؟ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قصہ میں قاضی ابو بکر ابن العربي نے حدیث جواب کو ذکر کر کے اس کے بارے میں لکھا ہے؟

”وَمَا الَّذِي ذَكَرْتُمْ مِنَ الشَّهَادَةِ عَلَى مَا الْحَوَابُ، فَقَدْ بُوْتُمْ فِي ذَكْرِهَا بِأَعْظَمِ حَوْبٍ، مَا كَانَ قَطُّ شَيْءٌ مِمَّا ذَكَرْتُمْ، وَلَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَالِكَ الْحَدِيثُ.“ (العواصم من القواصم ص ۱۶۱)

”أُوْرَيْه جوْتُمْ نَمَّ مَاحَوَابُ“ پڑھادت کا ذکر کیا ہے، اس کو ذکر کر کے تم نے سب سے بڑے گناہ (جمهوی شہادت) کا ارتکاب کیا ہے، جو واقعہ تم نے ذکر کیا ہے وہ کبھی ہوا ہی نہیں اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث کبھی ارشاد فرمائی۔“

مضمون نگار کی اس خیانت و بد دیانتی اور بہتان طرازی کی داد دیجئے کہ مغض جھوٹا اور صریح غلط حوالہ دے کر ایک صحیح حدیث کو (نَعُوذُ بِاللَّهِ) موضوع ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مضمون نگار نے صحیح حدیث کو رد کرنے کے لئے قاضی ابو بکر بن العربي پر جو بہتان باندھا ہے اس کی تردید کے لئے خود قاضی ابو بکر کی اپنی تصریحات کافی ہیں قاضی ابو بکر العربي اپنی کتاب احکام القرآن میں سورۃ النمل کی آیت ۲۳ کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

”فِيهَا ثَلَاثٌ مَسَائِلٌ ..... الْمَسَالَةُ الْثَالِثَةُ: رُوَا فِي الصَّحِيفَةِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حِينَ بَلَغَهُ أَنَّ كَسْرَى لِمَامَاتٍ وَلِيَ قَوْمَهُ ابْنَتَهُ “لَنْ يَفْلُحَ قَوْمٌ وَلَوْ أَمْرَهُمْ امْرَأَةٌ“ ..... وَهَذَا نَصٌّ فِي أَنَّ الْمَرْأَةَ لَا تَكُونُ خَلِيفَةً وَلَا خَلَافَ فِيهِ۔“ القرآن ج ۳، ص ۱۳۵

”اس آیت میں تین مسئلے ہیں ..... تیسرا مسئلہ: صحیح بخاری میں روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ کسری کے مرنے پر اس کی قوم نے حکومت اس کی بیٹی کے حوالے کر دی تو آپ نے ارشاد فرمایا: ”وَهُوَ قَوْمٌ كَمَنْ فَلَاحُ نَمَّ بَيْنَ أَيْمَانِهِنَّ“ جس نے حکومت عورت کے سپرد کر دی۔“ اور یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلہ کی نص صریح ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی اور اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں۔“ اور شرح ترمذی میں قاضی ابو بکر بن العربي لکھتے ہیں۔

”ذَكْرٌ عَنِ ابْيِ بَكْرٍ قَوْلُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : “لَنْ يَفْلُحَ قَوْمٌ وَلَوْ أَمْرَهُمْ امْرَأَةٌ“ (العارضه) هذا یدل ان الولایہ للرجال، لیس لنساء فیها مدخل بالاجماع۔“ (عارضه الاحدوی بشرح صحيح الترمذی جلد ۹ ص ۱۱۹)

”امام ترمذی نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ ”وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے حکومت عورت کے پر دکر دی۔“ یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس اجتماعی مسئلہ کی دلیل ہے کہ حکومت مردوں کے ساتھ مخصوص ہے، عورتوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔“

آپ دیکھ رہے ہیں کہ دونوں کتابوں میں قاضی ابو بکر ابن العربي اس مسئلہ پر اجماع نقل کر رہے ہیں کہ عورت، حکومت کی سربراہ نہیں بن سکتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورالصدر ارشاد کو اس کی دلیل اور نص صریح قرار دے رہے ہیں۔

**کیا یہ حدیث عمومی حکم نہیں رکھتی؟**

انہی مضمون نگار صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے:

”علاوہ از یہی یہ حدیث ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتی ہے اس سے عمومی حکم ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔“

کس آیت اور حدیث سے عمومی حکم ثابت ہوتا ہے اور کس سے نہیں؟ اس کو ائمہ مجتہدین اور فقہاء امت بہتر سمجھتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ جو قاضی ابو بکر ابن العربي کی کتاب کے نام کی املا صحیح نہیں لکھ سکتے اور ”العواصم من القواسم“ کی جگہ ”عواصم القواسم“ لکھ جاتے ہیں اور جو ”ابن عربی“ اور ”ابن العربي“ کے درمیان فرق نہیں جانتے وہ کسی آیت یا حدیث کے عموم و خصوص کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں۔ اور اگر ہم اپنی ذاتی خواہش پر ایسے فیصلے صادر بھی کریں تو ہمارے علم و فہم اور ہماری دیانت و امانت کے پیش نظر ایسے فیصلوں کی کیا قیمت ہوگی؟ اہل علم اس سے خوب واقف ہیں۔ تجھب ہے کہ جو شخص ایک حوالہ بھی صحیح نقل نہیں کرتا، اور جو کتاب اور مصنف کے نام تک غلط لکھتا ہے وہ (تمام ائمہ فقہاء کے علی الرغم) حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اجتہاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ حکم عام نہیں بلکہ ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے۔

حالانکہ بہت موٹی سی بات ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حدیث میں صرف اہل ایران کے عدم فلاح کو بیان کرنا ہوتا تو اس کے لئے ایک لفظ کافی تھا یعنی ”لن یفلحوا“ (کہ یہ لوگ کبھی فلاح نہیں پائیں گے) اس چھوٹے سے مضمون کو ادا کرنے کے لئے

اتنا طویل فقرہ استعمال نہ فرمایا جاتا۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اس حدیث میں ”قوم“ کا لفظ نکرہ ہے جو سیاقِ لفظی میں واقع ہے اور یہ قطعی عموم کا فائدہ دیا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اول سے آخر تک تمام اہل علم نے اس حدیث سے بالاجماع یہ سمجھا ہے کہ یہ حکم عام ہے اور یہ کہ اس ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں یہ طے شدہ امر ہے کہ عورت حکومت کی سربراہ نہیں بن سکتی۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ ”اس میں عمومی حکم نہیں بلکہ ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے“ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھانے کی کوشش ہے، جسے کسی بھی طرح مستحسن نہیں کیا جاسکتا۔

**کیا خبر واحد حلال و حرام میں جحت نہیں؟**

یہی صاحب اپنے مضمون میں مزید لکھتے ہیں:

علاوہ ازیں یہ حدیث خبر واحد ہے۔ متواتر یا مشہور حدیث نہیں، خبر واحد سے حلال و حرام کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ کسی عمل کو مکروہ ثابت کیا جاسکتا ہے لیکن مکروہ اور جائز ایک دوسرے کے قریب ہیں۔“

اس عبارت میں تین دعوے ہیں اور تینوں غلط ہیں۔ موصوف کا یہ دعویٰ کہ حدیث خبر واحد ہے متواتر یا مشہور حدیث نہیں۔ ”اس لئے غلط ہے کہ اس حدیث کے مضمون پر امت کا اجماع ہے۔ جیسا کہ امام قرطبیؓ ابو بکر ابن المریؓ علامہ عبدالعزیز فرہارویؓ اور دیگر کابر کی تصریحات سے معلوم ہو چکا ہے اور جس حدیث پر امت کا اجماع ہوا اور امت نے اسے بالاتفاق قبول کیا ہو وہ حدیث جحت قطعیہ بن جاتی ہے اور اسے تواتر معنوی کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابو بکر جھاٹ اپنی بے نظیر کتاب ”احکام القرآن“ میں ایک حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقد استعملت الامه هذين الحدثين في نقصان العدة وان كان وروده من طريق الاحادفصار في حيز التواتر لأن ماتلقاه الناس بالقبول من اخبار الا حاد فهو عندنا في معنى المتواتر لما بيناه في موضع.“ (احکام القرآن جلد ۱ ص ۳۸۶)

”امت نے نقصان عدت کے مسئلہ میں ان دونوں حدیثوں سے استدلال کیا ہے، اگرچہ یہ

حدیث خبر واحد کے طریق سے وارد ہوئی ہے لیکن یہ متواتر کے درجہ میں ہے کیونکہ جس خبر واحد کو تمام لوگوں نے قبول کیا ہو وہ ہمارے نزدیک متواتر کے حکم میں ہے جس کی وجہ ہم کئی جگہ بیان کر چکے ہیں۔“ علامے اصول نے تصریح کی ہے کہ جب خبر واحد کے حکم پر اجماع ہو جائے تو حکم قطعی ہو جاتا ہے اور اس حدیث کے ثبوت و عدم ثبوت کی بحث ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحیم لکھنؤی نور الانوار کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

”وفائدة الاجماع بعد وجود السند سقوط البحث وصيرة الحكم

قطعيا۔“ (حاشیہ نور الانوار ص ۲۲۲)

”اور سنداجماع کے وجود کے بعد اجماع کا فائدہ یہ ہے کہ بحث ختم ہو جاتی ہے اور وہ حکم قطعی ہو جاتا ہے۔“

شیخ یحییٰ ہارون مصری، شرح منار ابن ملک کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

”وفائدة الاجماع بعد وجود السند سقوط البحث عن الدليل

وحرمه المخالفه وضروره کون الحكم قطعيا۔“ (شرح المنار و

حواث من الاصول جلد ۲ ص ۷۲۵)

”اور سنداجماع کے بعد اجماع کا فائدہ یہ ہے کہ دلیل کے بارے میں بحث ختم ہو جاتی ہے، اس کی مخالفت حرام ہو جاتی ہے، اور حکم بدیہی طور پر قطعی ہو جاتا ہے۔“

اوپر گزر چکا ہے کہ حدیث نبوی ملن یطلح قوم ولو امر ہم امراۃ کو تمام علمائے امت اور ائمہ دین نے قبول کیا ہے اور اس سے استدلال کرتے ہوئے بالاتفاق یہ فیصلہ دیا ہے کہ عورت حکومت کی سربراہ نبیین بن سکتی جس طرح نماز میں مردوں کی امام نبیین بن سکتی پس جب یہ حدیث تمام اہل علم اور ائمہ دین کے اجماع کی سند ہے تو اس کو خبر واحد کہہ کر رد کر دینا ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ساتھ ناروا گستاخی ہے اور دوسری طرف تمام ائمہ دین کے اجماع کو باطل قرار دینا ہے۔ امام فخر الاسلام بزدی فرماتے ہیں:

ومن انکر الاجماع فقد ابطل الدين کله لأن مدار اصول الدين کلها

ومرجعها الى اجماع المسلمين۔“ (اصول بزودی ص ۷۲۷)

”اور جس شخص نے اجماع کا انکار کر دیا اس نے پورے دین کو باطل کر دیا کیونکہ دین کے تمام اصول کا مدار و مرجع مسلمانوں کا اجماع ہی ہے۔“

مضمون نگار کا یہ دعویٰ کہ ”خبر واحد سے حلال و حرام کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہو سکتا“ قطعاً غلط اور مہمل ہے۔ جس شخص کو دین کی معمولی سوچھ بوجھ بھی ہو وہ جانتا ہے کہ دین اسلام کے بے شمار مسائل اخبار آحاد ہی سے لئے گئے ہیں۔ موصوف کے نظریے سے یہ تمام مسائل باطل قرار پائیں گے۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے بقول:

”ایں اعتقد نکنے مگر جا ہے کہ از جہل خود بے خبر است یا زندیقے کہ مقصودش ابطال شطر دین است۔“ (مکتوبات دفتر دوم مکتوب ۵۵)

خبر واحد کا جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں جھٹ ہونا اہل حق اور ائمہ ہدیٰ کا مسلم اصول ہے علم اصول کے مبتدی طلبہ کو بھی یہ فقرہ یاد ہو گا:

”خیر الواحد یوجب العمل لا العلم.“

”خبر واحد عمل کو واجب کرتی ہے۔ یقین کا فائدہ نہیں دیتی“۔

مضمون نگار کا تعلق اگر منکرین حدیث سے نہیں تو انہیں غلط سلط اصول گھڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو رد کرنے کی جرأت نہیں کرنی چاہئے تھی۔

موصوف کا تیرا دعویٰ یہ ہے کہ ”مکروہ اور جائز ایک دوسرے کے قریب ہیں۔“ یہ بھی غلط اور مغالطہ آمیز ہے۔ کیونکہ مکروہ کا لفظ کبھی حرام کے لئے بولا جاتا ہے، کبھی مکروہ تحریکی کے لئے اور کبھی مکروہ تنزیہ کے لئے۔ مکروہ تحریکی حرام کے قریب ہے اور مکروہ تنزیہ کے قریب ہے۔ علامہ شامیؒ مکروہات و ضوکے ذیل میں لکھتے ہیں:

”قوله ومکرھه) هو ضد المحبوب، قد يطلق على الحرام كقول القدورى في مختصره: ومن صلى الظهر في منزله يوم الجمعة قبل صلاة الإمام ولا عنز له كره له ذلك، وعلى المکروه تحريمها وهو ما كان إلى الحرام أقرب، ويسمي به محمد حراماً ظنناً. وعلى المکروه تنزيفها : وهو ما كان تركه أولى من فعله ويرادف خلاف الأولى كما قلمناه“ (شامی۔ رالمحتر جلد ۱ ص ۱۳۱)

”مکروہ کا لفظ محبوب کی ضد ہے۔ یہ کبھی حرام پر بولا جاتا ہے، کبھی مکروہ تحریکی پر، اور مکروہ تحریکی وہ ہے جو حرام سے قریب تر ہو۔ امام محمد (رحمۃ اللہ علیہ) اسی کو ”حرام ظنی“ فرماتے ہیں۔ اور کبھی مکروہ تنزیہ کی پر بولا جاتا ہے، اور مکروہ تنزیہ کی وہ ہے جس کا چھوڑنا اس کے کرنے سے بہتر ہو۔ اسی کو خلاف اولیٰ بھی کہتے ہیں۔“

اور مکروہ کا لفظ جب جائز و ناجائز کے باب میں مطلق بولا جائے تو اس سے مکروہ تحریکی مراد ہوتا ہے جیسا کہ علامہ شامیؒ نے کتاب الحظر والاباحت میں تصریح کی ہے۔ (جلد ۶ ص ۳۳۷)

اس لئے موصوف کا مطلق یہ کہنا ”مکروہ اور جائز ایک دوسرے کے قریب ہیں“ نہ صرف مغالطہ ہے بلکہ لوگوں کو مکروہات شرعیہ کے ارتکاب پر جری کرنے والا ہے۔

### ملکہ سبا کے قصہ سے استدلال

بعض حضرات نے ملکہ سبا کے قصہ سے جو قرآن مجید میں مذکور ہے، یہ استدلال کیا ہے کہ عورت حکومت کی سربراہ بن سکتی ہے۔ لیکن اس قصہ سے استدلال نہایت عجیب ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک مشرک قوم کی ملکہ تھیں جن کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے ”فہم لایہ جدون“۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت پر وہ آپ کے تابع فرمان ہو گئی تھیں اور کسی صحیح روایت میں یہ وارد نہیں ہے کہ ان کے اسلام لانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو حکومت پر برقرار رکھا تھا۔ امام قرطبیؒ نے اس سلسلہ میں اسرائیلی قصہ ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

”لَمْ يَرْدِفْهُ خَبْرُ صَحْيَحٍ لَا فِي أَنَّهُ تَزَوَّجُهَا وَلَا فِي أَنَّهُ زَوْجُهَا۔“

(قرطبی الباجع لاحکام القرآن جلد ۱۳ ص ۲۱۰، ۲۱۱)

”اس بارے میں کوئی صحیح روایت وارد نہیں ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے خود شادی کر لی تھی اور نہ یہ کہ کسی دوسرے سے شادی کر دی تھی۔“

جب تک کسی صحیح روایت سے یہ ثابت نہ ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو حکومت پر برقرار رکھا تھا تب تک یہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا کہ کم از کم حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں عورت کو حکومت کا سربراہ بنانا جائز تھا۔

علاوه ازیں انبیاء سابقین علیہم السلام کے واقعات سے استدلال اس وقت جائز ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں ہمیں اس سے کوئی مختلف ہدایت نہ فرمائی ہو۔ زیر بحث مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف ہدایت موجود ہے کہ عورت سربراہ حکومت نہیں ہو سکتی اور اسی پر امت محمدیہ کا اجماع ہے۔ جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا، اب اگر کسی قطعی دلیل سے یہ بھی ثابت ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو حکومت پر برقرار رکھا تھا تو ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع امت کے بعد اس سے استدلال کرنا صریح طور پر غلط ہو گا۔

حضرت اقدس مفتی محمد شفیع دیوبندی (سابق مفتی اعظم پاکستان) نے احکام القرآن میں اس آیت پر بہت نیس کلام فرمایا ہے جو بہت سے فوائد پر مشتمل ہے۔ یہاں اس کا ضروری اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

### المرأة لا تصلح تكون ملكة او اماماً

”فعلم ان المرأة لا تصلح ان تكون ملکه في شریعة محمد صلی الله علیہ وسلم وکان واقعہ بلقیس من عمل الكفورة فلا يحتاج به علی ما قاله الا لوسی. وان قيل ان اسلوب القرآن الحكيم في عامته مواضعه انه اذا ذكر فعلًا منكرًا من الكفار صرخ عليه بالانكار. فعدم الانكار عليه في هذه الاية لعله كان مشيرًا الى الجواز قلنا اولاً لا يعلم عموم ما قيل وثانياً لا يلزم ان يكون التصریح بالانكار في ذلك الموضع بل يکفى الانكار عليه في شیء من آیاته ولو في موضع آخر بل في حجته من حجج الشرعیة فاذا ورد الانكار عليه في حديث البخاری کفی لبيان کونه منکرًا كما یرشدک النظر في امثال هذه المواقع افاده شیخنا دامت عوارفه ویوید حديث البخاری مارواه الذهبی في تلخیص المستدرک عن ابی بکرۃ ان النبی صلی الله علیہ وسلم اتاہ بشیر ییشر بظفر خیل له وراسه في حجر عائشة رضی الله عنہا فقام فخر الله ساجداً فلما انصرف انشاء یسال الرسول فحدثه فکان فيما

حدّثه من امر العدو و كانت تليهم امرأة فقال النبى صلى الله عليه وسلم  
هلكت الرجال حين اطاعت النساء قال الذهبي صحيح.

(مصدرک ص ۱۹۱ ج ۲) (مفتی محمد شفیع۔ احکام القرآن جلد ۵ ص ۱۸)

## عورت ملکہ یا امام بنے کی صلاحیت نہیں رکھتی

(روح المعانی اور در مختار کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں) ”معلوم ہوا کہ محمد  
صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں عورت ملکہ بنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ بلکہ اس کا واقعہ  
کافروں کا عمل ہے لہذا اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ آلوئی نے کہا ہے۔ اور اگر  
کہا جائے کہ قرآن کریم کا انداز عام مقامات میں یہ ہے کہ جب وہ کفار کے کسی منکر فعل کا  
ذکر کرتا ہے تو اس پر صراحة انکار کرتا ہے، اس آیت میں اس فعل پر انکار نہ کرنا شاید جواز کی  
طرف مشیر ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ اول تو قرآن کریم کا جوا سلوب اور ذکر کیا گیا ہے اس کا عموم  
معلوم نہیں۔ علاوہ ازیں ضروری نہیں کہ انکار کی تصریح اسی موقع پر کر دی جائے بلکہ اس کی  
کسی آیت میں انکار کا پایا جانا کافی ہے۔ خواہ کسی دوسری جگہ ہو۔ بلکہ دلائل شرعیہ میں سے  
کسی دلیل میں انکار کا پایا جانا بھی کافی ہے۔ پس جب کہ صحیح بخاری میں عورت کی حکمرانی پر  
نکیر آچکی ہے، تو اس فعل کے منکر ہونے کو بیان کرنے کے لئے کافی ہے جیسا کہ اس قسم  
کے موقع میں نظر کرنا تمہاری رہنمائی کرے گا۔ یہ ہمارے شیخ (حضرت حکیم الامم مولانا  
محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ) دامت عوارفہ، کا افادہ ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث کی تائید  
تلخیص مسند کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے  
مردی ہے۔ (یہ حدیث اور گزر چکی ہے)۔

## حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے استدلال

بعض حضرات نے عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر جنگ جمل کے واقعہ سے استدلال  
کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جنگ جمل میں قیادت کی تھی۔ اور طلحہ و زبیر  
رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ نے ان کی قیادت کو تسلیم کیا تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نہ اس موقع پر خلافت و امارت کا دعویٰ تھا نہیں کسی مہم کے لئے کسی نے امیر منتخب کیا تھا، نہ اس کے سیاسی مقاصد تھے اور نہ وہ جنگ و قتال کے لئے نکلی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے موقع پر وہ دیگر امہات المؤمنین کے ساتھ حج پر گئی ہوئی تھیں۔ اکابر صحابہ وہاں جمع ہوئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ مادر مشفق کی حیثیت سے انہیں امت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو مجتمع کرنے اور ہولناک صورت حال کی اصلاح کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان کی لا تقدیم احترام شخصیت اس فتنہ کو فرو کرنے میں موثر کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس وقت نہ حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی امارت کسی کے گوشہ ذہن میں تھی اور نہ کسی کو خیال تھا کہ انہیں حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ و جہہ سے لڑا دیا جائے گا۔ چنانچہ بصرہ پہنچنے کے بعد جب قعقاع بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے تشریف آوری کا مقصد پوچھا تو انہوں نے فرمایا:

”اے بنی! لا صلاح بین الناس!“

بیٹا! میرے آنے کا مقصد لوگوں کے درمیان اصلاح کرانا ہے۔“

اور حضرت طلحہ و زیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ و جہہ کی مصالحتی گفتگو میں ”اصلاح بین الناس“ کا نقشہ مرتب بھی کر لیا گیا تھا۔ لیکن مفسدوں کو اس میں اپنی موت نظر آئی اور انہوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے ذریعہ رات کی تاریکی میں حملہ کر دیا اس طرح اصلاح کی مخلصانہ کوشش ”جنگ جمل“ میں تبدیل کر دی گئی۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

”فَانْ عَاشَهُ لَمْ تَقَاتِلْ وَلَمْ تَخْرُجْ لِقَاتِلْ وَانْمَا خَرَجَتْ بِقَصْدِ الْاِصْلَاحِ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ وَظَنَتْ اَنْ فِي خَرْجَهَا مَصْلَحَةً لِلْمُسْلِمِينَ..... وَلَمْ يَكُنْ يَوْمُ الْجَمْلِ لَهُوَ لَا قَصْدٌ فِي الْقَاتِلِ، وَلَكِنْ وَقْعُ الْاِقْتَالِ بِغَيْرِ اخْتِيَارِهِمْ، وَانَّهُ لَمَّا تَرَأَسَ عَلَى وَطْلَحَةَ وَالزَّبِيرَ وَقَصْدُ الْاِتْفَاقِ عَلَى الْمَصْلَحَةِ، وَانَّهُمْ اذَا تَمَكَّنُوا طَلَبُوا قَتْلَهُ عَثْمَانَ اَهْلَ الْفَتْنَهِ..... فَخَشَى الْقَاتِلُهُ اَنْ يَتَفَقَّعَ عَلَى مَعْهُمْ عَلَى اَمْسَاكِ الْقَاتِلِهِ فَحَمَلُوا عَلَى عَسْكَرِ طَلَحَةِ“

والزبیر، فظن طلحہ والزبیر ان علیاً حمل علیہم فحملوا دفعاً عن انفسهم فظن علی انہم حملوا علیہ فحمل دفعاً عن نفسہ فوقعت الفتہ بغیر اختیارہم وعائشہ راکبہ، لاقاتلت ولا امرت بالقتال، هکذا ذکرہ غیر واحد من اہل المعرفہ بالا خبار۔" (منہاج السنہ جلد ۲ ص ۱۸۵)

"کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے قاتل کیا اور نہ قاتل کے لئے نکلی تھیں وہ تو اصلاح بین اُس لیے مسلمین کے قصد سے تشریف لائی تھیں۔ اور ان کا خیال تھا کہ ان کی تشریف آوری میں مسلمانوں کی مصلحت ہے..... اور جنگ جمل کے دن ان حضرات کا قاتل کا قصد نہیں تھا لیکن ان کے اختیار کے بغیر قاتل کی نوبت آئی۔ قصہ یہ ہوا کہ جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حضرت طلحہ وزیر رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے مصالحت پر اتفاق کرنے کا عزم کر لیا اور یہ طے ہوا کہ جب قدرت ہوگی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلین اہل فتنہ پر گرفت ہو سکے گی..... قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہے لئے یہ خطرہ کی گھنٹی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر گرفت کرنے میں ان حضرات کے ساتھ متفق ہو جائیں..... چنانچہ انہوں نے حضرت طلحہ وزیر رضی اللہ عنہما کے کمپ پر شخون مارا، طلحہ وزیر رضی اللہ عنہما یہ سمجھے کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان پر جملہ کر دیا ہے۔ انہوں نے مدافعانہ جملہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سمجھے کہ ان لوگوں نے جملہ کیا ہے انہوں نے اپنی مدافعت میں جنگ شروع کر دی۔ یوں ان کے اختیار کے بغیر یہ فتنہ برپا ہو کر رہا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (ہودج میں) سوار تھیں، وہ نہ لڑیں نہ انہوں نے لڑنے کا حکم دیا۔ بہت سے مومنین نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔"

مندالہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ نے تھفا اثنا عشریہ میں اس کو مفصل لکھا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اصرار کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَعَائِشَةَ رَانِيْزَ بَاعَثَ شَدَنَدَ كَهْ تَارِفَعَ فَتَنَهْ وَحَصُولَ اَمْنَ وَدَرْسَتِ اَمْوَارَ خَلَافَتِ وَمَلَاقَاتِ مَا هَا خَلِيفَهْ وَقَتْ هَمَرَاهْ مَا بَاشَ تَابَپَاشَ اَدَبَ تُوكَهْ مَا دَرَ مُسْلِمَانِيْ وَحَرَمَ مُحْتَرَمَ رَسُولَ وَازَ جَمْلَهْ اَزَوَاجَ مُحْبَوبَ

ترو مقبول بودہ ایں اشقیاً قصد مانگتند و مار اتلف نہ سازند، ناچار عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بقصد اصلاح و انتظام امور امت و حفظ جان چندے ازاکبراً صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہم اقارب او بودند بسمت بصرہ حرکت فرمود۔” (تحفہ اشنا عشر یہص ۳۲۲، مطبوعہ سہیل آکیڈمی لاہور)

”ان حضرات نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ بھی اصرار کیا کہ جب تک فتنہ نہیں اٹھ جاتا امن کامل نہیں ہو جاتا، امور خلافت درست نہیں ہو جاتے اور خلیفہ وقت سے ہماری ملاقات نہیں ہو جاتی، آپ بھی ہمارے ساتھ رہیں کیونکہ آپ مسلمانوں کی مادر مشق ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لاٹق صد احترام حرم ہیں۔ اور ازدواج مطہرات میں سب سے محبوب و مقبول تھیں، اس لئے آپ کے پاس ادب کے وجہ سے یہ اشقیاء ہماراً قصد نہیں کریں گے، ہمیں تلف نہیں کریں گے، لہذا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے لوگوں کے درمیان صلح کرانے، امور امت کو نظم میں لانے اور چند اکابر صحابہ جو آپ کے عزیز بھی ہوتے تھے، ان کی جان کی حفاظت کی خاطر بصرہ کا رخ کیا۔“

الغرض حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس لشکر کی نہ امیر تھیں، نہ پہ سالار، نہ ان کے سیاسی مقاصد تھے اور نہ حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ سے مقابلہ و مقتالہ ان کا مقصود تھا۔ ان کو اکابر صحابہ نے مادر مشق کی حیثیت سے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کیا تاکہ ان کی لاٹق صد احترام شخصیت کی وجہ سے اصلاح احوال میں سہولت ہو۔

اس کے باوجود ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اپنے فعل پر ندامت ہوئی۔ راستہ میں جب ایک مقام، ہواب، پر پہنچیں تو واپسی کا ارادہ فرمایا، لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ قیس بن ابی حاذم الحججی کا بیان ہے۔

”لما اقبلت عائشہ فلما بلغت میاہ بنی عامر لیلاً بحث الكلاب، فقالت ای ما هذ؟ قالوا ماء الحواب، قالت ما اظننى الا اننى راجعة قال بعض من كان معها: بل تقلمين في راک المسلمين، فيصلح الله ذات بينهم، قالت ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال ذات يوم: ”كيف باحدا کن تبع علیها كلاب الحواب.“ (سیر اعلام النبلاء جلد: ص: ۷۷۱)

”حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب مکہ سے بصرہ روانہ ہوئیں، دوران سفر جب رات کے وقت بنو عامر کی آبادی میں پہنچیں تو کہتے بھونکے، دریافت فرمایا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ بتایا گیا کہ یہ حواب ہے فرمایا: میرا خیال ہے مجھے یہیں سے واپس لوٹنا ہے۔ آپ کے بعض ہمراہیوں نے کہا کہ نہیں آپ کو آگے چلنا چاہئے۔ آپ کو دیکھ کر مسلمان متفق ہو جائیں گے، اس طرح آپ کی برکت سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حالت کی اصلاح فرمادیں گے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا تھا ”تم (ازواج مطہرات) میں سے ایک کی کیا حالت ہوگی، جب کہ اس پر حواب کے کتے بھونکیں گے۔“

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

”حضرت عائشہ درین اصرار معدور بود زیرا کہ وقت خروج از مکہ نمیدانست کہ درین راہ چشمہ حواب نام واقع خواہد شد و برآن گز شتن لازم خواہد آمد و چون برآن آب رسید و دانست ارادہ رجوع مصمم کر لکن میسرش نشد زیرا کہ کے ازاں لشکر ہمراہ اور رفاقت در رجوع نہ کردد و در حدیث نیز بعد از وقوع واقع بیچ ارشاد نہ فرمودہ اند کہ چہ باید کر دنا چار بقصد اصلاح ذات ایسین کہ بلاشبہ مامور بہ است پیشتر روانہ شد پس حالت حضرت عائشہ درین مرو رحالات شخصی است کے طفیلے را از دور دید کہ میخواہد در چاہے بینتہ بے اختیار برائے خلاص کر دن اور دوید و در اشنازے دویدن بے خبر مجازی نماز گزارنده مرو روابع شدہ اور اور وقت مجازات اطلاع دست داد کہ ممن مجازی نماز گزارنده ام پس اگر بر عقب میگردد آن طفل در چاہی افتدا میں مرو روابع شدہ را مدارک نمیتواند شد ناچار قصد خلاصی طفل خواہد کر داں مرو را در حق خود مغفو خواہد شناخت۔“ (تہذیب اشاعتی، ص ۳۲۲)

”حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس اصرار میں معدور تھیں کہ مکہ سے نکلتے وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس راستے میں حواب نامی چشمہ واقعہ ہو گا اور اس پر سے گز رنا پڑے گا، اور جب اس پر پہنچیں اور علم ہوا تو واپسی کا پختہ اراد کیا، لیکن واپسی میسر نہ آئی۔ کیونکہ اہل لشکر میں سے کسی نے رجوع میں ان کے ساتھ رفاقت نہیں کی اور حدیث (حواب) میں بھی کوئی ارشاد نہیں فرمایا گیا کہ واقعہ کے وقوع میں آنے کے بعد کیا کرنا چاہئے۔ اس لئے

نچار اصلاح ذات الہیں کی غرض سے، جو بلاشبہ مامور ہے، آگے روانہ ہوئیں۔ پس اس گزرے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حالت اس شخص کے مشاہدے ہے کہ جس نے دور سے کسی بچے کو دیکھا کہ کنویں میں گرا چاہتا ہے، دیکھتے ہی اس کو بچانے کے لئے دوڑ پڑا، اور دوڑتے ہوئے بے خبری میں کسی نمازی کے سامنے سے مرد و را قع ہوا اور عین سامنے آنے کے وقت معلوم ہوا کہ میں نمازی کے آگے سے گزر رہا ہوں۔ اب اگر پیچھے ہتا ہے تو وہ کنویں میں گر جائے گا، اور یہ جو نمازی کے سامنے آپ کا ہے اس کا تدارک نہیں ہو سکتا، نچار اس نے بچے کو بچانے کا قصد کیا، اور اس گزرے کو اپنے حق میں لا لق عفو سمجھا۔

بعد میں جب انہیں جنگ جمل کا واقعہ یاد آتا تو نہایت افسوس کرتیں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

”ہرگاہ یوم الجمل رایا وی فرمود آن قدر میگریست کی مجر مبارکش باشک ترمی گشت بسب آنکہ در خروج عجلت فرمود و ترک تامل نمود از پیشتر تحقیق نہ فرمود کہ آب حواب در راه واقع است یا نہ تا آنکہ این قسم واقعہ عظیمی و داد۔“ (تحذیث اثنا عشریہ، ص: ۳۳۵)

”آپ جب یوم الجمل کو یاد کرتیں تو اتنا روتیں کہ آنچل مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتا کیونکہ اس کا سبب یہ تھا خروج میں عجلت فرمائی، تامل نہیں فرماسکیں اور پہلے سے تحقیق نہ فرمائی کہ آب حواب را میں واقع ہے یا نہیں یہاں تک کہ اس قسم کا واقعہ عظیمی رونما ہوا۔“

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”ثم تبین لها فيما بعده ان ترك الخروج كان اولى فكانت اذا ذكرت

خروجها تبکی حتى تبل خمارها“ (منهج السنۃ جلد ۲، ص ۱۸۵)

”پھر بعد میں ان کو ظاہر ہوا کہ ترک خروج بہتر تھا۔ چنانچہ جب اپنے خروج کو یاد کرتیں تو اس قدر روتیں کہ آنچل بھیگ جاتا۔“

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ولا ریب ان عائشة ندمعت ندامہ کلیتہ علی مسیرہا الی البصرة وحضورہا

”یوم الجمل، وما ظلت ان الامر یلغ مایلغ۔“ (سیر اعلام البلاء جلد ۲، ص ۷۷)

”اس میں شک نہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بصرہ جانے اور جنگ جمل کے دن وہاں موجود ہونے پر کلی ندامت ہوئی انہیں یہ وہم و خیال بھی نہ تھا کہ معاملہ کی نوبت یہاں تک پہنچے گی۔“

اظہار ندامت کے طور پر فرماتی تھیں۔

”وَدَتْ أَنِي كَنْتْ ثَكْلَتْ عَشْرَةَ مِثْلَ الْحَارِثَ بْنَ هَشَّامٍ وَأَنِي لَمْ اسْرِيْ مَعَ أَبْنَ الزَّبِيرِ۔“ (مستدرک حاکم جلد ۳، ص ۱۱۹)

”میں آرزو کرتی ہوں کہ میرے حارث بن ہشام جیسے دس لاکھ بیٹے پیدا ہو کر مر گئے ہوتے اور میں ابن زبیر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے ساتھ (بصرہ) نہ جاتی۔“  
کبھی فرماتی تھیں۔

”وَدَتْ أَنِي جَلَسْتَ كَمَا جَلَسْتُ غَيْرِي فَكَانَ أَحَبُّ إِلَيِّي مِنْ أَكُونَ وَلَدْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرَةَ كَلْهَمَ مِثْلَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ هَشَّامٍ۔“ (فتح الباری جلد ۱۳، ص ۵۵)

قال الحافظ اخر جه الطبرانی وفيه ابو معشر نجیح المدنی، وفيه ضعف، وقال الهیثمی رواه الطبرانی وفيه ابو معشر نجیح وهو ضعیف،  
یکتب حدیثہ، وبقیة رجاله ثقات، مجمع الزوائد جلد ۷، ص ۲۳۸

”میں آرزو کرتی ہوں کہ میں گھر میں بیٹھی رہتی جیسا کہ دوسری ازواج مطہرات بیٹھی رہیں تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ محبوب تھی کہ میرے بیٹن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دس بیٹے پیدا ہوتے اور وہ سب عبد الرحمن بن حارث جیسے بیٹے ہوتے۔“

اور کبھی فرماتی:- ”وَدَتْ أَنِي كَنْتْ غَصْنَاءِ طَبَأً وَلَمْ اسْرِيْ مَسِيرِيْ هَذِهِ۔“

(ازالۃ الخواجہ جلد ۲، ص ۲۸۰۔ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)

”میں آرزو کرتی ہوں کہ اے کاش میں ہری شاخ ہوتی اور اس سفر پر نہ لکھتی۔“ اسی طرح متعدد صحابہ کرام نے بھی ان کے خروج پر نکیر فرمائی (جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔)  
اب انصاف فرمائیے کہ جس واقعہ میں حضرت ام المؤمنین اور ان کے رفقاء (رضی اللہ

عنهم) کے ذہن میں حکومت و امارت کا کوئی تصور ہی نہیں تھا بلکہ ام المؤمنین امت کی ماں کی حیثیت سے امت کے درمیان جوڑ پیدا کرنے نکلی تھیں۔ جس واقعہ پر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے نکیر فرمائی اور جس پر خود حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے افسوس اور ندامت کا اظہار فرمایا، کیا اس کو ”حکومت کے لئے عورت کی سر برائی“ کے جواز کی دلیل بنانا صحیح ہے؟ اور یہاں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اس پورے سفر میں حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہودج، میں پر دہ نشین رہیں، اور آپ کے مخارم آپ کے ساتھ رہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ جنگ جمل کے اختتام کے بعد اعیان و اشرف حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں اسلام کے لئے حاضر ہو رہے تھے ایک شخص نے ہودج کے اندر جھانکا، حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ارشاد فرمایا:-

”الیک لعنک اللہ، هتک اللہ ستوک، وقطع یدک وابدی عورتک.“

”پرے ہٹ، اللہ تجھ پر لعنت کرے، تیرا پر دہ فاش کرے، تیرے ہاتھ کاٹ ڈالے اور تیرے ستر کو عریاں کرے۔“

یہ شخص بصرہ میں قتل ہوا، اس کے بعد اس کے ہاتھ کاٹے گئے اور اس کی برہنہ لاش دیرانے میں ڈال دی گئی۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۷، ص ۲۲۵)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ پورا سفر اپنے محرومین کی معیت میں ہودج کے اندر ہوا اور اس ہولناک جنگ میں بھی وہ اپنے ہودج کے اندر پر دہ نشین رہیں۔ کسی کو ان کے ہودج کے اندر جھانکنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ اور یہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ آپ کے گرد کا پورا مجمع کیا موافق اور کیا مخالف آپ کو ماں سمجھتا تھا۔ آپ کو اسی احترام و تقدس کا مستحق سمجھتا تھا جو نیک اولاد کے دل میں سکی ماں کا ہوتا ہے۔

ایک طرف اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھئے۔ دوسری طرف دور حاضر کی ان خواتین کے حالات پر غور کیجئے جن کی تعلیم و تربیت اور ذہنی تخلیق مغربی یونیورسٹیوں کی آزاد فضاؤں میں ہوتی ہے جو کسی پر دے وردے کی قائل نہیں، جو گھر کی چار دیواری کو جیل سے تباہیہ دیتی ہیں اور چادر اور دوپٹے کو طوق و سلاسل تصور کرتی ہیں جن کے نزدیک محرم و نامحرم

کا امتیاز دیانتو سیت کی علامت ہے۔ اور جلوت و خلوت میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے پر فخر کرتی ہیں کیا ان خواتین کے لئے حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مثال پیش کرنا عقل و دانش اور حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے؟

### رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بھوپال کی بیگمات

بعض حضرات عورت کی سربراہی کا جواز پیش کرنے کے لئے انتش کی بیٹی رضیہ سلطانہ، بیجا پور کے حکمران کی بیوہ چاند بی بی اور بیگمات بھوپال کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مگر اہل فہم پر روشن ہے کہ کتاب و سنت اور اجماع امت کے مقابلے میں ان مثالوں کی کیا قیمت اور حیثیت ہے، مسلمانوں میں دین اسلام کے خلاف سیکڑوں منکرات و بدعتات رانج ہیں زنا، چوری، شراب نوشی، سود و قمار اور رشوت جیسے کبائر تک میں لوگ بتلا ہیں، مگر مسلمانوں میں ان چیزوں کے رواج ہو جانے کو ان کے جواز و اباحت کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح اگر عورت کی حکمرانی کے شاذ و نادر واقعات پیش آئے ہیں تو انہیں قرآن و سنت اور اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بدعت سیدہ کہا جائے گا۔

ان واقعات کو عورت کی حکمرانی کے جواز میں پیش کرنا اہل عقل و فہم سے نہایت بعید ہے۔

چونکہ عورت کی سربراہی انسانی و نسوانی فطرت کے خلاف ہے اس لئے میں نے ان واقعات کو ان عجیب الخلق تھوڑے سچنیوں کے ساتھ تشبیہ دی تھی جو کبھی مادہ فطرت کے نقش کی وجہ سے جنم لیتے ہیں، یا ان کی مثال ان پھوڑے پھنسیوں کی ہے جو سادخون کی علامت کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

ان واقعات پر غور کرتے ہوئے اہل فہم کو یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ خواتین کی حکمرانی کے یہ واقعات نظام شہنشاہیت کے شاخانے تھے۔ مثلاً بتایا جاتا ہے کہ سلطان انتش کا لڑکا فیروز نالائق تھا اور اس کی بیٹی رضیہ بڑی لاائق و فاقع تھی۔ اس لئے سلطان نے اپنے بیٹے کے بجائے بیٹی کو تخت کی وارث بنادیا۔ یہی صورت بیجا پور اور بھوپال کی ریاستوں میں بھی پیش آئی کہ تخت کا وارث کوئی مرد نہیں رہا تھا۔ اس لئے ان خواتین کو اس وراثت کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف پر ستاراں جمہوریت اٹھتے بیٹھتے شہنشاہیت کے سب و شتم کا وظیفہ پڑتے ہیں، دوسری طرف اسی شہنشاہیت کی نہایت مکروہ اور بگڑی ہوئی

شکل کو بطور معيار پیش کر کے اس سے عورت کی حکمرانی کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ تخت کے تخت کار وارث نالائق تھا اس لئے با مر مجبوری اس نے اپنی بیٹی کو تخت کی وارث بنادیا۔ کیا پاکستان کے حالات پر اس واقعہ کو چھپاں کرتے ہوئے ہم دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پاکستان کے تمام مرد نالائق تھے اس لئے شہنشاہ پاکستان کو بیٹی کو پاکستان کے تخت کی وارث بنایا گیا؟

یہاں پورا اور بھوپال کی ریاستوں میں شاہی خاندانوں میں کوئی مرد باقی نہیں رہا تھا اس لئے مجبوراً بے چاری خواتین کو ریاست کا لظم و نسل اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ کیا پاکستان کے حالات پر ان کی مثال چھپاں کرنے کے معنی نہیں کہ اس ملک کے سارے مرد مر چکے ہیں اس لئے دختر پاکستان کو حکومت کی گدی پر بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ ”غرض آدمی کی بصیرت کو انداھا کر دیتی ہے“، جو حضرات عورت کی حکمرانی کا جواز اس قسم کے واقعات میں تلاش کرتے ہیں۔ ان پر یہ مثال پوری طرح صادق آتی ہے۔

## مس فاطمہ جناح

بعض حضرات عورت کی سربراہی پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ صدر ایوب خان کے مقابلہ میں مس فاطمہ جناح کو صدارت کے لئے نامزد کیا گیا تھا اور بڑے بڑے علماء نے اس کی تائید کی تھی اس وقت یہ فتوے کہاں چلے گئے تھے؟

لیکن یہ صریح مغالطہ ہے اس لئے کہ علمائے امت اور اہل فتویٰ نے اس وقت بھی کھل کر مخالفت کی تھی کسی ایک مفتی کا نام بھی پیش نہیں کیا جا سکتا جس نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہو (اور جو شخص اجماع امت کے خلاف فتویٰ دینے کی جرأت کرے اس کو مفتی کہنا ہی غلط ہے) چنانچہ مولانا مفتی محمود نے اسی بنا پر نہ ایوب خان کے حق میں ووٹ دیا اور نہ فاطمہ جناح کو انہوں نے اپنا ووٹ ہی استعمال نہیں کیا۔

اور جن سیاسی یا نیم مذہبی و نیم سیاسی تنظیموں نے محض سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اس منصب کے لئے مس فاطمہ جناح کا انتخاب کیا تھا وہ بھی ان کی سیاسی مجبور تھی۔ ان کے خیال میں پاکستان میں وہ واحد شخصیت تھی جو ایوب خان کا مقابلہ کر سکتی تھی اور مس فاطمہ جناح نے

ان لوگوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ ایوب خان کے ہٹائے جانے کے بعد ان کو تین مہینے میں اپنا صدر کوئی دوسرا منتخب کرنا ہوگا۔ الغرض اہل فتویٰ کے نزدیک تو مس فاطمہ جناح کی نامزدگی بھی خلاف شرع اور ناجائز تھی۔ اور اہل سیاست کے نزدیک یہ بھی اسی طرح کی اضطراری کیفیت تھی جس طرح اضطراری کیفیت متذکرہ بالاخواتین کے شاہی خاندانوں کو پیش آئی۔

### حضرت تھانویؒ کا فتویٰ

بعض حضرات، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک فتویٰ کا حوالہ دیتے ہیں جو امداد الفتاویٰ (جلد ۵، ص ۹۹-۱۰۰) میں شامل ہے۔ اس فتویٰ سے ان حضرات کا استدلال کہاں تک صحیح ہے؟ اس پر غور کرنے کے لئے چند امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ امت کے اس اجتماعی فیصلے کے ساتھ پوری طرح تتفق ہیں کہ اسلام میں عورت کو سربراہ حکومت بنانا جائز نہیں، چنانچہ تفسیر بیان القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

۱: ”اور ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے۔ پس بلقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا۔ دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ہو تو شرع محمدی میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ جھت نہیں۔“ (بیان القرآن جلد ۸، ص ۸۵)

۲: اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع کی کتاب احکام القرآن کا حوالہ آچکا ہے جو حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے زیر اشراف لکھی گئی اور جس میں خود حضرتؒ ہی کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے کہ عورت کا سربراہ مملکت بنانا جائز نہیں اور بلقیس کے قصہ سے اس کے جواز پر استدلال کرنا غلط ہے۔

۳: اور خود اسی فتویٰ میں، جس کو عورت کی سربراہی کے لئے پیش کیا جاتا ہے حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

”حضرات فقہاء نے امامت کبریٰ میں ذکورہ (مرد ہونے) کو شرط صحت اور قضا میں گوشہ صحت نہیں، مگر شرط صون عن الاثم فرمایا ہے۔“ (امداد الفتاویٰ جلد ۵، ص ۱۰۰)

۲:- اور پر شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی کی کتاب احکام القرآن کا حوالہ بھی گزر چکا ہے جس میں امامت کبریٰ و صغیری کو مرد کی خصوصیت قرار دیا گیا ہے، احکام القرآن کا یہ حصہ بھی حضرت حکیم الامتؒ کی نگرانی میں مرتب ہوا۔

ان حوالہ جات سے واضح ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے نزدیک بھی یہ اصول مسلم ہے کہ کسی اسلامی مملکت میں حکومت کی سربراہ عورت نہیں ہو سکتی۔

دوم:- حضرت نے جس سوال کے جواب میں یہ فتویٰ تحریر فرمایا اس کا پس منظر پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے، صورت حال یہ تھی کہ انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط کے بعد بعض موروثی ریاستوں کو برقرار رکھا گیا تھا۔ اور ان کی حیثیت نیم خود مختار ریاستوں کی تھی۔ ان میں بعض مسلم ریاستیں ایسی تھیں جن میں پرده نشین خواتین کے سوا کوئی قانونی وارث باقی نہیں رہا تھا۔ اب دو صورتیں ممکن تھیں، ایک کہ یہ پرده نشین خواتین کو (جنہیں انگریزی قانون ریاست کی قانونی وارث سمجھتا تھا) والی ریاست تسلیم نہ کیا جاتا۔ اس صورت میں ان ریاستوں کی نیم آزادانہ حیثیت ختم ہو جاتی۔ اور یہ انگریزی قلمرو میں مغم ہو جاتیں، ظاہر ہے کہ یہ ضرر عظیم تھا۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ محض مشیر کی حیثیت سے ان خواتین کو والی ریاست تسلیم کیا جاتا اور ریاست کا انتظام و انصرام ان خواتین کے مشورہ سے مردوں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا۔ ان ریاستوں میں عملًا یہی صورت اختیار کی گئی تھی اور سوال کرنے والے نے اسی صورت کے بارے میں سوال کیا تھا کہ آیا یہ ریاستیں اس حدیث کا مصدقہ ہیں یا نہیں؟

سوم:- اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے حضرتؒ کے فتویٰ پر غور کیجئے۔ حضرت لکھتے ہیں:

”حکومت کی تین قسمیں ہیں، ایک قسم وہ جو تام بھی ہو، عام بھی ہو۔ تام سے مراد یہ کہ حاکم بانفرادہ خود مختار ہو یعنی اس کی حکومت شخصی ہو اور اس کے حکم میں کسی حاکم کی منظوری کی ضرورت نہ ہو، گواں کا حاکم ہونا اس پر موقوف ہو۔ اور عام یہ کہ اس کی محاکوم کوئی محدود قلیل جماعت نہ ہو۔ دوسری قسم وہ جو تام تو ہو مگر عام نہ ہو، تیسری قسم وہ جو عام ہو مگر تام نہ ہو..... مثال اول کی کسی عورت کی سلطنت یا ریاست بطریقہ مذکور شخصی ہو۔ مثال ثانی کی کوئی عورت کسی مختصر جماعت کی منتظم بلا شرکت ہو۔ مثال ثالث کی۔ کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو کہ اس میں والی صوری

درحقیقت والی نہیں بلکہ ایک رکن مشورہ ہے اور والی حقیقی مجموعہ مشوروں کا ہے، حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد حدیث میں پہلی قسم ہے۔“ (امداد الفتاوی جلد ۵ ص ۹۹)

حضرت کی اس تحریر سے واضح ہے کہ صرف ایسی ریاستیں حدیث مذکور کی وعید سے مستثنی ہیں جن میں والی ریاست خواتین کی حیثیت مغض مشیر یا رکن مشورہ کی ہو اور احکام کے نفاذ کے اختیارات ان کے ہاتھ میں نہ ہوں۔ چنانچہ اس کی وجہ ذکر کرتے ہوئے حضرت تحریر فرماتے ہیں۔

”اور راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس حکومت کی مغض مشورہ ہے، اور عورت اہل ہے مشورہ کی۔“ (ص ۱۰۰)

اب دیکھایا ہے کہ پاکستان میں وزارت عظمی کا جلیل القدر منصب مغض مشیر یا رکن مشورہ کی حیثیت رکھتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے (اور یقیناً نفی میں ہے) تو حضرت گی تحریر سے استدلال کرنے والے حضرات خود ہی انصاف فرمائیں کہ ان کا استدلال کہاں تک صحیح ہے؟

پاکستان میں جو پارلیمانی نظام نافذ ہے اس میں وزیر اعظم کا منصب بے اختیار قسم کا مغض علامتی منصب نہیں بلکہ وزیر اعظم ملک کی حکومت اور انتظامیہ کا با اقتدار و خود مختار سربراہ ہے آئین و قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ملکی نظم و نتیجہ پر اس کو مکمل کنشروں حاصل ہے، وہ اپنی کابینہ کی تشکیل میں آزاد و خود مختار ہے، اور تمام شعبوں اور وزارتوں کی کارکردگی کا ذمہ دار ہے، وہ اپنی کابینہ سے مشورہ ضرور کرتا ہے لیکن کسی مشورے کا پابند نہیں وہ جس وزیر یا مشیر کو جس وقت چاہے اس کے منصب سے فارغ کر سکتا ہے۔ اس لئے اس کے تمام وزراء اور مشیران اس کی رائے اور خواہش کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ اپنی ہر حرکت و عمل میں وزیر اعظم کے اشارہ چشم و ابر و پر نظریں جمائے رکھتے ہیں اور وہ کسی ایسے اقدام کی جرأت نہیں کر سکتے جس سے وزیر اعظم کے نازک مزاج شاہی کو خدا نخواستہ گرانی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عرف عام میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ ملک میں وزیر اعظم کی حکومت ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں وزیر اعظم کے دور حکومت میں یہ ہوا۔

جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے، سب جانتے ہیں کہ وزیر اعظم قانون ساز ادارے میں اکثریتی پارٹی کا لیڈر اور قائد ایوان کہلاتا ہے۔ وہ بڑی آسانی سے اپنی رائے اور خواہش کو

قانون کی شکل دے کر قانون ساز ادارے سے منظور کرایتا ہے۔ اپنی پارٹی کے ارکان پر اے اعتماد و اطمینان ہوتا ہے کہ وہ اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ لیکن اگر بھی اس قسم کا اندیشہ لاحق ہو تو اپنی پارٹی کے نام خاص ہدایت حکم جاری کر سکتا ہے اور اس ہدایت کے جاری ہونے کے بعد پارٹی کے کسی رکن کو وزیر اعظم کی خواہش کے خلاف چوں کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ مثال ہندوؤں میں مسلم پرنسپل لاء (مسلمانوں کے عالمی قوانین) کے معاملے میں پیش آئی۔ اس کی تفصیلات مولانا ابو الحسن علی ندوی کی خودنوشت سوانح کاروان زندگی حصہ سوم باب چہارم میں ملاحظہ کی جائیں۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کی تحریک اور انتہک محنت و کوشش کے نتیجہ میں وزیر اعظم راجیو گاندھی کو اس پر آمادہ کر لیا گیا کہ حکومت ان قوانین کو بل کی شکل میں اس بیل سے منظور کرائے گی اس بیل میں بل پیش ہونے کا مرحلہ آیا تو چونکہ ہندوستان کا متعصب پرنسپل اس بل کے خلاف زہراگل رہا تھا اور اس بیل کے اندر بھی مسلمانوں کے خلاف تعصب کی فضائی۔ اس لئے شدید خطرہ تھا کہ ہندو اور نام نہاد مسلمان اس بل کی مخالفت کریں گے۔

مولانا ابو الحسن ندوی لکھتے ہیں: ”وزیر اعظم نے وہ پرنسپل جاری کر دیا کہ پارٹی کے ہر ممبر کو اس کی تائید کرنی ہے۔ مخالفت کی صورت میں وہ پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔ اگر بلاعذر کوئی نمبر اس دن شریک اجلاس نہیں ہوا، تو وہ بھی خارج کر دیا جائے گا۔ (کاروان زندگی جلد ۳ ص ۱۷۳)

وزیر اعظم کے اس وہ پرنسپل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بل پر بحث و تجییس کے بعد:

”رات پونے تین بجے بل پر دو ٹنگ عمل میں آئی اور بل کی مخالفت میں ۵۲ ووٹوں کے مقابلہ میں بل کی حمایت میں ۳۷ ووٹ آئے بل کی کامیابی پر تھکے ہوئے کانگریسی نمیران پارلیمنٹ نے اپنی خوشی کا اظہار کیا، دوسری طرف اپوزیشن کے بل مخالف نمیران تھکے تھکائے ہال سے باہر جا رہے تھے۔“ (ایضاً ص ۱۷۷)

یہ صحیح ہے کہ اس بیل میں حزب اختلاف بھی موجود ہوتی ہے۔ اور وہ اقتدار کے مست ہاتھی کو قابو رکھنے میں موثر کردار ادا کرتی ہے لیکن اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ حزب اختلاف کی دھواں دھار تقریروں اور تمام ترشور و غوغاء کے باوجود وزیر اعظم اپنی اکثریت کے نشہ میں

حزب اختلاف کو خاطر میں نہیں لاتا اور وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر جو قانون چاہتا ہے، منظور کر لیتا ہے دوسریوں جائے حزب اختلاف کے لاک صد احتراں قائد کو ایوان سے باہر پکنکو اکرم مانے قانون منظور کرانے کا تماشا تو خود ہمارے ملک میں دکھایا جا چکا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمہوری حکومت میں وزیر اعظم کوئی بے اختیار نمائشی بت نہیں ہوتا بلکہ با اختیار صاحب حکومت انتظامیہ کا حاکم اعلیٰ اور پورے ملک کا بادشاہ شمار ہوتا ہے۔ اور قانون سازی کے دائرے میں بھی وہ قریب قریب مطلق العنان ہوتا ہے۔ اکثریتی پارٹی کا لیڈر ہونے کی وجہ سے جو قانون چاہے نافذ کر سکتا ہے۔ اور اگر اسے ایوان میں دو تہائی اکثریت کی حمایت حاصل ہو تو آئین کا تیا پانچ بھی کر سکتا ہے۔

ان حقوق کو سامنے رکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ وزیر اعظم کا منصب محض والی صوری کا منصب ہے اس لئے حضرت تھانویؒ کے اس فتویٰ کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ”والی صوری در حقیقت والی نہیں، بلکہ ایک رکن مشورہ ہے۔“ اور یہ کہ:

”راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس حکومت کی محض مشورہ اور عورت اہل ہے مشورہ کی۔“  
جن حضرات نے عورت کی وزارت عظمیٰ کے لئے حضرت تھانویؒ کے اس فتوے سے استدلال کی کوشش کی ہے ان کی خدمت میں اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ:  
خن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

### کیا عورت قاضی بن سکتی ہے؟

بعض حضرات نے یہ استدلال فرمایا ہے کہ امام ابو حنیفہؓ کے نزدیک عورت قاضی بن سکتی ہے تو وزیر اعظم کیوں نہیں بن سکتی؟

ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ استدلال میں دو غلطیاں ہیں ایک یہ کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے جو منقول ہے کہ حدود قصاص کے علاوہ باقی امور میں عورت کا قاضی بننا صحیح ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ عورت کو عہدہ قضا پر مقرر کرنا بھی جائز ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ عورت چونکہ اہل شہادت ہے اور اسے فی الجملہ ولایت حاصل ہے۔ اس لئے اگر بالفرض اس کو قاضی بنادیا جائے تو یاد و فریق کسی قضیہ میں اس کو حکم مان لیں تو حدود و

قصاص کے علاوہ دیگر امور میں اس کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ بشرطیکہ فیصلہ شریعت کے موافق ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ عورت کو قاضی بنانا بھی جائز ہے نہیں بلکہ اگر کسی جگہ عورت کو قاضی بنایا جاتا ہے تو بنانے والے بھی گنہ گار ہوں گے اور منصب قضا کو قبول کرنے والی بھی گنہ گار ہوگی۔ چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی عبارت اور گز رچکی ہے کہ:

”حضرات فقہاء امامت کبری ذکورۃ (مردہ ہونے) کو شرط صحت اور قضا میں گو شرط صحت نہیں مگر شرط صون عن الائم فرمایا ہے۔“ (امداد الفتاوی جلد ۵ ص ۱۰۰)

حضرت حکیم الامت کے ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ عورت کو قاضی بنانا فقہاء احتراف کے نزدیک بھی گناہ ہے مگر اس کے قاضی بنادیئے جانے کے بعد اس کا فیصلہ غیر حدود قصاص میں نافذ ہو جائے گا ابو بکر بن العربي المالکی نے بھی حضرت امام کے قول کی یہی توجیہ کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

”ونقل عن محمد بن جریر الطبری امام الدين انه يجوز ان تكون المرأة قاضية ولم يصح ذالك عنه، ولعله كما نقل عن ابی حنيفة انها انما تقضى فيما تشهد فيه. وليس ان تكون قاضية على الاطلاق ولا بان يكتب لها منشور بان فلانة مقدمة على الحكم، الا في الدماء والنکاح وانما ذالك كسبيل التحکيم او الاستبانة في القضية والواحدة بدليل قوله صلی الله عليه وسلم “لن یفلح قوم ولوا امرهم امراة.“ وهذا هو الظن بابی حنيفة وابن جریر.“ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۱۵۷)

”امام محمد بن جریر طبری سے نقل کیا گیا ہے کہ عورت کا قاضی ہونا صحیح ہے مگر یہ نقل صحیح نہیں، شاید یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ سے نقل کیا گیا ہے کہ عورت جن امور میں شہادت دے سکتی ہے، ان میں فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ علی الاطلاق قاضی بن جائے، یا یہ کہ اس کے نام پر وانہ جاری کر دیا جائے کہ فلاں عورت کو غیر حدود نکاح میں منصب عدالت پر مقرر کیا جاتا ہے۔ عورت کے فیصلہ کے صحیح ہونے کی بس یہی صورت ہو سکتی ہے کہ کسی معاملہ میں دو فریق اس کو حکم بنالیں یا کبھی کسی قضیہ میں اس کو نائب بنادیا جائے کیونکہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”وَهُوَ قَوْمٌ كُلُّهُمْ فَلَاحٌ نَّبِيْسٌ پَّاَيَّهُ كُلُّهُمْ جَسَنْ“ جس نے امر حکومت عورت کے سپرد کر دیا۔ ”امام ابو حنیفہ اور امام ابن حجریر کے بارے میں یہی مگان کیا جاسکتا ہے۔

حضرت امام کے قول کی قریبائی یہی توجیہ شیخ ابو حیان نے البحار الحجیط (۷۔۲۷) میں کی ہے جسے صاحب روح المعانی نے بھی نقل کیا ہے۔ (روح المعانی جلد ۱۹ ص ۱۸۹۔ ۱۹۰) درجتار میں ہے۔

”وَالْمَرْأَةُ تَقْضِي فِي غَيْرِ حَدْوَقَدْوَانِ اثْمِ الْمُولَى لَهَا، لِخَبْرِ الْبَخَارِيِّ

لَنْ يَفْلُحَ قَوْمٌ وَلَوْا امْرَهُمْ امْرَأَةٌ.“ (رِوَايَاتُ الْبَخَارِيِّ جَلْدُ ۵ ص ۲۲۰)

”أَوْ عُورَةُ غَيْرِ حَدَّدَقَاصٍ مِّنْ فِيْصَلَهُ كَرِسْكَتِيْهُ ہے اگرچہ عورت کو قاضی بنانے والا گنہگار ہوگا کیونکہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے وہ قوم کلھی فلاخ نہیں پائے گی جس نے عورت کو اپنے معاملات سپرد کر دیئے۔“

علامہ ابن ہمام فیض القدری میں لکھتے ہیں:

”قوله ”وَيَجُوزُ قَضَاءُ الْمَرْأَةِ فِي كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا فِي الْحَدُودِ وَالْقَاصِصِ“.

وقال الانمۃ الثالثۃ لا یجوز. لأن المرأة ناقصة العقل. ليست اهلا

للخوصومة مع الرجال في محافل الخصوم. قال صلی اللہ علیہ

وسلم لن یفلح قوم ولو امراه امراه رواه البخاری..... والجواب ان

ما ذكر غایته ما یفید منع ان تستقضی و عدم حلہ، والکلام فيما

لو ولیت و اثم المقلد بذالک او حکمها خصمان فقضت قضاء

موافقا لدین اللہ اکان ینفذام لا؟ لم ینتهض الدلیل علی نفیہ بعد

موافقته ما انزل اللہ. الا ان یثبت شرعاً سلب اهلیتها. وليس في

الشرع سوی نقصان عقلها و معلوم انه لم يصل الى حد سلب ولا

یتها بالکلیة. الا ترى انها تصلح شاهدة و انظره في الاوقاف، و وصیته

علی الیتامی. و ذالک النقصان بالنسبة والاضافة ثم هو منسوب الى

الجنس، فجاز في الفرد خلافه. الا ترى الى تصریحهم بصدق قولنا:

”الرجل خير من المرأة.“ مع جواز كون بعض افراد النساء خير من بعض افراد الرجال. ولذاك النقص العزيزى نسب صلی الله عليه وسلم لمن يليهنه عدم الفلاح فكان الحديث متعرضاً للمولين ولهن. بنقص الحال. وهذا حق. لكن الكلام فيما لوليت فقضت بالحق لماذا يبطل ذالك الحق.“ (فتح القدير جلد ۵ ص ۳۸۶)

مصنف فرماتے ہیں کہ ”عورت کی قضاہ چیز میں صحیح ہے، مگر حدود و قصاص میں نہیں۔“ اور ائمہ ثلاثہ (امام مالک، امام شافعی امام احمد رحمہم اللہ) فرماتے ہیں کہ صحیح نہیں۔ کیونکہ عورت ناقص العقل ہے۔ وہ خصوم کی محفلوں میں مردوں کے ساتھ خصوصیت کی اہل نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ”وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے معاملات عورت کے سپرد کر دیے۔ (صحیح بخاری)..... اور جواب یہ ہے کہ جو دلائل ذکر کئے گئے ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ عورت کو قاضی بنانا منوع ہے حلال نہیں اور ہماری گفتگو اس صورت میں ہے کہ اگر عورت کو قاضی بنادیا گیا اور بنانے والا گناہ گار ہوا ہو یاد و فریقوں نے اسے حکم بنالیا اور عورت نے ایسا فیصلہ کر دیا جو دین خداوندی کے عین مطابق ہے تو کیا اس کا یہ فیصلہ نافذ ہو گایا نہیں اس کی نفی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی جب کہ وہ فیصلہ ما انزل اللہ کے موافق بھی ہے اور یہ فیصلہ کا عدم نفاذ اس کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا کہ ثابت ہو جائے کہ شرعاً اس کی اہلیت مسلوب ہے اور شرع میں صرف عورت کا ناقص العقل ہونا ثابت ہے اور سب جانتے ہیں کہ اس کا نقصان عقل اس حد تک نہیں کہ اس کی ولایت کو کلی طور پر سلب کر لے دیکھتے نہیں ہو کہ عورت گواہ بن سکتی ہے اوقاف کی نگران بن سکتی ہے، اور یتیم کی وصی بن سکتی ہے عورت کا ناقص ہونا مردوں کی نسبت سے ہے پھر یہ نقصان عقل منسوب ہے جس کی طرف لہذا کسی فرد میں اس کے خلاف بھی ہو سکتا ہے کیا دیکھتے نہیں کہ اس مقولہ کو بالکل سچا سمجھا گیا ہے کہ ”مرد عورت سے بہتر ہے“ حالانکہ بعض عورتیں بعض مردوں سے بہتر ہو سکتی ہیں اور عورتوں کے اس فطری اور خلقی نقص کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدم فلاح کو ان لوگوں کی طرف منسوب کیا ہے جو ان کو والی بنائیں پس حدیث نے ان والی بنانے

والوں کے حق میں عدم فلاح کا اور عورتوں کے حق میں نقص حال کا یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ یہ فیصلہ بحق ہے لیکن اس میں ہماری گفتگو نہیں بلکہ گفتگو اس صورت میں ہے کہ عورت کو قاضی بنادیا گیا ہو پھر وہ حق کے مطابق فیصلہ کرے تو یہ حق باطل کیوں ہو جائے گا۔“

اکابر کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی عورت کو قاضی بنانا جائز نہیں بلکہ حرام ہے اور ایسا کرنے والے گنہگار ہیں مگر چونکہ عورت اہل شہادت ہے اس لئے اگر اس نے فیصلہ کر دیا بشرطیکہ وہ فیصلہ شریعت کے موافق ہو تو نافذ ہو جائے گا۔

ان حضرات کے استدلال میں دوسری غلطی یہ ہے کہ انہوں نے قیاس کر لیا کہ عورت جب قاضی بن سکتی ہے تو حکمران بھی بن سکتی ہے حالانکہ اول تو یہ قیاس قرآن و سنت اور اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔ علاوہ ازیں ملک کی حکمرانی کے لئے ولایت مطلقہ شرط ہے جو عورت میں بوجہ نقصان عقل و دین کے نہیں پائی جاتی جب کہ قضا کے لئے صرف اہل شہادت ہونا شرط ہے۔ اس لئے امامت کبریٰ کو قضا پر قیاس کرنا غلط ہے۔ خلاصہ یہ کہ عورت کو وزیر اعظم کے منصب پر قائم کرنا صحیح نہیں۔ بلکہ اس کا عزل واجب ہے۔

**سانپ گزر چکا ہے لکیر پیٹنے سے فائدہ؟**

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سانپ گزر چکا ہے، اب لکیر پیٹنے سے فائدہ؟ جو ہونا تھا، سو ہو چکا، اچھا ہوا یا برا ہوا اب علمائے کرام کا اوایل بعد از وقت ہے۔

ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اہل علم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کا صحیح مسئلہ لوگوں کو بتاتے رہیں، اور اگر کوئی غلط اور منکر رواج پائے تو اپنے امکان کی حد تک اس کے خلاف جہاد کریں۔ اور قوم کو اصلاح کی طرف متوجہ کریں کسی منکر کو دیکھ کر اس پر سکوت اختیار کر لینا ان کے لئے جائز نہیں۔ بلکہ اصول یہ ہے کہ جب دین کی ایک مسلمہ روایت سے انحراف کیا جا رہا ہو تو اہل علم پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ججۃ اللہ البالغہ میں غلط رسم کے راجح ہونے کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”اور بری رسم کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی وہ لوگ سردار ہوتے ہیں جن پر جزوی

رائیں غالب ہوتی ہیں اور مصالح کلیہ سے بعید ہوتے ہیں تو وہ درندوں کے سے کام کرنے لگتے ہیں..... ان کی وجہ سے کوئی ان کو برائیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد فاتح فاجر لوگ پیدا ہوتے ہیں وہ ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور ان اعمال کے پھیلانے میں بڑی کوشش کرتے ہیں اور پھر ایک قوم ایسی آتی ہے جن کے دلوں میں نہ اعمال صالحہ کا قوی میلان ہوتا ہے نہ اعمال فاسدہ کا پس اپنے روسا کی حالت دیکھ دیکھ کر ان میں بھی انہی امور کی آمادگی پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی ان کو نیک باتوں کا پتہ ہی نہیں چلتا اور ایسے خاندانوں کے آخر میں ایسے لوگ باقی رہا کرتے ہیں جن کی فطرتیں درست ہوتی ہیں۔ وہ ان سے میل جوں نہیں رکھتے اور غصہ کی حالت میں خاموش رہتے ہیں پس ان کی خاموشی سے بری رسمیں قائم اور مستحکم ہو جاتی ہیں۔ کامل عقل لوگوں کا فرض ہے کہ حق کے پھیلانے میں وجاری کرنے میں اور باطل کے نابود کرنے میں پوری کوشش کریں اور بعض اوقات یہ بات بغیر جھگڑے اور لڑائیوں کے ممکن نہیں ہوتی۔ پس یہ زانی جھگڑے تمام نیک کاموں میں افضل شمار ہوں گے۔ (جیۃ اللہ الباذن مترجم جلد اص ۱۰۰)

ایک خاتون کو اسلامی مملکت میں حکومت کی سربراہ بنانا بھی ایک بری رسم ہے لیکن جو لوگ حضرت شاہ صاحب کے بقول ”مصالح کلیہ سے بعید ہیں۔“ وہ اس پر فخر کر رہے ہیں کہ پاکستان پہلا اسلامی ملک ہے جس نے تاریخ میں ایک خاتون کو وزیر اعظم بنانے کا شرف حاصل کیا۔ اگر ان حضرات کی نظریں دور رہ ہوتیں تو ان کو صاف نظر آتا کہ یہ امر پاکستان کے لئے لاائق فخر نہیں بلکہ لاائق شرم ہے کہ اس نے قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف اور امت اسلامیہ کے اجتماعی فیصلے کے علی الرغم اسلامی تاریخ کی ایک مسلمہ روایت کو توڑنے کی جرأت کی ہے، پاکستان میں اس بدعت سیئہ کی اختراء اور منکر بری رسم کا اجر امتحان اسلامیہ کا سر شرم سے جھکا دینے کے لئے کافی ہے۔ اس بدعت کو جاری کرنے والے گنہگار ہیں اس برائی کا ازالہ ملت اسلامیہ کا فرض ہے اور اس برائی کے خلاف جہاد حضرت شاہ صاحب کے بقول افضل ترین عبادت ہے۔

وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الْحُوْرِ بَعْدَ الْكُورِ وَمِنْ أَهَارَةِ السَّفَهَا وَالنِّسَاءِ  
وَالْغُلْمَانِ وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْأَمِيِّ  
وَاللَّهُ وَاصْحَبُهُ وَاتَّبَاعُهُ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ.

## انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت

از حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

## ووٹ کی اسلامی حیثیت

حمد و شکر اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشنا اور درود وسلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

پاکستان کی تیس سالہ تاریخ میں عوام کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ انہیں اپنی مرضی سے اپنی حکومت منتخب کرنے کا اختیار نہیں ملا یہ شکایت بلاشبہ بجا اور بحق تھی یہ واقعہ ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک انہیں غیر جانب دارانہ عام انتخابات کی سہولت میسر نہیں آسکی۔ دسمبر ۱۹۷۷ء کے مجازہ انتخابات کے ذریعہ انہیں پہلی بار یہ موقع مل رہا ہے، ابھی تک ایکشن کے انتظامات میں جانب داری کا کوئی پہلو سامنے نہیں آیا لہذا جہاں تک ہمارا اندازہ ہے انشاء اللہ یہ انتخابات انتظامیہ کی سمت سے منصفانہ اور غیر جانب دارانہ ہی ہوں گے۔

ان حالات میں پورے ملک کی ذمہ داری عوام پر آپڑی ہے، اب اگر خدا نخواستہ غلط اور نااہل قسم کے لوگ بر سر اقتدار آئے تو اس کی پوری ذمہ داری عوام پر ہوگی اور اس موقع کے بعد حکام کا تمام تر عذاب و ثواب ان لوگوں کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا جو حکام کو منتخب کر کے انہیں اقتدار تک پہنچائیں گے۔

حکومت پر تنقید ہر مہذب ملک میں عوام کا ناگزیر حق سمجھا جاتا ہے جو بہر قیمت باشندوں کو ملنا چاہئے، اس حق کی ضرورت و افادیت ناقابل انکار ہے۔ لیکن ہم نے ماضی میں اس حق کا غلط استعمال بھی کیا ہے، ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اس حق کے استعمال کے بہانے خود اپنی بہت سی کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش کی ہے اور اس پہلو سے بہت کم غور کیا ہے کہ ہمارے حکام بھی درحقیقت خود ہمارے کردار و عمل کا آئینہ ہوتے ہیں، سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب کا دور حکومت اپنی آمربیت اور عوام کی حق تلفی کے لئے آج بہت بدنام ہے، اور

کوئی شک نہیں کہ اس کی بعد عنوانیاں اسی لائق تھیں، لیکن اس دور کی بہت سی خرابیوں کی ذمہ داری خود، ہم پر بھی عائد ہوتی ہے اگر ہم میں خوف، طمع اور ذاتی مفادات پرستی کے جذبات نہ ہوتے تو نہ یہ آمریت ہم پر دس سال تک مسلط رہ سکتی تھی اور نہ اپنے اقتدار کے سامنے میں وہ گل کھلا سکتی تھی جنہوں نے ملک کو مادی اور اخلاقی تباہی کے کنارے پہنچا کر چھوڑا۔

وہ بلاشبہ قابلِ صندوقرین و ملامت ہیں جو اپنی دولت کے سہارے ووٹ خرید کر اقتدار تک پہنچتے ہیں، لیکن ان کے جرم میں وہ عوام بھی برابر کے شریک ہیں جو ہنکنکتے ہوئے سکوں کی آواز سن کر قوم، ملک دین اور اخلاق سب کو بھول جاتے ہیں اور پھر جب ان کے وٹوں کے خریدار اقتدار کی کری پر بیٹھ کر سارے عوام کا خون نچوڑتے ہیں تو یہ اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کے بجائے حکومت پر تقدیم کے بہانے دولت کے کسی نئے سورج کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ اب تک تو یہ خیر کہنے کی گنجائش بھی تھی کہ تینیس سال کی مدت میں ایسے انتخابات ہوئے ہی نہیں جن میں ملک کے تمام بالغ باشندوں کو اپنی رائے کا استعمال کرنے کا موقع ملا ہو، لیکن اگر دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات نہیں نہیں منعقد ہو گئے تو یہ کہنے کا بھی کوئی حق عوام کو نہیں رہے گا، اور اب جو حکومت بھی آئے گی اس کے تمام اعمال و افعال بہا طور پر خود انہی کی طرف منسوب ہوں گے، اور اب اگر حکومت نے لا دینیت کو فروغ دیا، اسلام پر عمل جرائم کی، نظریہ پاکستان کو مٹایا، بد اخلاقی پھیلائی، عربیانی اور فناشی کی حوصلہ افزائی کی، غریب عوام کے حقوق تلف کئے اور ملک و ملت کا خون نچوڑا تو کم از کم باہر کی دنیا میں یہی سمجھا جائے گا کہ اس قوم کی اکثریت یہی کچھ چاہتی ہے، اور (حاکم بدہن) یہ پوری قوم ہی اخلاق باختہ اور قومی و اجتماعی غیرت و حمیت سے خالی ہے۔

دوسری طرف اگر عوام نے اس مرحلے پر اپنی ذمہ داری کا خاطر خواہ احساس کیا، اور خوف و طمع کے محکمات کو قدموں تلے کچل کر پوری دیانت داری اور اجتماعی شعور کے ساتھ اپنے ووٹ کا استعمال کیا تو آنے والی حکومت گذشتہ تینیس سال کے نقصانات کی تلافی کر کے رفتہ رفتہ ماضی کے سرے داغ دھوکتی ہے، اور اس صورت میں پوری دنیا پر یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ یہ قوم آزادی کی قدر پہچانتی ہے اور اس کا صحیح استعمال جانتی ہے۔

جب تک ہم پوری دنیا پر اپنے عمل سے یہ باور نہیں کر سکیں گے کہ ہم ایک مکمل دین اور مستحکم نظام حیات رکھتے ہیں، اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اپنے اس دین سے پھیر نہیں سکتی، اس وقت تک ہمارا ملک بیر و نی سازشوں کی آماجگاہ بنارہے گا، دنیا کی تمام طاقت و رقو میں ہمیں ایک بکاؤ مال سمجھ کر ہماری قومی تشخص، عزت اور آزادی کا نیلام کرتی رہیں گی، لیکن اگر ایک مرتبہ ہم نے اپنے عمل سے دنیا کو یہ بتا دیا کہ کسی دنیوی مصیبت کا خوف یا کسی دنیوی آسائش کا لائق ہمیں اپنے ضمیر کے خلاف زبان قلم یا قدم اٹھانے پر آمادہ نہیں کر سکتا تو یہ خارجی طاقتیں سازشوں کے جال ہزار بن لیں، اللہ کی نصرت سے ہم پر کبھی اپنا تسلط قائم نہیں کر سکیں گی۔

اس لحاظ سے آئندہ ماہ ہونے والے انتخابات عوام کے ہاتھ میں دودھاری تکوar بن کر آ رہے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اس سے اپنے دشمنوں کا خاتمہ کر کے امن و سکون حاصل کر سکتے ہیں، اور چاہیں تو اسی تکوar کو خود اپنے لگے پر چلا کر خود اپنا کام بھی تمام کر سکتے ہیں۔ ماضی کی گندی سیاست نے الیکشن اور ووٹ کے لفظوں کو اتنا بدنام کر دیا ہے کہ ان کے ساتھ مکروفریب، جھوٹ، رشوت اور دغا بازی کا تصور لازم ذات ہو کر رہا گیا ہے، اسی لئے اکثر شریف لوگ اس جھنجھٹ میں پڑنے کو مناسب ہی نہیں سمجھتے، اور یہ غلط فہمی تو بے حد عام ہے کہ الیکشن اور ووٹوں کی سیاست کا دین و مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، اس سلسلے میں ہمارے معاشرے کے اندر چند در چند غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، یہاں ان کا ازالہ بھی ضروری ہے۔

پہلی غلط فہمی تو سیدھے سادے لوگوں میں اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے پیدا ہوئی، اس کا منشاء اتنا برا نہیں، لیکن نتائج بہت بڑے ہیں، وہ غلط فہمی یہ ہے کہ آج کی سیاست مکروفریب کا دوسرا نام بن چکی ہے، اس لئے شریف آدمیوں کو نہ سیاست میں کوئی حصہ لینا چاہئے، نہ الیکشن میں کھڑا ہونا چاہئے اور نہ ووٹ ڈالنے کے خرچے میں پڑنا چاہئے۔

یہ غلط فہمی خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ پیدا ہوئی ہو، لیکن بہر حال غلط اور ملک و ملت کے لئے سخت مضر ہے، ماضی میں ہماری سیاست بلاشبہ مفاد پرست لوگوں کے ہاتھوں گندگی کا ایک تالاب بن چکی ہے، لیکن جب تک کچھ صاف سترے لوگ اسے پاک کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس گندگی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔ اور پھر ایک نہ ایک دن یہ نجاست

خود ان کے گھروں تک پہنچ کر رہے گی۔ لہذا عقلمندی اور شرافت کا تقاضا نہیں ہے کہ سیاست کی اس گندگی کو دور دور سے برا کہا جاتا رہے عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیاست کے میدان کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے چھیننے کی کوشش کی جائے جو مسلسل اسے گندرا کر رہے ہیں۔

پھر آئندہ ماہ کے انتخابات میں چند انتظامی نوعیت کی تبدیلیوں کے لئے منعقد نہیں ہو رہے۔ یہ پورے ملک کی زندگی کا ایک انقلابی موز ہے جس میں ملک و ملت کی قسمت کا فیصلہ ہونا ہے، ان انتخابات میں دو مختلف نظریے اور دو متحارب نظام زندگی ملکرا میں گے، ایک کا کہنا یہ ہے کہ پاکستان میں ایک معاشری ضرورت کے تحت بنا تھا، اس کا کوئی مستقل نظریہ نہیں ہے، اس کائنات پر حکومت انسانی خواہشات کی ہے، وہی اچھے برے کا فیصلہ کرے گی، اور وقت کے لحاظ سے زندگی کا جو دستور بھی سمجھ میں آجائے گا، اسی کے مطابق زندگی کو ڈھال لیا جائے گا، اور دوسرے اک دعویٰ یہ ہے کہ اس کائنات پر حاکمیت صرف اللہ کی ہے، اچھے برے کا فیصلہ کرنے والا وہی ہے، پاکستان اسی کے نام پر بنا تھا، یہاں اسی کا قانون چلے گا اسی کی بات مانی جائے گی، اور سیاست و معیشت سے لے کر پرائیویٹ زندگی تک ہر معاملے میں اسی کے احکام واجب الاطاعت ہوں گے۔

ان حالات میں جب کہ ایسا اسلام اور لاد بینیت کی اور پاکستان کی بقاء و فنا کی ہے، کسی بھی باشمور شخص کے لئے غیر جانبدار رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس وقت ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی ساری توانائیاں اسلامی قوتوں کو مدد پہنچانے میں صرف کرے، اس موقع پر خاموش بیٹھنا بھی ایسا ہی جرم ہے جیسا دشمن کو تقویت پہنچانا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ النَّاسُ أَذَارُوا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلَى يَدِيهِ أَوْ شَكَّ إِنْ يَعْمَلُمُ اللَّهُ بِعِقَابٍ (جمع الفوائد ص ۲۵۱، بحوالہ ابو داؤد ترمذی)

اگر لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا عذاب عام نازل فرمائیں۔

اگر آپ کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ ظلم ہو رہا ہے، اور انتخابات میں سرگرم حصے لے کر

اس ظلم کو کسی نہ کسی درجے میں مٹانا آپ کی قدرت میں ہے تو اس حدیث کی رو سے یہ آپ کا فرض ہے کہ خاموش بیٹھنے کے بجائے ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس ظلم کو روکنے کی مقدور بھروسہ کریں۔ بہت سے دین دار لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنا ووٹ استعمال نہیں کریں گے تو اس سے کیا نقصان ہو گا؟ لیکن سنئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں؟

حضرت سہیل بن عیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مند احمد میں روایات ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اذل عنده مومن فلم بنصره وهو يقدر على ان يصره ازله الله على رؤوس المخلائق (ایضاً ص ۱۵ ج ۲)  
نصرت کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کی مدنہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے برسر عام رسوأ کرے گا۔

شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت، شہادت، گواہی کی سی ہے اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

و لا تكتمو الشهادة ومن يكتمها فانه اثم قوله اور تم ..... گواہی کونہ چھپا اور جو شخص اس گواہی کو چھپائے، اس کا دل گناہ گار ہے۔ اور جو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من كتم شهادته اذا دعى اليها كان كمن شهد بالزور

(جمع الفوائد بحوالہ طبرانی ص ۶۲ ج ۱)

جس کسی کو شہادت کے لئے بلا یا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا۔

بلکہ گواہی دینے کے لئے تو اسلام نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی انسان اپنایہ فریضہ ادا کر دے، اور اس میں کسی کی دعوت یا ترغیب کا انتظار بھی نہ

کرے، حضرت زید بن خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا الا اخبار کم بخیر الشہدہ الذی یاتی یشهادتہ قبل ان یسالہا (ایضاً ص ۲۶۱ ج ابوالمالک مسلم وغیرہ)

کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی ادا کر دے۔

ووٹ بلاشبہ ایک شہادت ہے قرآن و سنت کے یہ تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، لہذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضا نہیں اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یوں بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر شریف، دیندار اور معتدل مزاج کے لوگ انتخابات کے تمام معاملات سے بالکل یکسر ہو کر بیٹھ جائیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ یہ پورا میدان، شیریوں، فتنہ پردازوں اور بے دین افراد کے ہاتھوں میں سونپ رہے ہیں، ایسی صورت میں کبھی بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ حکومت نیک اور اہلیت رکھنے والے افراد کے ہاتھ میں آئے، اگر دین دار لوگ سیاست سے اتنے بے تعلق ہو کر رہ جائیں تو پھر انہیں ملک کی دینی اور اخلاقی تباہی کا شکوہ کرنے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا، کیونکہ اس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے اور ان کے احکام کا سارا اعذاب و ثواب ان ہی کی گردن پر ہو گا اور خود ان کی آنے والی سلسلیں اس شر و فساد کی طرح محفوظ نہیں رہ سکیں گی جس پر بند باندھنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔

انتخابات کے سلسلے میں ایک دوسری غلط نہیں پہلی سے زیادہ سنگین ہے، چونکہ دین کو لوگوں نے صرف نماز روزے کی حد تک محدود سمجھ لیا ہے، اس لئے سیاست و معیشت کے کاروبار کو وہ دین سے بالکل الگ تصور کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارے معاملات دین کی گرفت سے بالکل آزاد ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنی نجی زندگی میں نماز روزے کے اور وظائف و اوراد تک کے پابند ہوتے ہیں، لیکن نہ انہیں خرید و فروخت کے معاملات میں حلال و حرام کی فکر ہوتی ہے، نہ وہ نکاح و طلاق اور برادر یوں کے تعلقات میں دین کے احکام کی کوئی پرواکرتے ہیں۔

ایے لوگ انتخابات کو بھی ایک خالص دنیاوی مoad سمجھ کر اس میں مختلف قسم کی بدعنایوں کو گوارا کر لیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ان سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوا ہے، چنانچہ بہت سے لوگ نہ ووٹ اپنی دیانتدارانہ رائے کے بجائے محض ذاتی تعلقات کی بنیاد پر کسی نااہل کو دے دیتے ہیں، وہ دل میں خوب جانتے ہیں کہ جس شخص کو ووٹ دیا جا رہا ہے وہ اس کا اہل نہیں یا اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص اس کا زیادہ حق دار ہے لیکن صرف دوستی کے تعلق، برادری کے رشتے یا ظاہری مردوں سے متاثر ہو کر وہ اپنے ووٹ کا غلط جگہ استعمال کر لیتے ہیں اور کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ شرعی و دینی لحاظ سے انہوں نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، ووٹ ایک شہادت ہے۔

واذ قلتُمْ فاعدُلُوا وَلُوْ كَانَ ذَاقُرْبَىْ (اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کو خواہ وہ شخص جس کے خلاف بات کی جا رہی ہے) تمہارا قرابت داری کیوں نہ ہوں۔

جب کسی شخص کے بارے میں ضمیر اور دریافت کا فیصلہ یہ ہو کہ وہ ووٹ کا مستحق نہیں ہے، یا کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلے میں زیادہ اہلیت رکھتا ہے تو اس وقت محض ذاتی تعلقات کی بنا پر اسے ووٹ دے دینا "جوہنی گواہی" کے ذمیل میں آتا ہے قرآن کریم میں جھوٹی گواہی کی نہ مرت اتنی شدت کے ساتھ کی گئی ہے کہ اسے بت پرستی کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے ارشاد ہے۔

"فَجِنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتِنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ"

پس تم پر ہیز کرو بتوں کی نجاست سے اور پر ہیز کرو جھوٹی بات کہنے سے وعید یں اور حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر جھوٹی گواہی کو اکبر الکبار میں شمار کر کے اس پر سخت وعید یں ارشاد فرمائی ہیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اکبر الکبار (بڑے بڑے گناہ) نہ بتاؤ؟ (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی اور خوب اچھی طرح سنو! جھوٹی گواہی، جھوٹی بات، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکمیل گائے ہوئے بیٹھے تھے، جب جھوٹی گواہی کا ذکر آیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور "جھوٹی گواہی" کا لفظ بار بار ارشاد فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم دل میں کہنے لگے کہ

کاش آپ خاموش ہو جائیں۔ (بخاری و مسلم جمع الفوائد ص ۱۶۲، ج ۲)

یہ وعید یہ تو صرف دوٹ کے اس غلط استعمال پر صادق آتی ہیں جو محض ذاتی تعلقات کی بناء پر دیا گیا ہو، اور روپے پیے لے کر کسی نااہل کو دوٹ دین میں جھوٹی گواہی کے علاوہ رشوت کا عظیم گناہ بھی ہے۔

لہذا دوٹ ڈالنے کے مسئلہ کر ہرگز یوں نہ سمجھا جائے کہ یہ ایک خالص دینیوی مسئلہ ہے اور دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں، یقین رکھئے کہ آخرت میں ایک ایک شخص کو اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور اپنے دوسرے اعمال کے ساتھ اس عمل کا بھی جواب دینا ہے کہ اس نے اپنی اس شہادت کا استعمال کس حد تک دیانت داری کے ساتھ کیا۔

بعض حضرات یہ بھی سوچتے ہیں کہ اگر نااہل کو دوٹ دینا گناہ ہے تو ہم کون سے پاک باز ہیں؟ ہم صبح سے لے کر شام تک بے شمار گناہوں میں ملوٹ رہتے ہیں، اگر اپنے گناہوں کی طویل فہرست میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو جائے تو بھی کیا حرج ہے؟

لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ یہ نفس و شیطان کا سب سے بڑا دھوکہ ہے، اول تو انسان اگر ہر گناہ کے ارتکاب کے وقت یہی کچھ سوچا کرے تو وہ کبھی کسی گناہ سے نہیں نج سکتا، اگر کوئی شخص تھوڑی سی گندگی میں ملوٹ ہو جائے تو اس کو اس سے پاک ہونے کی فکر کرنی چاہئے نہ یہ کہ وہ غلاظت کے کسی تالاب میں چھلانگ لگادے۔

دوسرے گناہ گناہ کی نوعیتوں میں بھی بڑا فرق ہے جن گناہوں کے نتائج بد پوری قوم کو بھگتے ہیں، ان کا معاملہ پرائیویٹ گناہوں کے مقابلے میں بہت سخت ہے، انفرادی نوعیت کے جرائم، خواہ اپنی ذات میں کتنے ہی گھناؤ نے اور شدید ہوں، لیکن ان کے اثرات دوچار افراد سے آگئے نہیں بڑھتے۔ اس لئے ان کی تلافی بھی عموماً اختیار میں ہوتی ہے، ان سے توبہ استغفار کر لینا بھی آسان ہے، اور ان کے معاف ہو جانے کی امید بھی ہر وقت کی جاسکتی ہے، اس کے برخلاف جس گناہ کا برائیتی پورے ملک اور پوری قوم نے بھگتا ہو، اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں، یہ تیرکمان سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آ سکتا اس لئے اگر کسی وقت انسان اس بدلی سے آسندہ کے لئے توبہ کر لے تو کم از کم ماضی کے جرم سے عہدہ برا

ہونا بہت مشکل ہے، اور اس کے عذاب سے رہائی کی امید بہت کم ہے۔  
اس حیثیت سے یہ گناہ چوری، ڈاکہ، زنا کاری اور دوسرے تمام گناہوں سے شدید تر  
ہے۔ اور اسے دوسرے جرائم پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

یہ درست ہے کہ ہم صبح و شام میں یوں گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، لیکن یہ سب گناہ  
ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت توبہ کی توفیق بخشنے تو معاف بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی تلافی بھی  
کی جاسکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنی گردن ایک ایسے گناہ میں بھی پھنسا  
لیں جس کی تلافی ناممکن اور جس کی معافی بہت مشکل ہے۔

بعض لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ لاکھوں ووٹوں کے مقابلے میں ایک شخص کے دوٹ کی کیا  
حیثیت؟ اگر وہ غلط استعمال بھی ہو جائے تو ملک و قوم کے مستقبل پر کیا اثر انداز ہو سکتا ہے؟  
لیکن اول تو اگر ہر شخص دوٹ ڈالتے وقت یہی سوچنے لگے تو ظاہر ہے کہ پوری آبادی  
کوئی ایک دوٹ بھی صحیح استعمال نہیں ہو سکے گا۔ پھر ووٹوں کی کتنی کا جو نظام ہمارے یہاں  
رانج ہے۔ اس میں صرف ایک ان پڑھ جاہل شخص کا دوٹ بھی ملک و ملت کے لئے فیصلہ کن  
ہو سکتا ہے، اگر ایک بے دین، بد عقیدہ اور بد کردار امیدوار کے بیٹ بکس میں صرف ایک  
دوٹ دوسروں سے زیادہ چلا جائے تو وہ کامیاب ہو کر پوری قوم پر مسلط ہو جائے گا۔ اس  
طرح بعض اوقات صرف ایک جاہل اور ان پڑھ انسان کی معمولی سی غفلت، بھول چوک یا  
بد دیانتی بھی پورے ملک کو تباہ کر سکتی ہے اس لئے مر جہ نظام میں ایک ایک دوٹ قیمتی ہے  
اور یہ ہر فرد کا شرعی، اخلاقی، قومی اور ملی فریضہ ہے کہ وہ اپنے دوٹ کو اتنی ہی توجہ اور اہمیت  
کے ساتھ استعمال کرے جس کا وہ فی الواقعہ مستحق ہے۔ محمد تقی عثمانی

## اسلامی مملکت میں حکومت الہیہ

از مولانا محمد متین الخطیب صاحب رحمہ اللہ

خطبہ ما ثورہ کے بعد فرمایا !!!

آج دنیا میں اسلامی حکومتوں کی تعداد کافی ہے لیکن ایسی حکومت کوئی نہیں ہے جسے حکومت الہیہ کا نام سے جانا چاہئے اس لئے میں نے گزشتہ شمارہ میں "البلاغ" میں مملکت اسلامیہ کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اور جسے البلاغ والوں نے از راہ کرم پورا کا پورا شائع کر دیا جس کے بعد مختلف حضرات نے وضاحت طلب کی ہے جس کی وجہ سے اپنی ضعیفی اور کمزوری کے باوجود یہ وضاحت پیش کر رہا ہوں۔

در اصل آج کل جب سے پاکستان کی موجودہ حکومت نے نفاذ اسلام کا بیڑہ اٹھایا ہے لوگوں میں کچھ ہنی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ انتظامی ادارے مختلف تضادات کا شکار ہیں اور جب عملی صورت سامنے آتی ہے تو لوگ ہیران ہو کر پوچھتے ہیں کہ کیا یہی اسلام ہے جس کا ڈھنڈ و راپیٹا جا رہا ہے اب ذرا سمجھئے بنیادی بات یہ ہے کہ اس کائنات کا حقیقی خالق و مالک خدا ہے اسی کی مطلق حکومت ہے جس کے دو طریقے ہیں ایک تکوینی حکومت دوسرے تشریعی حکومت تکوینی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کو بنانے اور پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے جس نے اپنی مخلوق اور کائنات کی فطرت بنیادی امور اور ایک ایسا مکمل نظام جاری فرمایا جس میں بال برابر کی بیشی یا تبدیلی نہیں ہوئی اس کی حاکمیت کی باگ ڈور بھی حق تعالیٰ نے اپنے دست قدرت میں رکھی ہے اور ساری کائنات اس کی محکوم ہے انسان بھی اس کی مخلوق ہے جو اس لحاظ سے اشرف المخلوقات ہے کہ اس میں چند ایسی خوبیاں رکھی گئی ہیں جو دوسری مخلوقات میں نہیں ہیں مثلاً علم و حکمت اور قوت ارادی اور خیر و شر کی تیز و غیرہ جس کے نتیجے میں وہ کائنات کے راز معلوم کر سکتا ہے اور اس میں اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر بڑے بڑے کام انجام دے سکتا ہے اور خلافت الہیہ کا فریضہ بہ حسن و خوبی انجام دے سکتا ہے جس کے لئے اسے خدا نے چند قواعد و ضوابط کا پابند کر رکھا ہے جن کے تحت وہ جو کچھ کرتا ہے اسے حکومت تشریعی کہتے ہیں یہ نظام حکومت وحی الہی کے ذریعہ حق تعالیٰ نے انسان کے پر فرمایا ہے جو ہر دور میں انبیاء کرام

اور رسولان عظام لوگوں کو وجہ الہی کی صورت میں بتلاتے رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں خداوند قدوس نے انسان کو زندگی بس رکرنے کے جو طور و طریقے بتلائے ہیں ان پر چلنا انسانی سعادت ہے اور ان کی خلاف ورزی کرنا شقاوت و نافرمانی ہے اسلام ایک نظریاتی اساس ہے مثلاً کائنات کے ہر حصے میں فرمانبرداری و تابعداری کا فرمایہ ہے یہی مفہوم اسلام کا مفہوم ہے پھر انسان کو بھی اپنے تمام کاموں میں تابعداری اور فرمانبرداری کا عملی مظاہرہ کرنے کا حکم ہے یہ حکم انفرادی و اجتماعی طور پر دیا گیا ہے اور فرمان الہی ہے۔

وَلَهُ اسْلَمَ مِنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا (آل عمران: ۸۳)

یعنی اسی خدا کی فرمانبرداری و اطاعت آسمانوں اور زمین کے اندر سب پر ہے خواہ خوشنی سے کریں یا زبردستی سے کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شرعی قوانین وہ ہیں جنہیں خدا نے نازل کیا ہے اور جن پر عمل کر کے اس کے آخری رسول نے دکھلادیا ہے۔ یہ ہی قرآن و سنت کا مفہوم ہے، اس لحاظ سے اسلامی مملکت میں کسی کی رائے اور نظر جحت ہو سکتی ہے اور نہ اسے لوگوں کے لئے نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی اسلامی حکومت کا سربراہ ایسا کرنے کا مجاز ہے قرآن کریم میں واضح الفاظ میں حکم ہے ان الحکم الا لله (سورہ یوسف آیت ۲۵) یعنی قانون اور حکم و فرمان صرف خدا کا چلے گا اس واضح حکم کے بعد بھی اگر کوئی عام آدمی یا سربراہ حکومت اپنی من مانی کرنا چاہتا ہے تو وہ کان کھول کر سن لے من لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلَنَک هم الکافرون (ما نہ آیہ ۲۳) و من لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلَنَک هم الظالموں (ما نہ آیہ ۲۷) و من لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلَنَک هم الفاسقون (ما نہ آیہ ۲۷) ان آیات میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمارے نازل کردہ قوانین کے خلاف قانون جاری کرنے والا کافر۔ ظالم۔ فاسق ہی ہو سکتا ہے مسلمان نہیں ہو سکتا دراصل اللہ کی حاکیت کے تحت انسان کی حاکیت ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ آپ یہ کہیں گے کہ دنیا میں تو سینکڑوں حکومتیں ایسی ہیں جو خدا کی حاکیت کے خلاف ہیں یا انکار کرتی ہیں۔ مگر یہ بھی سوچئے کہ ایسی حکومتیں خود کو اسلامی حکومت شمار نہیں کرتیں اس لئے وہ اسلامی احکام کی پابند نہیں ہیں۔

الغرض حکومت الہی یا اسلامی حکومت کی کچھ ذمہ داریاں ہیں اور اس حکومت کے باشندوں کے کچھ فرائض ہیں اس طرح اسلام نے حقوق فرائض کے نام سے کچھ احکامات

بھی دیئے ہیں میرے خیال میں ہمارے معاشرے میں تمام خرایوں کی بیاناد صرف یہ ہے کہ ہمیں اپنے حقوق تو یاد آتے ہیں لیکن ذہن کے کسی گوشے میں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ ہم پر اسلامی مملکت کے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں بھی ہیں ہر طبقہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے انتہائی چاک دست ہے اس کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ نظرہ بازی اور جلسے جلوس سے کام لیتا ہے مگر فرائض اور اپنی ذمہ داریوں سے چشم پوشی یا کنارہ کشی کر لیتا ہے یہی وہ خرابی ہے جس کی طرف ہم توجہ نہیں دیتے، اس خرابی اور خطرناک ذہنیت کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے اس کش مکش کے لئے ایک متوازن حل یہ ہے کہ اسلام نے ہر شخص اور ہر طبقے کی ذمہ داریاں طے کر دی ہیں اب کام صرف یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کی ذمہ داریوں اور فرائض کا احساس دلایا جائے اور بتلایا جائے کہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بغیر حقوق ملنے کی توقع رکھنا غلط ہے مثلاً اسلام نے حاکم اور محکوم کے تعلقات پر واضح احکامات دیئے ہیں تاکہ دونوں کے تعلقات کو استوار رکھا جائے دونوں میں خوشنگوار فضای پیدا کی جائے تاکہ مملکت کے انتظام کو اندر و فی خلف شارفت و فساد اور ظلم و زیادتی آپس میں رکشی وغیرہ سے محفوظ رکھا جاسکے حق تعالیٰ نے اسی لئے ہر فریق کو اس کے حقوق و فرائض بار بار یاد دلائے ہیں اور ساتھ ہی صبر و شکر کی تلقین بھی فرمائی ہے۔ مثلاً

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی یہی صورت حاکم وقت کی ہے وہ تو ایک ڈھال ہے جس کے زیر سایہ دشمن سے جنگ کی جاتی ہے اور مملکت کے لوگوں کا بچاؤ کیا جاتا ہے وہ اگر انصاف کرے گا تو ثواب کا مستحق ہو گا ورنہ عذاب الہی اس کے لئے تیار ہے، ایک اور حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا کہ اگر رعایا اپنے حاکم اعلیٰ سے کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اسے مطلع کرے اور صبر سے کام لے کیونکہ اس کے ذمہ اس کا فریضہ ہے اور تمہارے ذمہ تمہارا فریضہ ادا کرنا ہے اس قسم کی بہت سی آیات و احادیث ہیں جن میں معاملگی کا حکم ہے رعایا کے دکھ درد اور شکایات دور کرنے کی تلقین ہے اور واضح الفاظ میں بتلایا گیا ہے کہ جس حاکم کو حق تعالیٰ نے

کری عطا فرمائی ہے اگر وہ خیر خواہی کے ساتھ لوگوں سے پیش نہیں آتا تو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے اور وہ جہنم کا حقدار ہے ایک اور حدیث میں حضرت عوف بن مالک سے روایت ہے تمہارے بہترین حکام وہ ہیں جنہیں تم پسند کرتے ہو اور وہ تم سے خوش ہیں اور بدترین وہ ہیں کہ تم جسے پسند نہ کرو اور وہ تم سے خوش نہ ہو اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ حاکم اور رعایا عدل و انصاف سے کام لیتے ہوں اسلامی حکومت کی بنیاد ہی عدل و انصاف پر قائم ہے قرآن حکیم میں جگہ جگہ عدل و انصاف پر زور دیا ہے اسی خوبی کی وجہ سے نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت کو اسلامی نظام کا مستند حصہ تسلیم کیا ہے پھر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جانشین خلفاء کے اسوہ حسنہ کی پیروی کو ضروری قرار دیا ہے حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں فرمایا ہے، دین و عبادت کا نظام و انتظام سنت رسول کی پیروی کے بغیر نہیں ہو سکتا اور سیاست کبریٰ (حکومت اسلامیہ) کا نظام خلفائے راشدین کی پیروی و اتباع کے بغیر نہیں چلایا جا سکتا۔ ”باب الاعتصام“ ان حوالوں سے یہ معلوم ہوا کہ قیامت تک جو مسلم حاکم اولو الامر کے منصب پر فائز ہوں گے ان کا یہ فریضہ منصبی ہو گا کہ وہ شرعی قوانین اور حدود و تعزیرات اسلامی کو قائم کریں اگر وہ اس میں کوتا ہی کریں گے تو لوگ انہیں نکال باہر کر دیں گے اور وہ آخرت کے مواخذہ سے نفع سکیں گے غرض قرآن و سنت کے احکام کا جس قدر احترام ہو سکتا ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور بعد میں آپ کے صحیح جانشین حضرات نے بھی اس کا خیال رکھا اصل بات یہ ہے کہ کری اقتدار پر قرآن جلوہ افروز ہوتا ہے تو بے لگ عدل و انصاف کی کار فرمائی ہوتی ہے قرآن کے عادلانہ نظام کے سامنے سب شاہ و گدا برابر ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی قرآنی احکام اور حدود اللہ کی بے حرمتی کی ہواں کا تو خیال ہی نہیں آ سکتا اس کے برخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملات میں بھی اس کے احترام کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا ہے یہ ہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ حضرت کرم علی کرم اللہ وجہ نے احکام شرعیہ میں فرمایا ہے اگر ضرورت پڑے تو مسلم حکمرانوں پر حدود قائم کرنا جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے فقهاء نے لکھا ہے کہ حکومت اسلامیہ پر بغیر کسی دوسرے کے دعویٰ کے حددوں اللہ جاری کرنا واجب ہے اسی طرح جرائم پر شہادتیں قائم کرنا واجب ہے یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ حکومت اسلامیہ دراصل حکومت الہمیہ ہوتی ہے البتہ اس حکومت کا اجراء اللہ

تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں اور اطاعت گزاروں کے ہاتھ سے کرایا جاتا ہے چند ضوابط و اصول اور شرائط اس کے لئے قرآن و سنت میں مقرر ہیں جن کا احترام اور حافظ رکھنا ضروری ہے اس طرح حاکیت کو اس کے خالق و مالک اور صاحب اختیار و قدرت کی صورت میں روشناس کرتا ہے اور انسانوں کی حاکیت کو خدا کے تابعداروں اور ماننے والوں کی خلافت و حکومت الہیہ کے رنگ میں پیش کرتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے

درحقیقت مالک ہر شے خدا است ایں امانت چند روزہ نزد ما است

اور یہ ہمارا دینی عقیدہ بھی ہے کہ حکومت اسلامیہ ہمارے پاس خدا کی امانت ہے اور امتہ اسلامیہ کو آزادانہ طور پر حکومت چلانے کا حق ہے بشرطیکہ ان حقوق و فرائض کا خیال رکھا جائے جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے مقرر فرمادیئے ہیں اسلامی حکومت میں کسی فرد کسی گروہ کسی پارٹی ڈکٹیٹر کو یہ حق ہرگز ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی مرضی سے آئے دن قوانین نافذ کرتے رہیں بلکہ قرآن و سنت کو بنیاد بنا کر فقہاء اور اسلامی قوانین کے جانے والے لوگ دلائل شرعی کے ساتھ کوئی قانون بناسکتے ہیں جسے ہر دور میں پرکھا جائے گا کہ اس سے عوام کو کس قدر فائدے حاصل ہوتے ہیں اور کہیں وہ اسلام کی بنیادی اساس کے لئے نقصان دہ تو نہیں ہو رہا ہے اگر ایسا ہے تو علماء اور فقہاء دین اسلام اس پر غور کر کے قیاس و اجتہاد سے اس قانون کو مسترد کر سکتے ہیں مختصر یہ ہے کہ حاکیت مسلم بھی ایک حاکیت الہیہ ہو سکتی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو وہ ایک خطرناک صورت ہو سکتی ہے جو ڈکٹیٹر شپ میں تبدیل ہو جائے گی جس کی وجہ سے کچھ علماء سونے خائن و ظالم سلاطین کی ہمنوائی کر کے پچھلے زمانوں میں اسلام کو ایسا نقصان پہنچایا ہے کہ آج تک اس کی تلاشی نہیں ہو سکی اس کے نتیجے میں غیر مسلم طبقے اور خود اسلام سے ناواقف مسلم طبقات بھی اسلامی احکام کا مذاق اڑاتے ہیں آج بھی ہمارے وہ نوجوان جو اسلام سے بے بہرہ ہیں پوچھتے ہیں کہ کیا عوام اور نوجوان نسل موجودہ دور میں اسلامی قوانین سے مستفیض ہو سکتے ہیں آج ہم اس کا جواب صحیح اور موثر طریقہ پر اسلامی قوانین کو نافذ کر کے ہی دے سکتے ہیں جس کے لئے مسلمانوں کو آگے بڑھ کر قرآن و سنت پر خود عمل کر کے دکھانا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اعلیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

## اسلامی حکومت کا بنیادی اصول شوری

یہ مقالہ حضرت مفتی عقیق الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے

نفاذ شریعت کے بین الانقوامی سیمینار منعقدہ اسلام آباد میں پڑھا

اسلامی حکومت کے اصول و مبادی بہت سے ہیں اس مختصر وقت میں ان سب کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے دوسرے اصولوں کے متعلق دیگر فضلاً گرامی اپنے خیالات پیش کریں گے میں اس موقع پر اسلامی حکومت کے اصول شوری کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی اختصار کے ساتھ کیونکہ عام مشاہدہ ہے کہ اس طرح کے اجتماعات میں کسی طویل مقالہ کا پڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔

شوری درحقیقت رائے عامہ کے اظہار کا نام ہے مفردات القرآن میں امام راغب اصفہانی نے تصریح کی ہے کہ شوری کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی رائے معلوم کی جائے اور یہی اصول ہے جو موجودہ زمانے کے پار یہاں تک نظام کی بنیاد ہے اور جس کی داغ بیل اسلام نے اس وقت ڈالی تھی جب کہ یورپ جمہوریت اور پارلیمنٹ کے مفہوم سے بھی نا آشنا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا و شاورہم فی الامر (یعنی حکومت کے معاملات میں نظام شوری اختیار کیجئے) اور مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے بارے میں یہ اصول طے کر دیا گیا کہ امرہم شوری بینہم یعنی ان کے تمام کام شوری کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔

اسلامی قانون کے ماہرین اور علماء اسلام کے نزدیک یہ بات طے ہو چکی ہے کہ شوری اسلامی حکومت کی اساس اور اس کے فیصلوں کی بنیاد ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کرتے ہیں کہ جب شوری کا حکم آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ شوری سے مستغتی ہے مگر یہ حکم امت کے لئے رحمت ہے اور جو اس حکم پر عمل کرے گا وہ اعلیٰ درجہ کی راہ نمائی سے محروم نہ ہو گا۔ اور جو شوری کو ترک کرے گا وہ غلط روی سے نج نہ سکے گا۔ (روح المعانی)

ابن جریر کی روایت ہے۔ قادہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی نازل ہونے کے باوجود اپنے اصحاب سے مشورے کا حکم ملتا تھا اور یہ اس لئے تھا کہ قوم کو پوراطمینان حاصل ہو جائے اور یہ کہ شوریٰ امت کے لئے قانون بن جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اپنے رفقاء سے مشورہ کرنے میں اتنا زیادہ سرگرم ہو جس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ (ترمذی)

اسی مفہوم کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی مردی ہے ایک مرتبہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تحریری طور پر ہدایت کی کہ رسول اللہ صلیم قانون شوریٰ پر عامل تھے تم بھی لازماً اس پر عمل کرنا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حضرت عمر کے عامل سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ عورتوں سے بھی مختلف معاملات میں رائے لیتے تھے۔ (تفیری مظہری جلد دوم ص ۱۶۱)

مولانا شاء اللہ پانی پتی نے ضحاک کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ فاروق اعظم نے عورتوں کو بھی حق رائے دیا تھا۔ ان امور کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے لئے ایک مجلس شوریٰ بنائے کیونکہ ایک شخص ہر معاملہ میں اتنی واقفیت اور معاملہ مہارست نہیں رکھتا جتنا معاشرہ کے دوسرا افراد رکھتے ہیں مگر دور میں اجتماعی مشوروں کے لئے دارالریم کو مجلس شوریٰ کا ایوان بنایا گیا تھا۔ مدنی دور میں حضور کے زمانہ تک کھلے میدانوں کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور مسجد نبوی میں اس طرح کے اجتماعات ہوتے تھے خلافت راشدہ میں سب سے پہلے سیفیہ بنی ساعدہ سے ایوان شوریٰ کا کام لیا گیا۔

جب اسلامی حکومت کے اصول اور اساس کی حیثیت سے شوریٰ کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امیر حکومت یا خلیفہ وقت یا امام المسلمين شوریٰ کے فیصلے کا پابند ہے یا نہیں۔ ہم اپنے اس مقالہ کو اس بحث پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس لئے کہ اسلامی نظام حکومت میں امیر کی حیثیت کے نزدیک آمر مطلق یعنی ذکریشہ کی ہو جاتی ہے۔ اور شوریٰ کی حیثیت اور اہمیت صفر کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اسلامی حکومت شوریٰ حکومت اور امام اس کا با اختیار رہنا اور صاحب تنقید قوت ہے۔ اس لئے

قدرتاً امام شوریٰ کے اختیارات کے نمائندہ ہے۔ اور انتظامی معاملات میں مجلس شوریٰ کے فیصلوں کا ترجمان۔ قرآن کریم میں ہے۔ امرہم شوریٰ بینہم یعنی مسلمانوں کے معاملات اور انتظامی امور آپ کے مشورہ سے انجام پاتے ہیں یہ حکم عام ہے اور حکومت کے صدر نہیں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجلس شوریٰ کے فیصلہ دینے کے بعد اپنی کسی ذاتی رائے پر عمل کرنے جو مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے خلاف ہو حکومت کے امیر اور سربراہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ارباب حل و عقد سے مشورہ لے اور اس مشورہ کی پابندی کرے۔

بہت سے حضرات کو قرآن مجید کی ایک دوسری آیت سے غلط فہمی ہوتی ہے اور انہوں نے اس سے غلط نتیجہ نکالا ہے وہ آیت یہ ہے وشاورہم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی الله یعنی معاملات میں اپنے اصحاب سے مشورہ کر لیا کیجئے اور جب معاملہ متعلقہ میں عزم کر لیں تو اعتماد خدا ہی پر رکھئے۔

ان الفاظ سے بہت سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ مشورہ کرنا تو امام کے لئے ضروری ہے مگر مشورے کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ آئیے غور کریں کہ عزم سے پیدا ہونے والی رائے شوریٰ کے فیصلے کی پابند ہے یا نہیں۔ غور فرمائیے کہ قرآن میں شوریٰ کو پہلے ذکر کیا گیا ہے اور عزم کو بعد میں اس لئے منشاء اور مقصد یہ ہے کہ کسی معاملہ کو طے کرنے کے لئے مجلس شوریٰ کو طلب کیا جائے۔ اور مجلس جو فیصلہ کر دے وہ عزم کی بنیاد بن جائے ظاہر ہے کہ اگر امیر یا امام شوریٰ کے فیصلہ کو نظر انداز کر دیا کرے گا اور ذاتی و شخصی رائے پر عمل کرتا رہے گا تو یہ بات مجلس شوریٰ کے لئے ازالہ حیثیت عرفی کے مترادف ہو گی۔ اور ایسے امیر اور ایک ڈکٹیٹر کے درمیان کیا فرق رہ جائے گا دوسری بات یہ ہے میں میں رکھنے کی ہے اس آیت میں خطاب بطور خاص رسول کریم صلیعہ سے ہے اور پیغمبر کے احکام شوریٰ کے باوجود بھی واجب التعمیل ہوتے ہیں۔ کیونکہ پیغمبر کی ایک حیثیت تو یہ ہوتی ہے کہ اس زمین پر خدا کی آواز ہوتی ہے اس آیت کی رو سے کسی صدر حکومت کو وہ اختیارات حاصل نہیں ہوتے جو آپ کی ذات کو مخاطب کر کے آپ کے ساتھ مخصوص کر دیئے گئے ہوں۔ ہمارا مقصد اس بحث سے یہ ہے کہ اس بات سے اگر کسی کو انکار ہے کہ عزم کا تعلق مجلس شوریٰ کے فیصلہ سے

بھی ہے تو بھی یہ بات نظر انداز کرنے کی نہیں ہے کہ یہ حکم پیغمبرانہ حیثیت کی وجہ سے آپ کے ساتھ مخصوص ہے۔ امرہم شوریٰ بینہم یعنی مسلمانوں کے کام شوریٰ سے طے پاتے ہیں قرآن میں یہ الفاظ ایک مستقل دفعہ کی صورت میں موجود ہیں اور اس کے خلاف کسی حکومت کا کوئی امیر حرکت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ابن کثیر نے آیت عزم کی تشریح کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

### مشاورہ اہل الرای ثم اتباعہم

یعنی اہل الرای کا باہمی مشورہ اور اس کے بعد شوریٰ کے فیصلہ کی پیروی تو عزم حقیقت میں وہ ارادہ ہے جو امام کے دل میں شوریٰ کے فیصلہ پر کار بند ہونے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اسی آیت عزم کے سلسلہ میں احکام القرآن میں امام ابو بکر الجہاں نے واضح طور پر لکھا ہے وہی ذکر العزیمة عقیب المشاورۃ دلالة علی انہا صدرت عن المشورۃ یعنی قرآن میں عزم کا ذکر شوریٰ کے بعد آیا ہے۔ اور یہ اس کی دلیل ہے کہ فیصلہ اور عزم وہی معتبر ہے جو شوریٰ کے فیصلہ کا نتیجہ ہو اور شوریٰ سے صادر ہوا ہو۔ حافظ ابن کثیر نے بھی یہی لکھا ہے۔ ان تمام تصریحات کے بعد امام کے شخصی فیصلہ کو شوریٰ کے فیصلہ پر ترجیح دینا درست نہیں ہوگا۔ اگر کسی کا ذہن ان تصریحات سے مطمئن نہیں ہوتا ہے اور اس کا یہ اصرار قائم رہتا ہے کہ امام کے شوریٰ کے فیصلہ کے پابند ہونے پر کوئی صراحت انص م موجود نہیں ہے تو وہ اس بات کا اقرار کم سے کم کریں گے کہ اس دائرہ خاص میں کوئی واضح اور متعین حکم موجود نہیں ہے۔ ان اصحاب کے لئے اکیلے سوچنے کی بات یہ ہے کہ نبوت اور خلافت راشدہ کے عہد کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ خلفائے راشدین کا درجہ تو بہت اونچا ہے اب جو لوگ مسلمانوں میں ہیں وہ تقویٰ، خوف خدا اور احسان ذمہ داری میں ان کے خاک پا کے برابر بھی نہیں۔ کیا ایسے معاشرہ میں کسی فرد واحد کو بے لگام اور مطلق العنوان بنادینا درست ہوگا کیا تھا ایک فرد کو ارباب حل و عقد کے فیصلوں سے آزاد اور مسلمانوں کے معاملات کا تھا ذمہ دار بنادینا مناسب ہوگا۔

بعض لوگوں کو اس معاملہ میں جو غلط فہمی ہوتی ہے اور انہوں نے سربراہ حکومت کو مختار

مطلق مان لیا ہے۔ اس کی وجہ سیرت و تاریخ کے تین واقعات ہیں جنہیں صحیح ڈھنگ سے نہیں سمجھا گیا ایک صلح حدیبیہ کا واقعہ دوسرے حضرت ابو بکر کا جیش اسامہ کو رخصت کرنا تیسرا مرتدین زکوٰۃ کے بارے میں آپ کا عمل۔

اس سے پہلے کہ ان تینوں واقعات کی صحیح تصور پیش کی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علماء اسلام کی ایک تصریح کا پھر سے ذکر کر دیا جائے کہ پیغمبر اسلام صلعم اور دنیا میں دو قسم کی ذمہ داریوں پر فائز تھے۔ نمبر ایک منصب رسالت، دوسرے منصب امامت، یہی ذمہ داریاں ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز میں فرق پیدا ہو جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منصب رسالت کا کام خدا کے حکم کے مطابق ادا کرنے کے لئے آپ مشورہ تو کر لیتے تھے لیکن یہ مشورہ لینا صرف تعلیم امت کے لئے تھا۔ مشورہ طلب کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری نہ تھا۔ یہاں صرف خدا کا حکم واجب التعییل ہوتا تھا۔ البتہ اس متعین شکل کے علاوہ آپ نے کبھی اپنے عزم کو شوریٰ کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ شوریٰ کی پابندی کرنے کی مثالیں سیرت میں بہت سی ہیں مثال کے طور پر آپ کا اپنی خواہش کے علی الرغم مدینہ سے باہر نکل کر ۳۲ھ میں جنگ کرنا جو غزوہ احمد کے نام سے مشہور ہے اور غزوہ بدر کے موقع پر بھی آپ نے اپنی خواہش کے خلاف دوسروں کے مشورہ پر ایک دوسری جگہ مجاز قائم کیا۔

اب صلح حدیبیہ کے واقعہ کو لیجئے یہ ان واقعات میں سے ہے جن کو امام کے اختیار مطلق کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ صلح عام رائے کے خلاف صرف پیغمبرانہ ذمہ داری کے ماتحت ہے چنانچہ عامہ بڑی چیز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی ہر چیز سے بلند و بالا ہے جب عام لوگوں نے یعنی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس صلح پر اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں خدا کا رسول ہوں میں اس کے حکم کے خلاف کچھ نہ کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ خدا میرے شرے کو ضائع نہیں کرے گا۔ ان الفاظ سے یہ بات ظاہر ہے کہ رائے عامہ کے احتجاج کو آپ نے کس لئے نظر انداز کر دیا۔

دوسرہ واقعہ جیش اسامہ کا ہے جو ہجری ۱۱ میں پیش آیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صدیق اکبر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت اسامہ کی فوج کو شام کے مجاز پر روانگی کا حکم دیا۔ حالانکہ اسلامی حکومت کا پایہ تخت مدینہ قبائل کی بغاوت کی وجہ سے سخت خطرات سے دوچار تھا۔ اور صحابہ کا مشورہ یہ تھا کہ اس وقت اس فوج کو باہر نہ روانہ کیا جائے۔ اس واقعہ سے امیر وقت کو آمر مطلق قرار دینا تاریخ کے واقعہ کی غلط تعبیر ہو گی اس معاملہ میں صدقیق اکبر نے جو کچھ بھی کیا۔ اس میں مطلق العنای کو ذرا بھی دخل نہیں تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ وہ فوج ہے جس کو مجاز پر جانے کے لئے حکم خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ اور اس لشکر کو بھیجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت اور آخری حکم پر عمل کرنا ہے اور صحابہ کے مشورہ کے مقابلہ میں پیغمبر کا حکم زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

تیرا واقعہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عملی جہاد ہے آنحضرت کی وفات کے بعد مدینہ کے اطراف میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے خلاف بغاوت پھیل گئی لوگوں کا کہنا تھا کہ نماز تو ہم پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں ادا کریں گے۔ لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ محل سے کام لیا جائے اور مانعین زکوٰۃ سے کوئی تعریض نہ کیا جائے صدقیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مشورہ کو رد کر دیا اور انہوں نے شوریٰ کے ارکان کو یاد دلایا کہ زکوٰۃ خدا کے حکم سے واجب ہے اور خدائی احکام میں شوریٰ کو کمی میشی کا اختیار نہیں۔

حضرت ابو بکر صدقیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی شرح صدر ہو گیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے صحیح ہے۔ اور اللہ نے ان کا دل جہاد کے لئے کھول دیا ہے اس بارے میں علامہ نووی نے شرح مسلم میں بحث کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر کے بعد صحابہ ان کی دلیل کے قائل ہو گئے تھے۔

یہ بڑی نادانی ہو گی کہ صدقیق اکبر لوگوں کے سامنے شریعت کے اصول پیش کر رہے ہوں اور اس واقعہ کو سامنے رکھ کر کچھ یہ بات دماغوں میں بٹھانے کی کوشش کریں کہ خلیفہ اول شوریٰ کے فیصلوں کو رد کر کے اپنی شخصی عزم پر عمل کرنے کے عادی تھے اور مطلق العنای آمر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

اسلام نے جمہوریت کا جو مزاج بنایا ہے وہ آج بھی دنیا کی قوموں کے لئے نمونہ اور نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج مدتؤں کے بعد دنیا نے اسلام میں اسلامی نظام کو اپنانے اور غیر اسلامی نظاموں کو رد کرنے کی خوش آئند اور خوشگواری ہر چل پڑی ہے اس لئے اسلامی نظام کے مطابق دستور سازی کے مرحلے پیش آئیں گے اور دستور سازی میں یہ مسئلہ یقیناً اہمیت رکھتا ہے۔ کہ سربراہ حکومت اپنی شوریٰ کا پابند ہے یا شوریٰ کے فیصلہ سے آزاد ہے یہ باتیں جو گوش گزار کی گئی ہیں امید ہے کہ بہت سے دماغوں پر دستک دیں گی اور اہل الرائے اس کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں گے۔ و ما علینا الا البلاغ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ